اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور

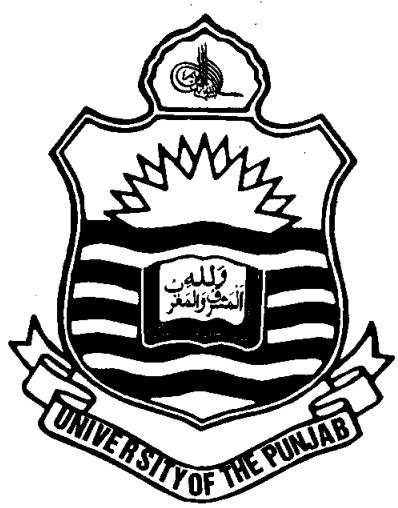

جلد ۱۸

(لاہور .....محمل)

باراوّل: ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء

بارثانی: ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء

جملہ حقوق بحق جامعہ پنجاب محفوظ ہیں

مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کلی یا جزوی طور پر اس کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

طبع: اوّل

سال طباعت ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء

مقام اشاعت: لاہور

ناشر: رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع: مسٹر جاوید اقبال بھٹی، ڈی جی آرٹیکنالوجی، اے ایم آئی او پی (لنڈن)، ناظم مطبع

مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اوران کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائیکلوپیڈیا (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ایا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F.Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez:
Apendice a la adicion Codera de Tecmila, در Misc de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل = ابن الابار = تکملۃ الصلہ، *Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I. completant les deux vol. edites par F. Codera*، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ایا ۲ یا ۳ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان = *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ فاینان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از *C.Defremery و B.R.sanguinetti*، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (*BGA.II*، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (*BGA, VI*).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = *Prolegomenes d'Ebn Khaldoun* طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (*Notices et Extrais.XVI-XVII*).

ابن خلدون: روزنتھال = *The Muqaddimah*، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = *Les Prolegomensesd' Ibn Khaldun*، ترجمہ وحواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء.

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وستنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء۔

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII)۔

ابن رستہ، ویت Wiet: Les Atours precieux، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء۔

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) ولیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء۔

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں)۔

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V)۔

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء۔

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء۔

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء۔

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۱/۲، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء۔

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء۔

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ء/۱۳۱۹ھ۔

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک)۔

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء۔

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA,I) و باردوم (نقل باراول) ۱۹۲۷ء۔

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا باردوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد۔

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء۔

الانباری: نزہتہ = نزہتہ الالبّاء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ۔

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء۔

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش۔

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء۔

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica۔

ت ۱۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس۔

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء۔

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء۔

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء۔

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) ومحمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید).

حمداللہ مستوفی: نزہۃ = حمداللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرہ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علماے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن وحسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام تاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبدالمعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد، ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الصفدی، الصلۃ = بغیۃ التمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵. (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبدربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ وجغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع مٹر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء.

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸تا۱۳۲۹ھ ش.

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹تا۱۸۹۴ء.

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱تا۱۸۷۲ء.

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء.

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳تا۱۹۷۴ء.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰تا ۱۳۰۸ھ.

م آ آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ.

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl Indica.

مجالس المؤمنین = نوراللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، ۱ جلد، تہران ۱۳۱۰و۱۳۱۱ھ ش.

المسعودی: مروج = مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱تا۱۸۷۷ء.

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA, VIII).

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA, VIII).

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵تا۱۸۶۱ء.

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء ببعد.

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴تا۱۸۹۱ء.

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶تا۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴).

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷تا۱۹۲۷ء (*GMS*, VI): معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶تا۱۹۳۸ء.

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (M. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII).

یعقوبی، ویت = *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables*=*Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed., Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall: *Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*, 2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal: Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer: Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in früh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed. Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart: *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatân Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner: *Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen*, *Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen: *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.

Abh. K.M.=Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.

Abh. Pr. AK. W.= Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI. NIS=the same, New Imperial Series.

ASI. AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais J ' Arachcologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.

BSE^2=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^1=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI^2=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Tachbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Orions.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG = Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG = Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد =	f.,ff.,sq.,sqq.
بذیل مادّہ (یا کلمہ) =	s. v.
دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے =	see; s.
رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک بآں (رجوع کنید بآں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے =	q.v.
بمواضع کثیرہ =	passim.

کتاب مذکور =	op.cit.
دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قابل) =	cf.
ق۔م (قبل مسیح) =	B.C.
م (متوفی) =	d.
محل مذکور =	loc. cit.
کتاب مذکور =	ibid.
وہی مصنف =	idem.
ھ (سنہ ہجری) =	A.H.
ء (سنہ عیسوی) =	A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a

کسرہ (ـِ) = i

ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل: āj kal)

ی = ī (سیم: Sim)

و = ū (ہارون الرشید: Harūn al-Rashīd)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ـے = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ـے = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ـُ = u کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)

ـُ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kol)

ـَ = ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اُرْجُب: ärädjäb: رَجَب: rädjäb)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بِسْمِل: bismil)

⊗ **لاهور : تاریخ اور وجہ تسمیہ :** لاهور کی قدیم تاریخ پر قیاسات، روایات اور حکایات کا غبار کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ کوشش کے باوجود قطعی طور پر یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ اس شہر کا موجودہ نام (لاهور) کب اور کیسے رکھا گیا۔

اسلامی دور کے معروف تاریخی ماخذ میں لاهور کا ذکر سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری کی ایک عربی تالیف حدود العالم (ترجمۂ انگریزی منورسکی، طبع لنڈن ۱۹۳۷ء، ص ۸۹) میں ملتا ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا (تصنیف سنہ ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء) ۔ اس کتاب میں لاهور کا ذکر یوں درج ہے :

''لہور شہر کے متعدد اضلاع ہیں اور اس کا حاکم امیر ملتان کا نائب ہے ۔ اس میں بازار اور بت خانے ہیں ۔ اس میں چلغوزہ، بادام اور ناریل کے درخت بکثرت ہیں ۔ یہاں کے لوگ سب بت پرست ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں'' (انگریزی ترجمہ) ۔ گویا دسویں صدی عیسوی کے اواخر تک یہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔

البلاذری (م ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) نے اپنی تالیف فتوح البلدان (طبع de Geoje، ۱۸۶۶ء، ص ۴۳۲) میں ایک لاهور کا ذکر الاهوار کے نام سے کیا ہے، لیکن یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو اٹک اور ویہند کے درمیان کہیں آباد تھا۔

البیرونی کئی سال تک شمالی ہندوستان میں رہا اور محمود غزنوی کے حملوں کے وقت، یعنی گیارھویں صدی عیسوی میں وہ ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کر رہا تھا ۔ وہ اپنی مشہور تالیف تحقیق ما للہند (مطبوعۂ حیدر آباد دکن ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۵) میں لکھتا ہے کہ لاهور کسی شہر کا نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے جس کا دارالحکومت ندھوکور ہے۔

کنہیا لال ہندی کے بیان کے مطابق شیخ احمد زنجانی نے اپنی تصنیف تحفۃ الواصلین میں لاهور کا ذکر کیا ہے (یہ رسالہ ۴۳۵ھ / ۱۰۴۳ء میں لکھا گیا تھا) ۔ یہی کنہیا لال اپنی تصنیف تاریخ لاهور (مطبوعۂ ۱۸۸۴ء، ص ۹) میں لکھتا ہے : ''.... شیخ احمد زنجانی صاحب رسالۂ تحفۃ الواصلین جس نے وہ کتاب ۴۳۵ھ عہد سلطان مسعود غزنوی بمقام لاهور اس کے علما و فضلا کے حال میں لکھی ہے .....'' یہ رسالہ کوشش کے باوجود کسی کتاب خانے سے دستیاب نہیں ہو سکا ۔ نیز کنہیا لال کا یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔ مسعود غزنوی کا عہد حکومت ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء تا ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء ہے ۔ اس لیے اگر یہ کتاب مسعود غزنوی کے عہد میں لکھی گئی ہے تو ۴۳۵ھ درست نہیں، کیونکہ مسعود غزنوی کا زمانہ ۴۳۲ھ میں ختم ہو جاتا ہے اور اگر یہ تاریخ درست ہے تو پھر یہ کتاب مسعود غزنوی کے جانشین مودود غزنوی کے عہد میں لکھی گئی ہوگی ۔ اس دور کے ایک اور مصنف گردیزی نے اپنی تصنیف زین الاخبار ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء کے قریب لکھی ۔ وہ اس کتاب (طبع ایرانشہر، برلن ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۷ء) میں ص ۹۷ پر لوهور کا ذکر کرتا ہے، مگر جب سلطان مسعود اپنے بیٹے مجدود کو لاهور کا والی بنا کر بھیجتا ہے تو یہ مصنف اسے ولایت لاهور بتاتا ہے (ص ۱۰۴) [اس کے علاوہ ایک لوهر لوٹ کا بھی ذکر کرتا ہے] ۔

گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم بزرگ سید علی الهجویری (داتا گنج بخش) اپنی تالیف کشف المحجوب میں شہر کا نام لہانور درج فرماتے ہیں [لیکن نسخۂ محمد شفیع لاهوری، ص ۹۶ و نسخۂ عکسی ایرانی، ص ۱۱۰ میں یہ الفاظ موجود نہیں: ''در بلدۂ لهانور کہ از مضافات ملتان است'' یہ حاشیے پر بعد کا اضافہ ہے] ۔

گیارھویں صدی کے مشہور مؤرخ بیہقی نے اپنی تالیف تاریخ بیہقی میں اس شہر کو لاہور کے علاوہ لوہور اور لہور بھی لکھا ہے (تاریخ بیہقی، طبع دکتر غنی و دکتر فیاض، تہران ۱۳۲۴ ش، ص ۲۷۰، ۳۰۱، ۳۳۴)۔

ابوالفرج رونی (م - قریب ۱۱۰۴ء) غزنوی عہد کا شاعر تھا - وہ سلطان محمود کے پوتے سلطان ابراہیم کا قصیدۂ مدحیہ لکھتے ہوے لاہور کا نام لوہوار بتاتا ہے (دیوان، بمبئی ۱۳۲۰ھ، ص ۱۰۱)۔

[مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) بھی غزنوی عہد کا مشہور شاعر ہے - اس کے دیوان، مطبوعۂ تہران، تیرماہ، ۱۳۱۸ ش، میں اس شہر کا ایک درجن سے زائد مقامات پر ذکر موجود ہے اور اسے لہاوور، لوہور، لہاور، لوہاور، لاوہور، لوہاور اور لاہوور لکھا گیا ہے - اس اختلاف کی وجہ کچھ تو تلفظ کی مختلف صورتیں ہیں مگر کہیں کہیں شعری ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے]۔

جغرافیہ نگار الادریسی اپنی تصنیف نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق میں شہر کا نام لہاور لکھتا ہے (ترجمہ Jaubert، ص ۱۷۰)۔

طبیب شرف الزمان طاہر مروزی نے اپنی تالیف طبائع الحیوان چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں مرتب کی - وہ شہر کا نام لوہور (طبع سنورسکی ۱۹۴۲ء، ص ۳۹) لکھتا ہے۔

ابن فُندق نے اپنے وطن کی تاریخ بیہق ۵۵۳ھ / ۱۱۶۸ء میں لکھی - اس میں وہ شہر کا نام لوہاوور بتاتا ہے (چاپخانۂ کانون، ۱۳۱۷ ش، ص ۷۱)۔

یاقوت الحموی نے اپنی تصنیف معجم البلدان ۶۲۵ھ / ۱۲۲۷ء میں شروع کی - وہ اس شہر کو لوہور [لہاوور] اور لہاوَر کے ناموں سے یاد کرتا ہے (معجم البلدان، طبع لائپزگ ۱۸۶۹ء، ج ۴، ص ۳۷۱) - ابی العباس احمد بن علی القلقشندی (م ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸ء) نے بھی صبح الاعشی (طبع قاہرہ، ج ۵، ص ۷۶) میں لوہور لکھ کر کہا ہے کہ اسے لہاور بھی کہا جاتا ہے۔

[اس ضمن میں وہ عمرو بن سعید اللہاوری محمد بن المامون المطوّعی اور ابوالقاسم وغیرہ کا ذکر کرتا ہے]۔

اس طرح لاہور کے نام کی مختلف شکلیں مختلف مصنفوں کے ہاں یوں ملتی ہیں :

لَھُور	لَہانُور	لہاور	لیہووہ
لوہاوَر	لَوہاوُوز	لاہُور	لوہر
	لَہاوُور	لَہاوار	لوہار
لَوہُور	لاوُہُور	لاہور	لَوْاور
			لوہوور
			لووہور

لاہور کی تاسیس : لاہور کی تاسیس کے متعلق بھی کوئی صحیح تاریخی شہادت نہیں ملتی - تاریخ میں سب سے پہلی دستاویز شریف محمد بن منصور (فخر مُدبّر) کی تالیف آداب الحرب و الشجاعہ ہے - یہ کتاب سلطان اِلْتُتمش [رک بآں] کے زمانے (۶۰۷ - ۶۳۳ھ / ۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ء) میں لکھی گئی تھی - روٹو گراف ۲۸۳۹، مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۱۲۲) - اس میں فخر مدبّر نے حج (چچ) بن بھندرا کو لاہور کا بانی بتایا ہے۔

خلاصۃ التواریخ کا مصنف سجان رائے بھنڈاری (۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء) عام طور پر اس مشہور روایت کا ذکر کرتا ہے کہ لاہور رام چندر کے بیٹے لو نے بسایا تھا (طبع دہلی ۱۹۱۸ء، ص ۶۴) اور یہ کہ جب لاہور برباد ہوا تو سیالکوٹ پنجاب کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

ایک پنجابی شاعر خیراللہ فدا کا خیال ہے کہ ایاز لاہور کا بانی تھا - اس نے اپنی مثنوی مرزا صاحباں میں (۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء) یہی روایت

بیان کی ہے [سال تصنیف ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۷ء، مطبوعۂ نو لکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۹ء، ص ۱۴۶، نسخۂ غلام دستگیر نامی، نیز نسخۂ خطی، شمارہ ۱۰۸۱، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مجموعۂ شیرانی ورق ۸۴]۔

مرتضیٰ حسین نے اپنی تصنیف حدیقۃ الاقالیم میں سجان رائے بھنڈاری کے بیان کو تقریباً دہرا دیا ہے۔

دیکھیے ٹاڈ Tod کی کتاب راجستھان (۱۸۳۸ء) (طبع ج ۱، ص ۲۵۲) تاریخ پنجاب بوٹے شاہ (۱۸۴۷ء) (پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ، Ape III 8، ق ۱۶ ب)۔

نور احمد کی تحقیقات چشتی (تالیف ۱۸۶۴ء، طبع لاہور ۱۸۶۷ء، ص ۲۹۷)، تاریخ لاہور۔

کنہیا لال ہندی (۱۸۸۴ء، ص ۸) وغیرہ نے رام چندر کے بیٹے (لو) کو لاہور کا بانی قرار دیا ہے، لیکن اس کا کوئی معاصر یا قریب العہد ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔

یونانی کلاسیکی ادب میں ہمیں سکندر کے ساتھ لاہور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ گو بقرائن کہا جاسکتا ہے کہ سکندر اس راستے سے گزرا ہوگا اور اس نے راوی کو موجودہ شہر کے قریب ہی کہیں عبور کیا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ اگر سکندر کے زمانے میں (۳۲۶ ق م) اس شہر کی کوئی اہمیت یا عظمت ہوتی تو تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام ضرور محفوظ ہوتا، لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پہلی صدی عیسوی تک یہ شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ اس طرح ہمیں جغرافیہ دان سٹرابو کے ہاں بھی لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ گو سٹرابو نے اپنی تصنیفات ۶۰ قبل مسیح اور ۱۹ بعد مسیح کے مابین مرتب کی تھیں۔ پلینی نے اٹک سے الٰہ آباد تک جانے والی شاہراہ کی تفصیل ۲۳ اور ۷۹ عیسوی کے درمیان قلمبند کی ہے، اس میں بھی لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔

لیکن دوسری صدی عیسوی میں بطلمیوس نے جو جغرافیہ مرتب کیا ہے، اس میں ایک مقام لبوکلا کا ذکر موجود ہے، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے۔ قدیم جغرافیہ دانوں میں بیانات کی صحت کے اعتبار سے بطلمیوس کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ مشہور جغرافیہ دان ۱۵۰ عیسوی میں سکندریہ میں زندہ تھا۔ اور اس نے اپنے جغرافیے میں ایک علاقے کیسپیریا (کشمیر) کا ذکر کیا ہے، جس کی حدود دریاے بیدسپاس (جہلم) سے ابل (چندر بھاگا یا چناب) اور رھووس (راوی) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس علاقے میں اٹک اور پالی پوتھر کے درمیانی راستے پر لبوکلا کا شہر موجود ہے (دیکھیے بطلمیوس: *Ancient India*، مرتبہ، Mc Crindle لنڈن ۱۸۸۵ء، ص ۱، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۶)۔ مستشرق ولفرڈ Wilfred اس شہر کے محل وقوع اور نام کی قریبی مشابہت سے اس لبوکلا کو لاہور کا شہر قرار دیتا ہے اور جغرافیہ دان اور ماہر آثار کننگھم بھی ولفرڈ سے اتفاق کرتا ہے (کننگھم: *Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، ص ۱۹۷ تا ۱۹۹)۔ ان آرا سے اتفاق کیا جائے تو لاہور کی بنیاد کی تاریخ دوسری صدی عیسوی کا آغاز قرار پاتی ہے۔

مصنفین واکر، ہنٹر اور انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا میں لاہور پر مقالے کے مصنف کا قیاس ہے کہ مشہور چینی بدھ زائر ہیون سانگ ۶۳۰ عیسوی میں پنجاب آیا تھا اور اس نے اپنے سفرنامے میں لاہور کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ چینی سیاح کے سفرنامے کی جو تفاصیل اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان میں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہیون سانگ نے جس شہر کو

''برہمنوں کا عظیم شہر'' کے نام سے یاد کیا ہے، ممکن ہے وہ لاہور ہی ہو، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہیون سانگ لاہور سے گزرا [۱۹۷۴ء کے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ہیون سانگ نے ۶۳۰ء میں اپنے شمالی پنجاب سے جالندھر تک کے سفر میں لاہور کا کوئی ذکر نہیں کیا] ۔ قطعی طور پر لاہور کا ذکر نویں صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ ملتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ [نیز دیکھیے تعلیقہ آگے] ۔

محلِّ وقوع اور رقبہ :

اس وقت لاہور پنجاب (پاکستان) کا دارالحکومت ہے ۔ یہ قسمت (ڈویژن) لاہور اور ضلع لاہور کا صدر مقام ہے ۔ شہر لاہور سطح سمندر سے ۷۰۲ فٹ بلند، دریاے راوی کے بائیں کنارے اور دہلی تا پشاور کی (Grand Trunk Road) جرنیلی سڑک (شاہراہ اعظم) پر واقع ہے ۔ قدیم شہر (یعنی فصیل کے اندر کا شہر) ایک ذوزنقہ کی شکل میں ہے ۔ قلعہ بلندی پر ہے ۔ (اب بوقت تحریر مقالہ ۱۹۷۸ء) لاہور پرانی آبادی سے نکل کر اضافی آبادیوں کی صورت میں دور دور تک پھیل گیا ہے ۔ (اب وہ بھی لاہور میونسپل کارپوریشن کے حدود میں شامل ہیں) ۔ چھاونی اس آبادی پر ہے جو زمانۂ قدیم میں صدر اور میاں میر کہلاتی تھی ۔ لاہور کا ریلوے سٹیشن پاکستان ریلوے کا سب سے بڑا جنکشن ہے ۔

دریاے راوی (جس کے معنی آفتاب کے ہیں) جس کا یونانی نام ہائیڈرا اوٹس Hydraotes ویدوں میں درج نام پرشنی Parushni اور کلاسیکی سنسکرت نام ایراوتی Iravati ہے، صوبۂ پنجاب کے سب دریاؤں سے چھوٹا ہے ۔ یہ لاہور کے شمال میں نیم دائرے کی شکل میں گزرتا ہے ۔ کسی وقت یہ لاہور کی اس قدیم فصیل کو چھو رہا تھا جو اب تقریباً منہدم ہو چکی ہے ۔ ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء میں جب دریا کی طغیانی سے لاہور شہر کو خطرہ محسوس ہوا تو شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کے بائیں کنارے پر اینٹ اور چونے کا بہت مضبوط اور چوڑا بند بنوایا (علی الدین : عبرت نامہ، مخطوطۂ انڈیا آفس لائبریری، ورق ۳۴، طبع پنجابی ادبی اکادمی ۱۹۶۱ء، ص ۶۲)، قلعے کے شمال مشرق میں موضع بھوگیوال کے قریب (اور کہیں کہیں اور بھی) اس بند عالمگیری کے آثار اب بھی موجود ہیں.

اکبر کے عہد (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) میں لاہور کا شہر بہت زیادہ رقبے پر آباد تھا اور مفتی تاج الدین (اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۷۱ تا ۸۰، بحوالۂ ضلع لاہور از مفتی تاح الدین بن مفتی امام الدین) کے بیان کے مطابق اس وقت کوئی نو آبادیاں شہر کے اندر تھیں اور ستائیس آبادیاں فصیل کے باہر تھیں.

تھارنٹن کا خیال ہے کہ شاہجہان کے زمانے میں غالباً لاہور سب سے زیادہ آباد تھا اور اس کا گھیر سولہ سترہ میل تھا (*Old Lahore, 81*) ۔ اس وقت (۱۹۷۷ء میں) ماڈل ٹاون اور لاہور چھاونی کو چھوڑ کر شہر لاہور کی کارپوریشن کا علاقہ شرقاً غرباً چھے میل اور شمالاً جنوباً آٹھ میل ہے .

سیاسی تاریخ : لاہور کی مستند سیاسی تاریخ کا آغاز غزنویوں کے عہد سے ہوتا ہے ۔ گو اس سے پہلے ایک تو چچ حکمران خاندان کا ذکر شریف محمد بن منصور (آداب الحرب، مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۲۳، ۱۲۲) کے ہاں ملتا ہے، چچوں کی حکومت اس مصنف کے بیان کے مطابق ۵۳۸۹ / ۹۹۹ء میں ان کے آخری حکمران چندرت پر آ کر ختم ہو گئی ۔ اور اس خاندان کے بعد ہندو شاہیوں کے تین حکمرانوں

(جے پال، انند پال، ترلوچن پال) نے لاهور پر ۹۹۹ء سے لے کر ۱۰۱۴ء تک حکومت کی اور بالآخر غزنویوں نے انھیں شکست دے کر لاهور پر اپنا تسلط جما لیا۔

یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۰ھ/ ۱۰۱۴ء میں لاهور کو زیر نگین کیا۔ مگر وہ کبھی طویل عرصے کے لیے لاهور میں مقیم نہ رہا اور اپنے نوّاب (نائبین) کو لاهور کا حاکم بنا کر یہاں چھوڑ جاتا رہا۔ اس کا آخری نائب (گورنر) سپہ سالار الیاروق تھا (گردیزی: زین الاخبار، ص ۹۷)۔

سلطان محمود غزنہ میں ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ/ ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو فوت ہو گیا تو جلال الدولہ محمد اس کا بیٹا جانشین ہوا، لیکن اس کا عہد حکومت صرف چھے مہینے رہا۔ ۳ شوال ۴۲۱ھ/ ۴ اکتوبر ۱۰۳۰ء کو اس کے امرا نے بغاوت کی اور وہ محمود کے بیٹے مسعود کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔ الیاروق (اریاروق) اس وقت بھی لاهور میں (غزنویوں کا) حاکم تھا۔ اس کے خلاف جب غزنہ میں بہت سی شکایات پہنچیں تو سلطان مسعود نے ۱۹ ربیع الاول ۴۲۲ھ/ ۱۷ مارچ ۱۰۳۱ء کو اس کی جگہ احمد نیال تگین کو هندوستان کا سالار مقرر کیا۔ قاضی ابوالحسن علی اس وقت دربار غزنہ کی طرف سے هندوستان کا قاضی القضاۃ مقرر تھا۔ احمد نیال تگین کی اس قاضی سے ٹھن گئی اور دونوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ رمضان ۴۲۵ھ/ اگست ۱۰۳۴ء کے وسط میں سلطان مسعود کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے ایک کثیر فوج کے ساتھ اپنے هندو جرنیل بالنہ کو احمد نیال تگین کی کمک کے لیے بھیجا، لیکن بالنہ کو شکست ہوئی اور وہ اس جنگ میں مارا گیا۔ اس وقت تک سلطان کو احمد نیال تگین کی بد اعمالیوں کی اطلاع مل چکی تھی کہ وہ سرکاری محاصل کو خورد برد کر رہا ہے۔ اس پر مسعود نے ایک اور هندو جرنیل تلک کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ تلک نے نیال تگین کو شکست دی اور اس کا سر کاٹ کر سلطان کو بلخ بھیج دیا۔ (تلک بن جے سین کے لیے دیکھیے، سیّد عبداللہ: ادبیات فارسی میں هندوؤں کا حصہ، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب لاهور، ص ۵، ۶)۔

دو سال بعد ۳ ذوالقعدہ ۴۲۷ھ/ ۲۹ اگست ۱۰۳۶ء کو سلطان مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو لاهور کا حاکم بنا کر بھیجا۔ اس وقت (سلطان محمود کے معروف غلام) ایاز کو مجدود کا سرپرست بنایا گیا اور لاهور غزنویوں کی هندی سلطنت کا دارالحکومت قرار پایا۔

مسعود ۴۳۳ھ/ ۱۰۴۱ء میں قتل ہوا اور اس کا بیٹا شہاب الدولہ مودود اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد علی الترتیب ابو جعفر مسعود (۱۰۴۹ء)، ابوالحسن علی (۱۰۴۸ - ۱۰۴۹ء) عزالدولہ عبدالرشید (۱۰۴۹ء)، طغرل (۱۰۵۲ء)، فرخزاد (۱۰۵۲ء)، ابراهیم (۱۰۵۹ء)، مسعود ثانی (۱۰۹۹ء)، شیر زاد (۱۱۱۳ء)، ارسلان (۱۱۱۵ء)، بہرام شاہ (۱۱۱۸ء)، خسرو شاہ (۱۱۵۲ء) اور خسرو ملک (۱۱۶۰—۱۱۸۶ء) تخت غزنہ پر متمکن ہوے اور لاهور ان کے زیر نگین رہا۔ اس اثنا میں غوریوں کے حملے شروع ہو گئے۔ ایک مرتبہ خسرو شاہ نے علاءالدین غوری سے شکست کھا کر هندوستان میں پناہ لی اور لاهور کو اپنا دارالحکومت بنا لیا، چنانچہ وہ یہیں ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء میں فوت ہوا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاهور ہی میں تخت نشین ہوا۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء میں لاهور غزنویوں سے چھین لیا اور علی کرمانی کو لاهور کا حاکم مقرر کر کے خود غزنہ واپس چلا گیا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری

ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے چند مرتبہ لاہور سے گزرا اور ایک دفعہ اپنی مہم سے غزنہ واپس جاتے ہوے ۳ شعبان ۶۰۲ھ / ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو دریاے الک کے کنارے ''دم یک'' [مقامی تلفظ: دھمیک] کے مقام پر قتل ہو گیا۔

محمد غوری کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود غور میں تخت نشین ہوا اور اس نے ملک کے خطاب کے ساتھ قطب الدین ایبک کو لاہور میں ۱۸ ذوالقعدہ ۶۰۲ھ / ۲۴ جولائی ۱۲۰۶ء کو تخت نشین کرایا اور اس طرح ہندی مقبوضات میں اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر مر گیا اور اسی شہر میں دفن ہوا [رک بہ قطب الدین ایبک]۔ اس کے بعد ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں قطب الدین کے امرا نے لاہور میں اس کے بیٹے آرام بخش کو سلطان آرام شاہ کے نام سے تخت نشین کرایا، لیکن اسی سال (اور بعض روایتوں کے مطابق تین سال کے اندر اندر) یہ بادشاہ التتمش سے شکست کھا کر غائب ہو گیا اور اس کا انجام کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

آرام شاہ کی وفات کے بعد دہلی، یعنی مرکز میں شمس الدین التتمش (۶۰۷ تا ۶۳۳ھ / ۱۲۱۰ تا ۱۲۳۵ء)، رکن الدین فیروز شاہ (۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء)، رضیہ (۶۳۴ھ تا ۶۳۷ھ / ۱۲۳۶ تا ۱۲۳۹ء)، معزالدین بہرام (۶۳۷ تا ۶۳۹ھ/۱۲۳۹ تا ۱۲۴۱ء)، علاءالدین مسعود (۶۳۹ تا ۶۴۴ھ/۱۲۴۱ تا ۱۲۴۶ء)، ناصر الدین محمود شاہ (۶۴۴ تا ۶۶۴ھ / ۱۲۴۶ تا ۱۲۶۵ء)، غیاث الدین بلبن (۶۶۴ تا ۶۸۶ھ/۱۲۶۵ تا ۱۲۸۷ء) اور معزالدین کیقباد (۶۸۶ تا ۶۸۹ھ/۱۲۸۷ تا ۱۲۹۰ء) کی حکومت رہی۔ جس کے بعد غوری اور خاندان غلامان اختتام کو پہنچے۔ ان کے عہد میں مرکز کی طرف سے لاہور کے حاکم مقرر کیے جاتے رہے، لیکن اس عرصے میں لاہور پر یہ افتاد پڑی کہ منگولوں نے حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں کا آغاز ۱۲۱۷-۱۲۱۸ء میں ہوا اور یہ سلسلہ تقریباً دو صدیوں تک جاری رہا۔ ان حملوں نے پنجاب کے مختلف شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دسمبر سنہ ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے ملک معزالدین بہرام کے عہد میں لاہور پر حملہ کر کے اور بادشاہ کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲۴۶ء میں منگولوں نے پھر لاہور سے بہت سا تاوان وصول کیا۔ غیاث الدین بلبن نے ۱۲۷۰ء میں شہر کو دوبارہ تعمیر کرا کے آباد کیا، لیکن ۱۲۸۵ء میں منگولوں نے پھر اس پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس جنگ میں بلبن کا بیٹا محمد دریاے راوی کے کنارے مارا گیا معروف شاعر امیر خسرو گرفتار ہوا۔ اس وقت لاہور کے مضافات میں دو نوآباد کار منگولوں نے مغلپورے کی بنیاد رکھی۔

ان دنوں عام طور پر منگول (مغول) پنجاب پر درۂ بولان، سندھ اور ملتان کی راہ سے تاخت کیا کرتے تھے۔ پنجاب کا حاکم اس وقت ملتان یا دیپال پور میں رہا کرتا تھا، تاکہ مغول کا راستہ روکنے میں آسانی رہے، لہٰذا اس دور میں لاہور کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہی تھی، یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

معزالدین کیقباد کے بعد ہندوستان پر خلجیوں اور تغلقوں کا تسلط ہوا اور بالترتیب ۶۸۹ تا ۷۲۰ھ/ ۱۲۹۰ تا ۱۳۲۰ء خلجیوں کا قبضہ رہا جس کے بعد ۷۲۰ تا ۸۱۵ھ / ۱۳۲۰ تا ۱۴۱۲ء تغلق قابض رہے۔ اس زمانے میں بھی لاہور کو کوئی خاص تاریخی اہمیت حاصل نہ تھی اور اسے کوئی شہرت نہ ملی۔ محمد تغلق کے عہد (۷۲۵ تا ۷۵۲ھ/۱۳۲۴ تا ۱۳۵۱ء) میں، ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء میں کل چندر گکھڑ نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کے

حاکم تاتار خورد کو قتل کر دیا (تاریخ مبارک شاہی، ص ۱۰۶) ۔ اس کے مقابلے میں مرکز سے خواجہ جہان کو بھیجا گیا جس نے کل چندر کو شکست دی ۔ ۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء میں سلطان محمد شاہ تغلق نے شاہزادہ ہمایوں خاں کو شیخا کھوکھڑ کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا، کیونکہ اس نے بغاوت کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا (تاریخ مبارک شاہی، ص ۱۰۴)، لیکن اس وقت سلطان خود فوت ہو گیا اور یہ منصوبہ پروان نہ چڑھا ۔ اس کے بعد سارنگ خاں کو اسی سال پنجاب بھیجا گیا، جس نے کھوکھڑوں کو شکست دے کر ان کی بغاوت فرو کر دی۔

امیر تیمور نے ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء میں تلنبہ پر حملہ کیا اور پھر ملتان اور دہلی پر قبضہ کر لیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا شہر تیمور کی یلغار سے بچ گیا، لیکن اس نے لاہور سے تاوان ضرور طلب اور وصول کیا ۔ شیخا کھوکھڑ اس وقت پھر لاہور پر قابض ہو چکا تھا ۔ تیمور اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ ''منجملہ ۲۳ جمادی الآخرہ ۸۰۲ھ کو شاہزادۂ رستم اور امیر جہان شاہ سے اطلاع ملی کہ انھوں نے اہل لاہور سے تاوان وصول کر لیا ہے، گو شیخا کھوکھڑ نے وعدہ کر لینے کے بعد انجام دہی میں کوتاہی برتی تھی ۔ میں نے چند دن پہلے شاہزادہ رستم اور امیر جہان شاہ کو لاہور اس غرض سے بھیجا تھا (ملفوظات تیموری، ترجمۂ انگریزی اسٹیوارٹ، لاہور ۱۹۷۵ء، تزوکات تیموری، تحریر فارسی ابو طالب حسینی تربتی آکسفرڈ ۱۷۸۳ء، ص ۱۳۴، ۳۵۲) ۔ امیر تیمور ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد لاہور کو خضر خان کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔

یہ بھی انتشار کا زمانہ تھا، اس لیے خضر خان کے عہد میں لاہور کی تاریخ کی تفاصیل دستیاب نہیں ہوتیں ۔ خضر خان کے بیٹے مبارک شاہ نے پنجاب میں امن قائم کرنے کی پوری کوشش کی ۔ اس نے لاہور کو از سر نو آباد کیا ۔ وہ خود بھی ۱۴۲۱ء میں لاہور آ کر ایک ماہ تک دریائے راوی کے کنارے خیمہ زن رہا اور اس نے قلعہ اور شہر پناہ تعمیر کرائی۔

۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء میں لودھیوں کی حکومت قائم ہوئی ۔ لودھیوں کے زمانے (۸۵۵ تا ۹۳۰ھ / ۱۴۵۱ تا ۱۵۲۶ء) میں لاہور کے متعلق معاصر تاریخ بالکل خاموش ہے، البتہ بعد کے مؤرخ آخری سلطان ابراہیم (۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء) کے عہد میں لاہور کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ دولت خان لودھی جب لاہور کا حاکم تھا تو اس نے ایک پیغام کے ذریعے ظہیر الدین بابر کو ہندوستان فتح کرنے کی ترغیب دی ۔

لاہور دور مغلیہ میں : بابر ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء میں ہندوستان کی طرف چوتھی دفعہ بڑھا ۔ شمالی ہندوستان پر تو اس یلغار سے پہلے کے تین حملوں میں اس کا قبضہ ہو چکا تھا، لیکن اس چوتھے حملے میں اس نے لاہور کو بھی فتح کر لیا ۔ وہ لاہور میں صرف چار دن رہا، پھر دیپال پور چلا گیا، جہاں اس نے مزاحم فوج کو شکست دے کر اس قصبے پر قبضہ کر لیا ۔ یہیں دولت خاں اور اس کے بیٹے غازی خاں اور دلاور خاں بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اس سے پہلے یہ لوگ مبارک خاں لودھی اور بہادر خاں لودھی کی فوج کے خوف سے بلوچوں کے پاس پناہ گزین تھے ۔ بابر نے انھیں زندان میں ڈال دیا، لیکن جلد ہی رہا کر کے سلطان پور کی جاگیر انھیں سونپ دی۔

بابر اس سے تھوڑے عرصے بعد میر عبدالعزیز کو لاہور کا حاکم بنا کر کابل واپس چلا گیا ۔ اس کی مراجعت کے بعد دولت خاں اور غازی خاں نے

پھر شورش برپا کی، جسے فرو کرنے کے لیے بابر نے پانچویں دفعہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں ہندوستان پر چڑھائی کی ۔ وہ جمعہ ۱۴ ربیع الاول ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء کو سیالکوٹ پہنچا اور وہاں سے اس نے سام اور نور بیگ کو لاہور بھیجا ۔ دولت خاں اور غازی خاں اس وقت تک اپنے آپ کو شہنشاہ بابر کا نمائندہ سمجھ کر راوی کے کنارے چالیس ہزار فوج کے ساتھ خیمہ زن تھے ۔ بابر کی آمد کی خبر سن کر دونوں فرار ہو گئے ۔ بابر نے ان کا تعاقب کیا ۔ غازی خاں کو شکست ہوئی اور دولت خاں کچھ دیر کے بعد فوت ہو گیا ۔ بابر لاہور میں داخل ہوے بغیر سیدھا دہلی کی طرف بڑھ گیا ۔

بابر کی یہ آخری اور پانچویں مہم ہندوستان کے خلاف تھی، جس میں اس نے دہلی فتح کر کے ۳۰ جمادی الآخرہ ۹۳۲ھ / ۱۲ اپریل ۱۵۲۶ء کو اس ملک میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی ۔ بابر ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں آگرے میں فوت ہوا اور اسے کابل لے جا کر دفن کر دیا گیا ۔

تاریخ لاہور میں مغلیہ دور سنہری عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ باپ کی رحلت کے بعد نصیر الدین ہمایوں آگرے میں ۹ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ / ۲۸ دسمبر ۱۵۳۰ء کو سریر آرائے سلطنت ہوا ۔ اس وقت اس کا بھائی کامران کابل اور قندھار کا گورنر تھا ۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی پنجاب کا رخ کیا ۔ بظاہر وہ ہمایوں کو تخت نشینی کی مبارک باد دینا چاہتا تھا، لیکن نیت اس کی یہ تھی کہ ہندوستان کے تخت کے لیے قسمت آزمائی کی جائے ۔ اس نے اپنے علاقوں کو عسکری کے سپرد کیا اور خود کثیر فوج لے کر لاہور کی طرف بڑھا ۔ ہمایوں نے یہ خبر سنی تو خود ہی ایک پیغام بر اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے اس کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھجوایا کہ ہم نے تمھاری جاگیر میں پشاور اور لمغان کے علاقے بھی شامل کر دیے ہیں، لیکن کامران اس پیشکش سے مطمئن نہ ہوا اور آگے بڑھتا چلا آیا ۔ جب وہ لاہور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بابر کا مقرر کیا ہوا لاہور کا گورنر میر یونس علی دیانتداری سے ہمایوں کا وفادار تھا ۔ یہ صورت حال مساہبہ کر کے اور باقاعدہ جنگ سے محترز رہ کر کامران نے حکمت عملی سے لاہور اور ستلج تک کے علاقے کو زیر نگین کر لیا ۔ ہمایوں بھی جنگ پر آمادہ نہ تھا ۔ اس نے اس زبردستی کے قبضے کو تسلیم کر کے کابل اور قندھار کے علاوہ ستلج تک کا علاقہ کامران کے سپرد کر دیا ۔

دہلی میں ہمایوں کو شیر شاہ سوری سے جنگ میں ۱۰ محرم ۹۴۷ھ/۱۷ مئی ۱۵۴۰ء کو شکست ہوئی ۔ پہلے تو اس نے آگرے میں پناہ لی، پھر لاہور کی طرف بڑھا ۔ یہیں یکم ربیع الاول ۹۴۷ھ / ۶ اگست ۱۵۴۰ء کو چغتائی سلاطین و امرا جمع ہوے، لیکن فریب کاری معمول بن چکا تھا ۔ محمد سلطان اور اس کے بیٹے لاہور سے ملتان فرار ہو گئے ہندال اور یادگار میرزا نے بھکر اور ٹھٹھے کا رخ کیا ۔ ہمایوں شیر شاہ کے تعاقب سے گھبرا کر ہندوستان سے ایران پہنچا اور شیر شاہ نے رہتاس کا قلعہ بنایا اور اپنے جرنیل خواص خاں کو مفتوحہ علاقہ سپرد کر کے خود آگرے لوٹ گیا ۔

شیر شاہ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ / ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو ہوئی اور اس کے مقرر کیے ہوے لاہور کے حاکم ہیبت خان نیازی نے اس کے جانشین اور بیٹے اسلام شاہ کے خلاف عام بغاوت بلند کر کے لاہور میں ایک آزاد حکمران کی حیثیت سے اپنے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا ۔ تقریباً ایک سال بعد ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں اسلام شاہ نے نیازیوں کو شکست دے کر لاہور پر اپنا قبضہ جما لیا ۔

چزده سال کی جلا وطنی کے بعد ہمایوں نے ذوالحجہ ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء میں ہندوستان کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور لاہور پر ۲ ربیع الآخر ۹۶۲ھ / ۲۳ فروری ۱۵۵۵ء کو قبضہ کر کے ابوالمعالی کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔

ہمایوں کو ہندوستان پر دوبارہ تسلط کے بعد بہت دیر تک حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہ ۱۱ ربیع الاول ۹۶۳ھ/۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو راہی ملک عدم ہوا۔ اس وقت اس کا بیٹا جلال الدین محمد اکبر کلانور میں تھا، چنانچہ ہمایوں کے انتقال کی اطلاع ملنے پر ۲ ربیع الآخر ۹۶۳ھ / ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو اسے یہیں تخت نشین کرا دیا گیا۔ اکبر کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔

اکبر کی تخت نشینی کے تین دن بعد کلانور میں ایک جلسے کا انعقاد قرار پایا اور اس کی اطلاع ابوالمعالی کو بھی دی گئی۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں ابھی مرحوم شہنشاہ کا سوگ منا رہا ہوں، لہٰذا کسی ایسی تقریب میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس پر اکبر نے ان کی حاضری پر اصرار کیا اور بیرم خان نے تولک خاں توچین سے کہ کر انھیں قتل کرنے کے ارادے سے گرفتار کرا دیا، لیکن اکبر کو یہ منظور نہ تھا کہ تخت نشینی کے ساتھ ہی کسی بیگناہ کا خون بہایا جائے، چنانچہ اس نے زنجیریں پہنا کر اسے لاہور بھجوا دیا اور کوتوال گل گز کی تحویل میں دے دیا۔ کوتوال نے کسی وجہ سے مناسب احتیاط نہ برتی اور ابوالمعالی زنداں سے نکل گئے۔ اس پر گل گز نے شاہی عتاب کے خوف سے زہر کھا کر خود کو ہلاک کر دیا۔

اکبر اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا، اس نے ایک فوج خضر خواجہ خان کے سپرد کی تاکہ یہاں امن و امان بحال کیا جائے۔ خضر خواجہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا شوہر تھا۔ اس نے اس فوج کے ساتھ لاہور میں ڈیرے ڈال دیے اور سکندر سوری کے استیصال کے لیے انتظامات شروع کر دیے۔

سکندر سوری بعض امرا کی انگیخت پر پہاڑوں سے اتر کر لاہور کی طرف بڑھا اور خضر خواجہ خان اس کے مقابلے کے لیے نکلا۔ خضر خواجہ خان چمیاری پہنچا اور دشمن سے دس کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے اپنے دو ہزار منتخب آدمیوں کی فوج آگے بھجوا دی۔ سکندر نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دی۔ اس کے بعد خضر خواجہ خاں لاہور واپس چلا آیا۔

۴ صفر ۹۶۳ھ/۱۹ دسمبر ۱۵۵۶ء کو اکبر خود صورت حال سے نبٹنے کے لیے لاہور کی طرف بڑھا اور چھے مہینے کی تگ و دو کے بعد سکندر کو جونپور کی عارضی جاگیر دے کر سرکشی سے روکنے کی کوشش کی۔ سکندر سوری نے ہتیار ڈال دیے اور بادشاہ سے صلح کر لی۔ اس کے بعد اکبر چار مہینے اور چودہ دن لاہور میں مقیم رہا اور حسین خان کو لاہور کا گورنر مقرر کر کے ۷ دسمبر ۱۵۵۷ء کو عازم دہلی ہوا۔

اکبر کے زمانے میں ۱۵۸۶ء تک بالترتیب حسین خان (۱۵۵۷ تا ۱۵۶۰ء)، شمس الدین محمد خان اتکہ (۱۵۶۰ تا ۱۵۶۱ء)، خان کلاں میر محمد اتکہ (۱۵۶۱ تا ۱۵۶۸ء)، خان جہاں حسین قلی خان (۱۵۶۸ تا ۱۵۷۵ء)، شاہ قلی خان محرم (۱۵۷۵ تا ۱۵۷۸ء)، سعید خان (۱۵۷۸ تا ۱۵۸۳ء)، راجہ بھگونت داس (۱۵۸۳ تا ۱۵۸۶ء) اور عصمت قلی (۱۵۸۶ء) لاہور کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور مئی ۱۵۸۶ء میں خود بادشاہ نے لاہور پہنچ کر اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ یہاں وہ راجہ بھگونت داس کی حویلی میں مقیم ہوا، جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ شاید قلعۂ لاہور اس وقت

اس قابل نہیں تھا کہ بادشاہ اس میں اقامت اختیار کرے۔

اکبر نے لاہور میں اقامت کے زمانے میں ۱۲ فروری ۱۵۹۲ء کو یہ انتظامی تبدیلی کی کہ لاہور، ملتان، کابل اور کشمیر کے صوبے اپنے ایک امیر خواجہ شمس الدین خوافی کی تحویل میں دے دیے ۔ دو سال بعد لاہور کی ٹکسال کا انتظام بھی خواجہ شمس الدین خوافی کے سپرد کر دیا گیا ٹکسال میں بننے والے تمام سکوں کا معیاری وزن مقرر کیا گیا ۔ مئی ۱۵۹۴ء میں راوی کے کنارے اکبر کے حکم سے لکڑی کا ایک جہاز بنایا گیا، جسے ایک ہزار آدمیوں کی کوشش سے خشکی سے دریا تک پہنچا کر بندر لاہری روانہ کر دیا گیا۔

اکبر ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک چودہ سال لاہور میں مقیم رہا اور یہیں سے اس نے مملکت کے انتظام اور توسیع کے لیے مختلف مہمیں سر کیں۔ اس عرصے میں اس نے عصمت قلی کے بعد راجہ بھگونت داس (۱۵۸۶ء تا ۱۵۸۹ء)، قلیج خان (۱۵۸۹ تا ۱۵۹۲ء)، خواجہ شمس الدین خوافی (۱۵۹۲ تا ۱۶۰۰ء)، مؤمن (۱۶۰۰ء) اور پھر قلیج خان (۱۶۰۱ تا ۱۶۰۵ء) کو لاہور کا گورنر مقرر کیا ۔ اکبر ۱۵۹۸ء میں لاہور سے روانہ ہو گیا ۔ زندگی کے آخری ایام اس نے آگرے میں گزارے اور یہیں ۱۳ جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ / ۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو فوت ہوا اور سکندر میں دفن ہوا۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نور الدین جہانگیر ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ / ۲ نومبر ۱۶۰۵ء کو ۳۸ سال کی عمر میں آگرے میں تخت نشین ہوا اور اس کے بعد ۱۶۲۷ تا ۱۷۶۸ء بارہ مغل بادشاہوں نے عنان حکومت سنبھالی ۔ ان کے عہد میں ۵۲ گورنر مرکزی حکومت کی نمائندگی حاکم لاہور کی حیثیت سے کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں لاہور شہر اور صوبے کی توسیع ہوتی رہی اور سیاسی رد و بدل کے باوجود شہر کی سیاسی، دینی علمی، ثقافتی اور صنعتی زندگی میں پیش رفت ہوتی رہی، جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

لاہور میں مرکزی حکومت کی طرف سے آخری حاکم آدینہ بیگ خان [رک بآں] مقرر ہوا ۔ یہ ذات کا ارائیں اور شرقپور کا باشندہ تھا ۔ یہ وہ شرقپور نہیں جو لاہور کے قریب راوی کے دائیں کنارے ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے، بلکہ یہ شرقپور جالندھر کے قریب واقع تھا اور اب بھی شرقپور کہلاتا ہے ۔ آدینہ بیگ خان کو ۱۷۵۵ء میں حاکم لاہور مقرر کیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی کی یلغاریں: مغلوں کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونے اور پنجاب میں سکھوں کی شورش کی وجہ سے لاہور بلکہ ہندوستان پر ملک کے اندر اور ملک سے باہر کے حکمرانوں کی نظریں پڑنے لگیں ۔ ان میں سے ایک احمد شاہ ابدالی بھی تھا جو اس وقت کابل اور قندھار پر قابض تھا ۔ ابدالی ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء کے اختتام پر چوتھی دفعہ ہندوستان کی طرف بڑھا اور آدینہ بیگ خاں کو شکست دے کر اسے لاہور سے ہانسی اور حصار کے صحرا کی طرف فرار ہونے پر مجبور کیا ۔ احمد شاہ بڑھتا ہوا دہلی پر قابض ہو گیا اور وہاں سے مراجعت پر پہلے خود لاہور کا انتظام کرنے کے لیے یہاں مقیم رہا، پھر تیمور شاہ کو حاکم لاہور مقرر کر کے قندھار واپس چلا گیا ۔ شہزادہ تیمور شاہ کے ساتھ احمد شاہ نے اپنے آزمودہ کار جرنیل جہان خاں کو مقرر کر دیا کہ استحکام سلطنت میں مدد کرے۔

ابدالیوں کو شکست دینے کے لیے آدینہ بیگ خاں نے مرہٹوں سے ساز باز کی، چنانچہ انھیں شکست دے کر آدینہ بیگ خان ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۸ء میں پھر لاہور پر قابض ہو گیا ۔ اس جنگ کے بعد

شہزادہ تیمور شاہ اور جہان خان فرار اختیار کرتے ہوے کابل کی طرف روانہ ہو گئے ۔ آدینہ بیگ خان نے رمضان ۱۱۷۱ھ/مئی ۱۷۵۸ء میں اپنے ورود لاہور کے موقع پر جشن منایا اور دُہل وکرنا سے اس کا اعلان کیا، لیکن لاہور میں آدینہ بیگ کو چین سے بیٹھنے کا موقع نہ ملا ۔ اس عرصے میں ایک تو ابدالیوں کی طرف سے اسے خوف لاحق رہا اور دوسرے مرہٹے پنجاب پر نظریں گاڑے ہوے تھے ۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء کو آدینہ بیگ خان قولنج کے مرض سے فوت ہو گیا اور لاہور پر جنکوجی مرہٹہ کا قبضہ ہو گیا جس نے مرہٹہ ساما کو حاکم لاہور مقرر کر دیا ۔

۱۱۷۳ھ / اگست ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ نے ایک دفعہ پھر کثیر جمعیت کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا ۔ اس کے آنے کی خبر سنتے ہی حاکم لاہور ساما فرار ہو گیا ۔ احمد شاہ نے صفر ۱۱۷۴ھ/ ستمبر ۱۷۶۰ میں لاہور میں داخل ہو کر حاجی کریم داد کو حاکم لاہور مقرر کیا ۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ۱۷۵۸ اور ۱۷۵۹ء کے مابین لاہور پر کسی مرکزی حکومت کا تسلط نہ تھا اور ابدالیوں نے بھی یہاں اپنے نواب مقرر کرنے کے سوا اور کسی چیز میں دلچسپی نہ لی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے میں سکھ شورشی روز بروز طاقتور ہوتے گئے ۔ درّانی ان کی سرکوبی بار بار کرتا، لیکن جب وہ ہندوستان کی طرف بڑھتا تو یہ پہاڑوں میں جا کر چھپ جاتے اور جب واپس چلا جاتا، تو یہ پھر پہاڑوں سے نیچے اتر کر ملک کو غارت کرنا شروع کر دیتے ۔

احمد شاہ آخری دفعہ ۱۷۶۵ء کے اواخر میں قندھار لوٹا، اس سے پہلے ۱۷۶۳ء سے اس نے دیوان کابلی مل کو لاہور کا گورنر مقرر کیا تھا، گو تھوڑی دیر کے لیے اسے منصب سے ہٹا بھی دیا گیا تھا ۔ احمد شاہ کی مراجعت کے بعد ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء میں بھنگی مسل کے دو سربراہ لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ لاہور کے قریب رنگ روٹنی سے اپنی دو ہزار فوج لے کر باغبانپورہ کے قریب آ کر خیمہ زن ہو گئے ۔ اس وقت کابلی مل اپنے آقا احمد شاہ کے ساتھ سفر میں تھا اور اس کا بھتیجا امیر سنگھ لاہور میں اس کے فرائض سرانجام دے رہا تھا ۔ اس موقع کو غنیمت جان کر اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوے دونوں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور امیرسنگھ کو حراست میں لے لیا ۔ ان دونوں کے ساتھ نیاز بیگ کا سکھ سوبھا سنگھ بھی دو سو کی فوج کے ساتھ آ کر مل گیا اور تینوں نے لاہور کے یوں حصے بخرے کیے کہ لاہور کا شمالی حصہ نیاز بیگ تک جس میں مزنگ، کوٹ عبداللہ شاہ، اچھرہ اور چوبرجی شامل تھی، سوبھا سنگھ کے حصے میں آیا ۔ اس نے چوبرجی باغ کے ایک حصے کو قلعے میں تبدیل کر کے اس کا نام نواں کوٹ رکھ دیا ۔ گوجر سنگھ کو شہر کا مشرقی حصہ حویلی کابلی مل سے شالامار باغ تک ملا اور اس نے اس کے وسط میں قلعۂ گوجر سنگھ کے نام سے مع فصیل ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا ۔ لہنا سنگھ نے شہر کے وسطی حصے پر قبضہ جمایا جس میں قلعہ، اور روشنائی، کشمیری، خضری اور مستی دروازے کی حدود شامل تھیں ۔

۱۷۶۴ء میں احمد شاہ درانی نے ایک بار پھر لاہور پر فوج کشی کی ۔ جب درانی لاہور کے قریب پہنچا تو یہ خبر سنتے ہی لاہور کے تینوں سکھ حاکم سوبھا سنگھ، لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، حالانکہ اس وقت تک یہ آٹھ دس ہزار فوج جمع کر چکے تھے، چنانچہ احمد شاہ درانی سکھوں کی مدافعت کے بغیر شہر لاہور میں داخل ہو گیا ۔ اس واقعے کے متعلق کسی معاصر پنجابی شاعر نے یہ شعر کہا تھا ۔

سوبھے دی سوبھا گئی، گوجر دا گیا مال
لہنے نون دینا آیا، تنون ہوئے کنگال

احمد شاہ شہر میں داخل ہوا تو بعض مسلمانوں نے لہنا سنگھ کی بڑی توصیف کی اور اس کے عدل اور انصاف کی تفاصیل بیان کیں۔ احمد شاہ نے سوچا کہ ایسا آدمی میرا نائب بن سکتا ہے، چنانچہ اس نے لہنا سنگھ کو ایک خط لکھا اور لاہور کی گورنری کی پیشکش کی۔ لہنا سنگھ نے موضع موڑھ کے رحمت اللہ بیگ کے توسط سے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر میں اسے قبول کر لوں تو سکھوں کی نظر سے گر جاؤں گا۔ ایک ہفتے کے بعد احمد شاہ نے مولوی عبداللہ کے بھائی داور خان کو لاہور کا حاکم اور رحمت اللہ روھیلہ کو اس کا نائب مقرر کر دیا۔ اس کے بعد وہ خود سرھند کی طرف بڑھ گیا۔

احمد شاہ اس مہم کے بعد وطن واپس ہوا اور پھر کبھی اندرونِ ھند تک آگے نہیں بڑھا، صرف ایک دفعہ ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ - ۱۷۷۰ء میں رسول نگر سے بارہ میل کے فاصلے پر موضع جوکالیاں سے ہو کر واپس چلا گیا، لیکن سکھوں کا وتیرہ یہی رہا کہ جونہیں احمد شاہ لاہور سے واپس جاتا، وہ فوراً پناہ گاھوں سے نکل کر لاہور اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں پر قبضہ کر لیتے۔ ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء میں سکھ مالوے سے واپس آ کر پھر اپنے اپنے علاقے پر قابض ہو گئے۔ گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ نے بھی شالا مار باغ میں آ کر ڈیرے ڈال دیے۔ انھوں نے حاکم لاہور داور خان کو پیغام بھیجا۔ ''تم یا تو لاہور خالی کر دو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ داور خان نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور شہر کے عمائد میاں محمد عاشق، میر نتھو شاہ، حافظ قادر بخش تاجر لالہ مہاراج اور دیگر معزز شخصیتوں کو بلا کر ان کی رائے طلب کی، سب نے یک زبان ہو کر کہا، ''عوام سکھوں کی حکومت سے اتنے شاکی نہیں، ممکن ہے وہ رات کو فصیل کے دروازے کھول کر یا نقب لگا کر انھیں شہر کے اندر لے آئیں۔ اس صورت میں آپ ان کے غصے کا نشانہ بنیں گے۔ اس لیے ھماری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے براہِ راست گفتگو کریں اور ماھانہ یا جاگیر حاصل کر کے شہر ان کے حوالے کر دیں''۔ یہ سن کر داور خان سکھوں کے پاس گیا۔ اور بیس روپے روزانہ کا الاؤنس لے کر شہر ان کے حوالے کر دیا (عبرت نامہ مفتی علی الدین، برگ ۱۳۰، ۱۴۴)۔

گوجر سنگھ نے ۱۷۹۱ء میں اپنے ساتھیوں میں سب سے پہلے وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے صاحب سنگھ نے لی۔ ۱۷۹۸ء میں لہنا سنگھ فوت ہوا تو اس کے حصے پر اس کا بیٹا چیت سنگھ قابض ہوا۔ الغرض اس طرح احمد شاہ کی مراجعت کے بعد تقریباً تیس سال تک کسی تردد اور مداخلت کے بغیر سکھ لاہور پر قابض رہے۔

تیمور شاہ کا بیٹا اور احمد شاہ درانی کا پوتا شاہ زمان ۱۷۹۳ء میں کابل کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے دل میں ہندوستان پر قبضہ کرنے کی آرزو چٹکیاں لیتی رہی۔ بالآخر وہ ۱۷۹۵ء کے اواخر میں حسن ابدال آ پہنچا۔ اس نے ایک مختصر سی جماعت آگے بھیجی، جنھوں نے قلعۂ رھتاس پر قبضہ کر لیا، لیکن اس کے ساتھ ھی شاہ زمان کو کابل میں بغاوت کی خبر ملی تو اسے واپس جانا پڑا۔ اگلے سال ۱۷۹۶ء میں شاہ زمان کے متوقع حملے کی خبر سن کر سکھ بہت ھراسان ہوئے۔ انھوں نے اپنا مال و اسباب اور اھل و عیال تو پہاڑوں میں بھیج دیے اور خود اپنے اپنے مورچوں میں جم کر بیٹھ گئے۔ شاہ زمان ۱۷۹۷ء کے آغاز میں لاہور

میں داخل ہوا اور اس نے اپنے وزیر شیر محمد خان کی وساطت سے سکھوں کو رام کرنا چاہا۔ بہت سے سکھ اس کے ساتھ مل گئے، لیکن اس وقت شاہ زمان کے بھائی محمود خان نے کابل میں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ لاہور کو اسی حالت میں چھوڑ کر فوراً واپس چلا گیا، اگرچہ سکھ اس کی متابعت کرنے پر آمادہ تھے۔

۱۷۹۸ء میں شاہ زمان نے پھر لاہور پر حملہ کیا اور لاہور کے حاکم چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور لہنا سنگھ مقابلے کے بغیر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شاہ زمان نے لاہور میں داخل ہو کر پھر سکھوں کو خوش کرنے اور ساتھ ہی دھمکی دینے کے عمل کو روا رکھا اور ایک مہینے تک لاہور میں ٹھیرا رہا۔ اس دوران میں اس کے دو وزیر شیر محمد خان اور وفادار خان اس مسئلے پر بحث کرتے رہے کہ سکھوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ وفادار خان کا خیال تھا کہ سکھوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دینا چاہیے، لیکن شیر محمد خان کی رائے یہ تھی کہ سکھوں کے سرگروہوں کی ہمت افزائی کر کے ان کا وقار بحال رکھنا چاہیے۔ ۱۷۹۹ء کے آغاز میں شاہ زمان کو پھر محمود خان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے کابل واپس جانا پڑا۔

رنجیت سنگھ لاہور میں: اس حملے کے دوران سکرچکیہ مسل کے سرگروہ رنجیت سنگھ نے شاہ زمان پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ رنجیت سنگھ کی نظر لاہور پر تھی۔ جہلم میں سیلاب آیا ہوا تھا اور شاہ زمان بھاری توپوں کے ساتھ اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ اس نے رنجیت سنگھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر تم میری توپوں کو دریا سے نکلوا کر کابل پہنچا دو تو اسے گراں قدر خدمت سمجھا جائے گا۔ یہ توپیں دریا میں گر پڑی تھیں۔ رنجیت سنگھ نے بارہ میں سے آٹھ توپوں کی بازیافت کی اور انھیں کابل پہنچا دیا۔ شاہ زمان نے انعام کے طور پر کابل ہی سے لاہور رنجیت سنگھ کو بخش دیا۔

رنجیت سنگھ کے لیے لاہور کا تحفہ صرف برائے نام تھا کیونکہ دور دست حکمران کے عطیے کے باوجود رنجیت سنگھ کو لاہور پر اپنا تسلط خود قائم کرنا تھا۔

اس وقت لاہور پر چیت سنگھ، مہر سنگھ اور گوجر سنگھ کے بیٹے صاحب سنگھ کے نائبین لاہور کے مختلف حصوں پر قابض تھے۔ انھوں نے غلطی سے مہر محکم اور لاہور کے دیگر زمینداروں پر سختی شروع کر دی اور انھیں لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی اطلاع مہر محکم اور دوسرے زمینداروں کو مل گئی، چنانچہ انھوں نے جواباً منصوبہ بنایا کہ ان سکھوں کو لاہور کی حکومت سے ہٹا دیا جائے۔ پہلے انھوں نے قصور کے حاکم نظام الدین خاں کو دعوت دی کہ ''تم کسی رات لاہور پر قبضہ کر لو ہم تمھارے لیے فصیل کا ایک دروازہ کھول دیں گے''۔ نظام الدین خاں اس پر آمادہ ہو گیا، لیکن جب اس نے اس منصوبے پر عمل درآمد کرنا چاہا تو سکھوں کی سپاہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا کیونکہ لاہور کے حاکموں کو اس منصوبے کی اطلاع بروقت مل گئی تھی۔

اس کے بعد لاہور کے ارائیوں نے رسول نگر پہنچ کر رنجیت سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد قاضی غلام خان کو لاہور بھیجا تاکہ وہ لاہور کی صورت حال دریافت کرے اور پھر ارائیوں سے مشورہ کرے۔ قاضی غلام خان نے لاہور سے واپس جا کر رنجیت سنگھ کو اطلاع دی کہ صرف ارائیوں کی مدد سے لاہور پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر رنجیت سنگھ

نے قاضی عبدالرحمٰن کو لاہور بھیجا تاکہ وہ عمائد سے رابطہ قائم کرکے شہر کو فتح کرنے کے منصوبے کے لیے زمین ہموار کرے۔ قاضی نے لاہور میں میاں محمد عاشق، نواں کوٹ کے سہر محکم، اٹاری کے عابد خان محمد عظیم، باغبانپورے کے حافظ محمد، سہر شادی کٹار بند، لاہور کے احمد خان بینڈر، اور موضع لویریاں کے میاں جان محمد سے رابطہ قائم کیا۔ مؤخرالذکر رنجیت سنگھ کی داشتہ موراں کے مرشد بھی تھے۔ یہ سب لوگ لاہور کے تینوں سکھ حاکموں سے تنگ آ چکے تھے، اس لیے رنجیت سنگھ کی مدد کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گئے۔ قاضی کی مراجعت سے تھوڑی دیر بعد انھوں نے محمد عظیم باغبان کو رنجیت سنگھ کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ ''ہم مقررہ رات کو لُہاری دروازہ کھلا رکھیں گے اور تم اس راستے سے افواج سمیت شہر کے اندر آ جانا''۔ لیکن قاصد بھیجنے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ رنجیت سنگھ کو اس جگہ سے راستہ دیا جائے گا جہاں سے شہر کی فصیل خضری اور کشمیری دروازے کے درمیان ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ اطلاع رنجیت سنگھ کو اس وقت بھیجی گئی جب وہ رسول نگر سے چل پڑا تھا، اور دوسرے قاصد کا اس سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب رنجیت سنگھ لُہاری دروازے کی طرف بڑھا تو اس پر اس دروازے اور شاہ عالمی دروازے سے حملہ کر دیا گیا۔ اس لڑائی میں اس کی بہت سی سپاہ کام آئی اور اسے چاہ میراں کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ منصوبہ سازوں نے دیکھا کہ ان کا منصوبہ ناکام رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے رنجیت سنگھ کو پھر پیغام بھیجا کہ اگر تم آئندہ رات حملہ کرو تو ہم لُہاری دروازہ ضرور کھول دیں گے چنانچہ اس دفعہ رنجیت سنگھ ارائیوں کی مدد سے لاہور پر قابض ہو گیا۔

سوبھا سنگھ کا بیٹا سہر سنگھ رائے حویلی میں کوٹ لکھپت میں مقیم تھا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرکے اسے لاہور سے بھگا دیا۔ قلعے پر لہنا سنگھ کے لڑکے چیت سنگھ کا قبضہ تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کی پیش قدمی کی خبر سن کر خود فرار ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے سہر محکم اور اس کے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نوازا بلکہ سہر محکم کو بابا کا خطاب بھی دیا اور اسے لاہور کا مدارالمہام مقرر کر دیا۔ رنجیت سنگھ خود قلعے کے بجائے اپنی داشتہ موراں کے مکان پر مقیم رہا اور کچھ دیر کے بعد اس نے سہر محکم سے ناراض ہو کر اس سے ''بابا'' کا خطاب واپس لے لیا۔ بلکہ اس سے دس ہزار روپے کا جرمانہ وصول نہ ہو سکنے کی وجہ سے اسے زندان میں ڈال دیا، البتہ جب اس نے جرمانہ ادا کر دیا تو اسے رہا کر دیا گیا اور وہ اپنی زمینوں پر آباد ہو گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی معتوب ہو کر سیاسی فضا سے دور ہٹ گئے اور لاہور کا انتظام بڑی حد تک موراں کے سپرد کر دیا گیا، یہاں تک کہ رنجیت سنگھ نے جو سکّے جاری کیے ان پر بھی موراں کی آرسی کا نشان کندہ کرایا۔ یہ سکّے ''موران شاہی'' کے نام سے معروف ہوئے۔

رنجیت سنگھ لاہور پر ۱۷۸۸ء سے ۱۸۳۹ء تک قابض رہا اور لاہور ہی کو اپنے مقبوضات کا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ یہیں بیٹھ کر اس نے اپنے علاقے کی توسیع کی اور ملتان سے لے کر جمرود تک کی سر زمین پر قابض ہو گیا۔ ۱۸۰۹ء تک انگریزوں نے آگے بڑھ کر ستلج پار کی سکھ ریاستوں پر قبضہ کر لیا اور رنجیت سنگھ نے اپنے آپ کو انگریزوں کا مدمقابل نہ سمجھتے ہوئے پچیس اپریل ۱۸۰۹ء کو بمقام امرتسر ان سے معاہدہ کر لیا کہ میں ستلج پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ اس وعدے کو رنجیت سنگھ نے تازیست نباہا اور اپنی

فتوحات کا رخ مشرق کے بجائے شمال اور مغرب کی طرف موڑ دیا۔

۱۸۱۰ء میں شاہ زمان نے اپنے بھائی شاہ شجاع کو کابل کی حکومت سے محروم کر دیا اور وہ سکھوں کی مدد کی ایک موہوم امید کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ رنجیت سنگھ اس وقت وزیر آباد میں تھا۔ شاہ شجاع مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۱۳ء میں لاہور پہنچا۔ اس وقت مشہور عالم ہیرا ''کوہ نور'' شاہ شجاع کے پاس تھا۔ رنجیت سنگھ نے دسیسہ کاری اور تزویر سے لاہور میں یہ ہیرا شاہ شجاع سے حاصل کر لیا، اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد اور جھنگ اور کوٹ کمالیہ کے پرگنے اسے جاگیر میں دینے کا وعدہ کیا۔ ایک لاکھ روپیہ نقد ادا بھی کر دیا، لیکن وعدے کے دیگر حصوں کو پورا کرنے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ رنجیت سنگھ ۱۱ اساڑھ ۱۸۹۶ بکرمی / ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو ۵۹ سال کی عمر میں فوت ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو وفات پائی اور اس کے بعد اس کا بیٹا نونہال سنگھ برائے نام حاکم لاہور بنا۔ یہ ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا اور اس کے بعد اس کی ماں چندر کور تھوڑے سے عرصے کے لیے ۱۸۴۰ء میں حاکم لاہور بن گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے شیر سنگھ اور دلیپ سنگھ ۱۸۴۳ تا ۱۸۴۹ء لاہور کے حاکم بنے۔ اس عرصے میں سکھوں کی انگریزوں سے آویزش بڑھتی گئی اور بالآخر ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو انگریزوں نے سکھوں کو متعدد جنگوں میں شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔

انگریز: انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو پہلے حکومت چلانے کے لیے ایک مجلس انتظامیہ قائم کی، جو ہند کے گورنر جنرل سے براہ راست ہدایات وصول کرتی تھی۔ اس مجلس کے تین رکن تھے صدر کرنل (بعد میں سر) ہنری لارنس، دوسرے دو اراکین میں سے ایک اس کا بھائی (بعد میں لارڈ) جان لارنس تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک افسر تھا، تیسرا رکن (بعد میں سر) رابرٹ منٹگمری تھا جو کمپنی کا ملازم تھا۔

۱۸۵۳ء میں مجلس انتظامیہ توڑ کر سرجان لارنس کو صوبۂ پنجاب کا چیف کمشنر مقرر کر دیا گیا جس کا دارالسلطنت لاہور تھا۔

چار سال بعد انگریزوں کی حکومت کے خلاف جنگ آزادی کی تحریک چلی۔ انگریزوں نے اسے ''غدر'' کے نام سے موسوم کیا۔ دوسرے شہروں کی طرح لاہور اور پنجاب میں بھی اس جنگ کی وجہ سے بڑا ہنگامہ ہوا اور لاہور کے دو زندانوں میں ۲۳۷۹ قیدی بند کر دیے گئے۔ اہالی لاہور پر بہت جرمانے کیے گئے اور انھیں صرف قید ہی نہ کیا گیا بلکہ کوڑے مارنے کی شدید سزائیں بھی دی گئیں۔

جنگ آزادی کا ہنگامہ فرو ہونے پر ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے حکومت ہند کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ کے سپرد کر دی۔ اس طرح ملکہ وکٹوریہ لاہور کی پہلی برطانوی ملکہ بنی۔ ۱۹۴۷ء تک وکٹوریہ کے علاوہ چار اور برطانوی بادشاہوں نے لاہور پر تسلط قائم رکھا اور ان کے ۲۷ انگریز نواب بحیثیت چیف کمشنر، لفٹننٹ گورنر اور گورنر اس کے حاکم رہے۔ ان میں صرف ایک ہندی مسلمان سکندر حیات خان ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۴ء میں چند مہینوں کے لیے قائم مقام گورنر مقرر ہوا۔

سر رابرٹ منٹگمری ۲۶ فروری ۱۸۵۹ء میں پنجاب کا پہلا لفٹننٹ گورنر مقرر ہوا اور دس جنوری ۱۸۶۵ء کو جب اس نے اپنے عہدے سے استعفا دیا تو پنجاب کے جاگیر داروں نے اس کی یادگار کے طور پر لارنس گارڈنز میں منٹگمری ہال

کے نام سے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرائی۔ انگریزی عہد میں ۱۸۶۵ء میں لاہور کا چیف کورٹ قائم ہوا۔ حکومت پنجاب نے مرکزی حکومت کو لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز بھیجی۔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں گورنر نے اس کی منظوری دی اور اس سال اکتوبر کو لاہور میں ایک خود مختار ادارے کی حیثیت میں پنجاب یونیورسٹی کی تأسیس ہوئی۔ لاہور میں میو سکول آف آرٹس کی عمارت بھی اسی سال تعمیر ہوئی اور ویٹرنری سکول بھی اسی سال قائم ہوا۔ انگریزوں کے عہد میں لاہور میں متعدد رفاہی، تعلیمی اور صحت کے ادارے قائم ہوئے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

پنجاب پبلک لائبریری ۳۱ دسمبر ۱۸۸۵ء، ایچیسن کالج ۱۸۹۶ء، لیڈی ایچیسن ہسپتال ۱۵ فروری ۱۸۸۷ء میں قائم ہوئے۔ وکٹوریہ جوبلی ہال کا سنگ بنیاد فروری ۱۸۸۷ء میں رکھا گیا۔ لیڈی ایچیسن ہسپتال کی عمارت ۱۵ نومبر ۱۸۸۸ء، لاہور مشن کالج کی عمارت ۲۵ نومبر ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوئی، نیو جوبلی میوزیم اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد فروری ۱۸۹۰ء میں رکھا گیا (باقی قدیم و جدید کالجوں کے لیے دیکھیے رسالۂ نقوش، لاہور نمبر)۔

اس دور کے بعد انگریزی عہد میں لاہور سیاست کے بجائے ثقافت کا مرکز بنتا ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک اس صدی کے آغاز میں سیاسی بیداری لوگوں کے اذہان میں کروٹیں نہیں لینے لگتی۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور دریاے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگرس کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں انگریزوں کے تسلط سے مکمل آزادی کی قرار داد منظور کی گئی۔ یہ شرف بھی اس شہر کو حاصل ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں یہیں آل انڈیا مسلم لیگ نے مشہور عالم ''قرار داد لاہور'' منظور کی جو آگے چل کر پاکستان کی بنیاد بنی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا اور لاہور پاکستان کے حصے میں آیا جب کہ ریڈکلف باونڈری کمیشن نے انگریزی دور کے صوبۂ پنجاب کو ۱۷ اگست کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

سندھ کا سابق گورنر سر فرانسس موڈی پنجاب کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔ اسے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح نے مقرر کیا۔ لاہور پنجاب کا دارالسلطنت قرار پایا اور سر فرانسس موڈی نے یہیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خواجہ ناظم الدین پاکستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور ۱۹۴۹ء میں سردار عبدالرب نشتر پنجاب کا پہلا پاکستانی گورنر مقرر ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے گورنر مقرر ہوتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں سارے مغربی پاکستان کو ایک یونٹ (منطقہ) قرار دیا گیا جس کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب مقرر ہوئے، لاہور ہی اس منطقے کا صدر مقام قرار پایا۔ یونٹ ۱۹۷۰ء میں توڑ دیا گیا، لاہور پھر بھی صدر مقام رہا اور اب بھی مشرقی پاکستان کی علحدگی کے بعد بھی صدر مقام ہے۔

آثار لاہور: لاہور میں ہندوؤں یا ان سے پہلے کے کوئی آثار قدیمہ موجود نہیں۔ اس کی غالباً اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں کی عمارات کی تعمیر کے لیے شہر سے قریب عمارتی پتھر دستیاب نہیں ہوتا تھا جسے آسانی سے دیر پا عمارات کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس شہر پر اتنے تباہ کن حملے ہو چکے ہیں کہ قدیم عمارات باقی نہیں بچیں۔ پھر

ایک بات یہ بھی ہے کہ شاید ازمنۂ قدیم میں شہر اس جگہ آباد نہیں تھا، جہاں اب ہے ۔ بعض روایات قدیم شہر کو اچھرے کے قرب و جوار میں آباد بیان کرتی ہیں ۔ اچھرے کا گاؤں پرانے شہر سے مغرب کی جانب تین میل کے فاصلے پر آباد تھا لیکن اب توسیع کی وجہ سے یہ اس کا ایک حصّہ بن گیا ہے ۔ ایک قیاس یہ بھی ہے کہ آج کل کے شہر کا لہاری یا لاہوری دروازہ اس لیے اس نام سے موسوم ہوا کہ اس کا رخ قدیم شہر لاہور کی طرف تھا ۔ بہر صورت ہندو عہد کے لاہور کے سرسری سے تاریخی حوالے صرف پانچویں صدی کے گمنام مصنف کی تالیف حدود العالم اور طاہر مروزی کی کتاب طبائع الحیوان میں ملتے ہیں، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اسی طرح غزنوی دور کی کسی عمارت کا قطعی طور پر علم نہیں ۔

پٹھان دور: تھارنٹن کی روایت (لاہور، ص ۸۳) کے مطابق لاہور کے آثار قدیمہ میں پٹھان دور سے متعلق صرف دو مساجد بچی ہیں۔ سید عبداللطیف (لاہور، ص ۲۳۵) بھی اس کا مؤیّد ہے، لیکن راقم مقالہ کو معاصر تواریخ سے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملا ۔ نیویں مسجد لہاری اور شاہ عالمی دروازے کے درمیان چوک متی کے نزدیک کوچۂ ڈوگراں میں واقع ہے ۔ مسجد کی عمارت بہت قدیم ہے ۔ اس کا صحن سطح زمین سے تقریباً دو منزل نیچے ہے ۔ تھارنٹن کے بقول یہ مسجد لودھی عہد کے وائسرائے ہیبت خان کے ایک سرکردہ اہلکار ذوالفقار خان نے تعمیر کرائی تھی ۔ مسجد کی تین محرابیں اور تین پختہ گنبد ہیں ۔ یہ مسجد اب بھی اچھی حالت میں ہے ۔

مسجد شیرانوالہ دروازہ: یہ پٹھان عہد کی دوسری عمارت ہے، جو اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس مسجد کی وسیع و عریض اور اونچی عمارت شیرانوالہ دروازے میں داخل ہوتے ہی اسلامیہ ہائی سکول نمبر ۱ کے سامنے سڑک کے دائیں طرف واقع ہے۔ پہلے یہ مسجد چھوٹی سی تھی، اس میں پولیس لائن کے ملازم ہی نماز ادا کیا کرتے تھے ۔ اس بنا پر اسے ''مسجد لائن سُبحان خان'' کہتے تھے ۔ اس صدی کے ربع اول کے اواخر میں اس مسجد کی توسیع کی گئی ۔ اس لیے یہ اصلی حالت پر قائم نہیں رہی۔

پٹھانوں کے بعد لاہور میں مُغلوں کی حکومت قائم ہوئی جو بہت عرصے تک قائم رہی۔ اس لیے مغل حکمرانوں کو فرصت اور وسائل میسر آئے کہ لاہور میں یادگار عمارتیں تعمیر کر سکیں ۔ ان عمارتوں کی عمومی انواع مساجد، قلعے، باغات، مزارات اور محلات وغیرہ پر مشتمل تھیں، اس لیے ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے جو بہت معروف ہیں اور ابھی تک عام و خاص کی توجہ کا مرکز ہیں :

(۱) بادشاہی مسجد: لاہور کی عمارات میں سے سب سے زیادہ پُرشکوہ اور وسیع ہے۔ اس کے سفید گنبد اور اونچے مینار میلوں سے نظر آتے ہیں ۔ یہ مسجد قلعۂ لاہور کے عالمگیری دروازے کے سامنے مغرب کی جانب ۱۰ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے جو محرابوں پر تعمیر کیا گیا ہے ۔ مسجد کا عالی شان صدر دروازہ مشرق کی جانب سنگِ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے ۔ اس تک پہنچنے کے لیے ۲۲ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ ان سیڑھیوں میں پہلے کابلی سنگ ابری استعمال کیا گیا تھا، مگر اب تازہ مرمت کے وقت سنگِ سرخ لگا دیا گیا ہے ۔ محراب دار دروازے کے اوپر سنگِ سرخ اور مرمر سے چھوٹے چھوٹے گنبد بنائے گئے ہیں اور دروازے کے باہر کی طرف عین وسط میں پیشانی پر سنگِ مرمر کی ایک تختی (کتبہ) نصب ہے جس میں کلمے کے علاوہ فارسی میں جو عبارت کندہ ہے، اس کا یہ مطلب ہے: یہ مسجد عالمگیر، ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۴ء میں باہتمام فدائی خان

کو کہ پایۂ تکمیل کو پہنچی، سجان رائے (خلاصۃ التواریخ، ص ۶۵) نے بیان کیا ہے کہ مسجد پر پانچ لاکھ روپئے سے زائد صرف ہوا تھا۔

دروازے سے اور ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد ہم وسیع صحن میں پہنچتے ہیں جو پہلے پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اب مرمت کے بعد سنگ سرخ کی سلوں سے تعمیر ہوا ہے۔ نماز پڑھنے کا یہ صحن مربع ہے اور اس کے مغرب میں مسجد کی عمارت ہے۔ صحن کے وسط میں ۵۰ فٹ مربع حوض پہلے اینٹوں سے بنا ہوا تھا، اب یہ سنگ مرمر سے بنا دیا گیا ہے۔ مسجد کی چھت کے اوپر تین خوبصورت سفید سنگ مرمر کے گنبد بنے ہوے تھے۔ مرمت کے بعد، جو پتھر ان گنبدوں کی تعمیر پر لگایا گیا ہے، وہ کچھ اتنا سفید نہیں۔ گنبدوں کے نیچے بڑا تالار ہے، جس میں محرابی دروازوں سے داخلہ ہوتا ہے۔

صحنِ مسجد کے ہر گوشے پر سنگ سرخ کے نہایت خوبصورت اور باوقار مینار بنے ہوے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی اونچائی اس وقت ۱۷۶ فٹ چار انچ ہے۔ ان میناروں پر سیڑھیوں سے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔ ۱۸۴۰ء کے زلزلے میں چاروں میناروں کے گنبد خراب ہوگئے تھے۔ اب ان کے بجاے سنگ مرمر کے نئے گنبد تعمیر کرائے گئے ہیں، جن پر روشنی کا انتظام ہے۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں مسجد کو فوجی بارود خانے میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور اس کے میناروں پر چھوٹی توپیں ''زنبورک'' رکھ کر بعض جنگوں میں انھیں استعمال کیا گیا۔ ۱۸۵۶ء تک مسجد پہلے سکھوں اور بعد میں انگریزوں کے قبضے میں رہی اور آخر میں (۱۸۵۶ء میں) لاہور کے مسلمان شہریوں کے اصرار پر اسے واگزار کر دیا گیا (گولڈنگ: *Ancient Lahore* ص ۹، ۱۰؛ کنہیا لعل: تاریخ لاہور، ص ۱۴۳، ۱۴۴)۔

۱۹۳۹ء تک مسجد کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ اس کے پیش نظر پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کرایا، جو ۱۹۶۱ء کے آغاز میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

یہ مسجد صحن کی وسعت کے لحاظ سے دنیا کی تمام مساجد سے بڑی ہے۔

مسجد وزیر خان: چنیوٹ پنجاب پاکستان کے رہنے والے شیخ علیم الدین انصاری نے ۱۰۴۴ھ/ ۱۶۳۴ء میں سید محمد اسحٰق عرف میران پادشاہ گازرونی کے مزار کی بالائی سطح پر اس کی بنیاد رکھی۔ حضرت میران پادشاہ ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴ء میں فیروز تغلق کے عہد میں لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کا زمین دوز مزار ابھی تک مسجد کے صحن میں موجود ہے۔ شیخ علیم الدین انصاری پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے۔ رفتہ رفتہ شاہجہان کے دربار میں وزیر کے عہدے تک پہنچے اور وزیر خان کا خطاب پایا اور ۱۶۳۲ تا ۱۶۳۹ء لاہور کے حاکم بھی رہے۔

یہ مسجد دیواروں کی کاشی کاری اور منبت کاری کے لیے مشہور ہے۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد سے لے کر بہت دیر تک میو سکول آف آرٹس لاہور کے طلبہ کو یہاں تزئین کا کام سکھانے کے لیے لایا جاتا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں اس درسگاہ کے پرنسپل مسٹر جے۔ ایل۔ کپلنگ نے سرکاری رپورٹ میں لکھا تھا ''یہ خوبصورت عمارت بذات خود تزئین کی ایک درسگاہ ہے، لیکن سال بسال اس کی نگہداشت کی طرف توجہ کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے نقش و نگار عدم توجہی کی وجہ سے خراب ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چربے نہایت احتیاط سے اتار

کر میوزیم اور سکول میں محفوظ کر دیے جائیں - ہمارے نوجوان مصوروں کے لیے اس سے بہتر اور کہیں تربیت نہیں ہو سکتی'' (کپلنگ : ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء کی رپورٹ، ص ۶).

کپلنگ کی پیشین گوئی نقش و نگار خراب ہونے کے متعلق درست ثابت ہوئی اور آج کل تزئین کی تجدید کا کام جاری ہے.

مسجد کا انتظام بانی مسجد کی وصیت کے مطابق متولیوں کے ہاتھ میں تھا، جو نواب وزیر خان کی اولاد میں سے تھے - نواب وزیر خان کی وصیت سید محمد لطیف (لاهور، ص ۲۱۶ تا ۲۲۱) کی تالیف اور نور احمد چشتی کی تحقیقات چشتی (ص ۶۶۳ تا ۶۷۷) میں محفوظ ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وزیر خان ان تمام مکانوں اور دکانوں کا مالک تھا جو مسجد سے لے کر دھلی دروازے تک بازار کے دونوں طرف چلی گئی ہیں - اس تمام جائداد کی آمدنی مسجد کے لیے وقف کی گئی تھی، لیکن رفتہ رفتہ مسجد کے نیچے کی دکانوں کے سوا باقی تمام جائداد پر ناجائز تصرف کے ذریعے لوگوں نے قبضہ کر لیا.

مسجد کی تولیت کے نزاع سے متعلق ایک طویل مقدمہ انگریزوں کے عہد میں چلتا رہا، لیکن بالآخر ۲ مئی ۱۹۵۱ء کو لاهور هائی کورٹ نے یہ تولیت مرزا افتخار علی کے سپرد کر دی - اب یہ مسجد محکمۂ اوقاف کے زیر انتظام ہے - ۱۹۵۳ء کے مارشل لاء کے زمانے میں اس مسجد کی جائداد پر بنی ہوئی بھدی اور بدنما عمارات کو گرا دیا گیا، لیکن آهسته آهسته پھر لوگوں نے اس زمین پر قبضہ کر کے مسجد کے صدر دروازے کو بدنما کر دیا.

سنہری مسجد: لاهور کے پر رونق ڈبی بازار اور کشمیری بازار کے تقریباً وسط میں ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء میں نواب بھکاری خان نے تعمیر کی تھی - نواب موصوف لاهور کے وائسرائے میر منو کا ایک درباری تھا - مسجد کی ساری عمارت پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوئی ہے - اس کے تین بڑے گنبد اور برجیاں مطلا ہیں - تانبے کے تختوں پر سونا ایسی صنعت سے چڑھایا گیا ہے کہ آج دو سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنی اصلی تابناک حالت میں موجود ہے - سکھوں کے عہد میں اس مسجد پر کچھ عرصے کے لیے سکھوں نے قبضہ کر لیا تھا مگر پھر مسجد مسلمانوں کو واگذار کر دی گئی، البتہ اس سے ملحقہ دکانوں کو واپس نہ کیا گیا - ۱۸۸۱ء میں لاهور کے ڈپٹی کمشنر کی سفارش پر پنجاب کے گورنر سر رابرٹ آئلز ایجرٹن نے دکانیں بھی مسلمانوں کو واگزار کرا دیں - اس وقت (۱۹۷۸ء میں) مسجد کا انتظام محکمۂ اوقاف کے پاس ہے.

مسجد دایہ انگہ : یہ چھوٹی سی خوبصورت مسجد اپنی کاشی کاری کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتی ہے - اسے شاهجہان کے عہد میں دایہ انگہ نے ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں تعمیر کرایا تھا - دایہ انگہ کا اصل نام زیب النساء تھا اور یہ ایک مغل مراد خان کی اهلیہ تھی - اس نے شاهجہان کو دودھ پلایا تھا - اس عالی شان مسجد کے گنبد بلب کی شکل کے ہیں اور اس کی دیواروں کے اندر کی طرف زرد رنگ میں قرآن مجید کی آیات سے کاشی کاری کی گئی ہے - یہ ایسی خوبصورت کاشی کاری ہے کہ اس کے نمونے دنیا میں کمیاب ہیں - مغلیہ دور میں یہ مسجد بہت پر رونق اور آباد تھی - بانیہ نے اس کے اخراجات کے لیے بہت سی جائداد وقف کی تھی، لیکن سکھوں کے عہد میں جب یہ شہر لٹا اور شہر سے باهر کی آبادی کاملاً ویران ہو گئی تو رنجیت سنگھ نے لاهور پر قبضہ کرنے کے بعد اسے فوجی بارود خانہ بنا لیا اور انگریزوں کے استیلا کے بعد انگریزی اخبار

لاهور کرانیکل کے مدیر هنری کوپ نے اسے نجی سکونت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا، جس سے اس کی عمدہ کاشی کاری کو بہت نقصان پہنچا اور جگہ جگہ سے یہ نقاشی مٹ گئی ۔ جب انگریزوں نے لاهور تک ریلوے لائن بنائی تو هنری کوپ نے سابقہ پنجاب اینڈ دہلی ریلوے کمپنی کے پاس یہ مسجد بارہ هزار روپئے میں فروخت کر دی ۔ ریلوے کی یہ ملکیت جب انگریزی سرکار کو منتقل هوئی تو اس میں بہت سا اضافہ کر کے اسے پنجاب ناردن سٹیٹ ریلوے کے ٹریفک مینیجر کا دفتر بنا دیا گیا ۔

۱۹۰۳ء میں یہ مسجد کی حیثیت سے واگزار هوئی ۔ *Archeological Survey of India* کی سالانہ رپورٹ میں اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل جان مارشل نے یہ عبرتناک واقعہ لکھا ''آثار لاهور میں سے قلعوں کے علاوہ ایک اور عمارت دایہ انگہ کی مسجد ہے جو اس زمانے کی غارتگری کا شکار هوئی اور جسے سابقہ حالت میں بحال کرنے کے لیے تعمیر جاری ہے ۔ مسجد کو کوئی اور صورت دینے کے لیے کچھ اضافے غالباً سکھوں کے عہد میں هوے، لیکن اس کی اصل بربادی کی تاریخ اس وقت شروع هوتی ہے، جب اسے ریلوے کا دفتر بنا دیا گیا اور اس وقت سب سے زیادہ نقصان اس کی کاشی کاری کو پہنچا *Archeological Survey of India Annual Report*، ۱۹۰۳ء، ص ۵، ۶).

مسجد کا ایک کتبہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ کاشی کاری کی تحریروں کو ابراهیم نے ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں بخط نسخ تحریر کیا تھا ۔ یہ مسجد لاهور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر (۱) کی دیوار سے متصل باهر کی جانب ہے ۔ پہلے اس کے چار مینار تین تین منزلہ تھے، اب اگلے دو مینار باقی رہ گئے هیں، پچھلے گر چکے هیں ۔ ایک ایک منزل موجودہ میناروں کی بھی گر چکی ہے ۔ اس وقت یہ مسجد آباد ہے ۔ لاهور میں مغلیہ دور کی اور بھی متعدد مساجد هیں، لیکن تاریخی، فنی اور تزئینی نقطۂ نظر سے صرف انهیں مساجد کا ذکر کافی هوگا جو اوپر درج کیا جا چکا ہے ۔

قلعۂ شاهی لاهور: پاکستان میں موجود مغلیہ دور کے آثار میں سے دنیاوی اعتبار سے سب سے عظیم یادگار لاهور کا شاهی قلعہ ہے جو قدیم لاهور کی سابقہ فصیل کے شمال مغرب میں واقع ہے ۔ قلعۂ لاهور کی تعمیر کی بنیاد کب رکھی گئی، اس کے متعلق تاریخ خاموش ہے، لیکن لاهور پر محمد بن سام کے تین حملوں ۵۷۶ھ/ ۱۱۸۰ء؛ ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء اور ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء کے وقت لاهور میں ایک قلعے کی موجودگی کا ذکر تواریخ میں موجود ہے (تاریخ فرشتہ، ج ۱، ۵۶) ۔ ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں مغول اسے تباہ کرتے هوے بھی بتائے جاتے هیں (منہاج سراج، ۵۰) اور پھر بلبن ۶۶۶ھ/ ۱۲۶۷ء میں اسے تعمیر کرتا هوا بتایا گیا ہے (تاریخ فرشتہ، ج ۱، ۷۷) ۔ اسی طرح تیمور کی فوج ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۸ء میں اسے برباد کرتی ہے اور سلطان مبارک شاہ ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء کے آغاز میں پھر اسے مٹی سے تیار کراتا ہے ۔ تقریباً پانچ مہینے بعد شیخا گکھڑ اس قلعۂ گلی پر حملہ کر کے اسے خراب کرتا ہے ۔ ۸۳۶ھ/ ۱۴۳۲ء میں اسے شیخ علی فتح کر کے اس کی مرمت کراتا ہے ۔ همایوں کے عہد میں جب مرزا کامران پہلے هی سال لاهور آتا ہے تو تواریخ میں قلعۂ لاهور کے دروازوں کا ذکر ملتا ہے ۔ همایوں کا جانشین اکبر قلعۂ گلی کو مسمار کر کے خشتی عمارت تعمیر کرتا ہے ۔ ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء میں مرزا محمد حکیم کی بغاوت کے وقت لاهور کے ایک قلعے کا ذکر کتب تواریخ میں آیا ہے (طبقات

اکبری، ۳۷۶) ۔ آئین اکبری (۳۴۸) میں ایک قلعے کا ذکر موجود ہے، لیکن اس کی تاریخ تعمیر درج نہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر نے جو خشتی قلعہ تیار کیا تھا، وہ بہر صورت اکبر کے بارھویں سنہ جلوس یعنی ۱۵۶۸ء سے قبل مکمل ہو چکا تھا۔

قلعۂ لاہور چار ادوار میں تعمیر ہوا ہے: پہلا دور اکبر کا ہے ۔ قلعۂ لاہور کی تعمیر کے متعلق تفاصیل دستیاب نہیں ہوتیں ۔ صرف بداؤنی (منتخب التواریخ، ج ۲، ۶۵) کے ایک بیان سے ضمنی طور پر پتا چلتا ہے کہ اس میں ایک دیوان عام بھی تھا ۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بداؤنی نے دیوانِ عام کے صحن کے جو متعدد ایوان گنوائے ہیں، وہ سکھوں کے عہد کے نقشے میں موجود ہیں ۔ یہ نقشہ پہلے رنجیت سنگھ کے وزیر سید نور الدین کے بیٹے فقیر سید قمر الدین کی ملکیت تھا اور پھر *Journal of India Art* (۱۸۹۶ء) میں شائع کر دیا گیا تھا ۔ اکبر نے ۲۲ ربیع الآخر ۹۹۶ھ / ۲۱ مارچ ۱۵۸۸ء کو اس دیوان عام میں جشن نو روز منایا تھا (بداؤنی، ۲، ص ۳۶۵)۔

اس کے بعد ۱۵۹۷ء میں جب اکبر کشمیر سے واپسی پر لاہور پہنچا، تو اس وقت آگ لگنے سے دیوان عام کو نقصان پہنچ چکا تھا ۔ اکبر نے اقامت لاہور کے دوران میں اس کی مرمت کرائی۔

قلعۂ لاہور کی تعمیر کے دوسرے دور کی نشان دہی اس عبارت سے ہوتی ہے جو دیوان عام کے مغرب کی جانب ایک محراب پر محفوظ ہے اور جس میں درج ہے کہ نور الدین جہانگیر نے ۱۲ سن جلوس ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۷-۱۶۱۸ء میں اپنے کارمند خاص معمور خان کی نگرانی میں یہ محل تعمیر کرایا تھا ۔ جہانگیر توزک جہانگیری میں، اس امر پر بڑی مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ ۳۰ محرم ۱۰۲۹ھ / ۶ جنوری ۱۶۲۰ء کو میرا بیٹا شاہجہان دریاے بیاس کے کنارے پر نصب شاہی خیموں سے دس دن کی رخصت لے کر اس شاہی محل کو دیکھنے گیا ہے جو تقریباً مکمل ہو چکا ہے (توزک جہانگیری، ص ۲۸۴) ۔ جہانگیر خود بھی ۱۰۳۰ھ کے آغاز میں قلعے کو دیکھنے آیا ۔ وہ عمارات کی تکمیل کی بڑی خوش آئند تصویر کھینچتا ہے ۔ ''نہم آذر ماہ، مطابق پنجم محرم، سنہ ۱۰۳۰ھ / ۳۰ نومبر ۱۶۲۰ء کو میں باغ سومن (لب راوی) سے ''اندر'' نامی ہاتھی پر سوار ہو کر اور خیرات نثار کرتا ہوا متوجہِ شہر ہوا ۔ دن کے تین پہر اور دو گھڑی گزرنے کے بعد میں ایک مبارک ساعت میں دولت خانے میں داخل ہوا اور معمور خان کے اہتمام سے جو عمارات تعمیر ہوئی تھیں، ان میں قیام کیا ۔ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ عمارت بڑی دلکشا اور حسن و لطافت کے اعتبار سے بڑی روح افزا ہے اور نادر کار استادوں کی تزئین سے آراستہ ہے ۔ سبز باغ انواع و اقسام کے گل و ریاحین سے نظر کو لبھاتے ہیں۔ مختصراً اس عمارت پر سات لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔

قلعے کی عمارات کا تیسرا دور شاہجہان کا ہے ۔ اس کے ایک حصے کی تاریخ تعمیر ہاتھی پول یا ہاتھی دروازے کے باہر ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۱-۱۶۳۲ء کندہ ہے۔

گو اکبر اور جہانگیر کی بنائی ہوئی قلعے کی عمارات کی تفاصیل دستیاب نہیں ہوئیں، لیکن شاہجہان کے عہد میں بنی ہوئی عمارات کی تفاصیل معاصر تواریخ میں محفوظ ہیں، مثلاً اس نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال یہ حکم دیا تھا کہ آگرے اور لاہور کے قلعوں میں چالیس چالیس ستونوں کے تالار تعمیر کیے جائیں ۔ ملا عبدالحمید لاہوری اس کا ذکر کرتا ہے (بادشاہ نامہ، ج ۱، ۲۲۱، ۲۲۳)

اور لاهور کے قلعے کی عمارات کی تفصیل بھی دیتا ہے کہ بادشاہ نے شاہ برج (جواب عام طور پر مسمن برج کے نام سے معروف ہے) کی تعمیر کا حکم دیا تھا اور ایوان، خوابگاہ، غسلخانہ، اور تفریح گاہ بنوائی گئی تھی ۔ ایک اور معاصر مؤرخ محمد صالح کنبوہ بھی عمارات کی تفاصیل بیان کرتا ہے ۔

قلعے کی عمارات کا چوتھا دور عالمگیری دور ہے ۔ اس میں مغربی دروازہ یعنی عالمگیری دروازے کی تعمیر ہوئی اور وہ دیواریں چنی گئیں جو اس سے ملحق ہیں ۔ اس دروازے سے مسجد تک براہِ راست پہنچنے کا راستہ بھی بنایا گیا ۔ شہر کے شمالی حصے میں قلعے کا پھیلاؤ تقریباً پانچ سو فٹ ہے ۔ سامنے کے اس حصے پر کاشی کاری کے ذریعے عمدہ تصاویر بنائی گئی ہیں، جو آہستہ آہستہ مدھم ہو کر خراب ہو رہی ہیں ۔ ان تصاویر میں انسانوں، گھوڑوں، ہاتھیوں اور دیگر حیوانات کی تصاویر کے علاوہ فرشتوں وغیرہ کی شکلیں بھی بنائی گئی ہیں ۔ قلعے کی شکل تقریباً مستطیل ہے، جس کا طول ساڑھے بارہ سو اور عرض گیارہ سو فٹ ہے ۔ قلعے میں داخل ہونے کے اصلی دروازے مغربی اور مشرقی دیواروں کے عین وسط میں ہیں ۔ اس وقت داخلے کے لیے جو پکی سڑک قلعے میں بنی ہوئی ہے، یہ انگریزوں نے تعمیر کرائی تھی ۔ قلعے کے سامنے کی جانب بلند اور وسیع چبوترہ عرض گاہ کا کام دیتا تھا، جہاں پر صبح بادشاہ کے احکام وصول کرنے کے لیے امرائے دربار جمع ہوتے تھے ۔ یہ عرض گاہ ابھی تک اچھی حالت میں محفوظ ہے ۔ مسجد کے روبرو عالمگیری دروازے کو انگریزوں نے اپنے عہد میں پکی اینٹوں سے بند کروا دیا تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد لوگوں کے پیہم اصرار پر ۱۸ نومبر ۱۹۴۹ء کو یہ دروازہ کھول دیا گیا اور لاهور کے تین لاکھ نفوس نے ''پاکستان زندہباد'' کے پرجوش نعروں سے اس پر اظہار مسرت کیا ۔

قلعۂ شاهی کے اکبری دروازے سے آگے بڑھ کر ایک پیچدار راستے سے ہم دیوان عام کے احاطے میں پہنچتے ہیں، جو ۳۰۷ فٹ طویل اور ۶۰۴ فٹ عریض ہے ۔ اس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے جن میں داخلے کے دروازے مغرب، جنوب اور مشرق میں تھے، اب ان کمروں کا کوئی نشان باقی نہیں ۔ صرف موتی مسجد کے سامنے ایک صحن رہ گیا ہے ۔ ستونوں پر مشتمل کھلا ہوا دیوان عام بڑے احاطے میں اپنی جگہ پر قائم ہے ۔ جس وسیع چبوترے پر دیوان عام بنا ہوا ہے، اس کے اردگرد سنگ سرخ کا جنگلا لگا ہوا تھا ۔ اس کا صرف نچلا حصہ باقی تھا، لیکن حال ہی میں اس کی تعمیر دوبارہ کی گئی ہے ۔ چبوترے کے وسط میں تخنگاہ تھی، جہاں بیٹھ کر بادشاہ دربار کیا کرتا تھا ۔ اس چبوترے کے عین سامنے وسط میں نقارخانہ تھا، جہاں بادشاہ کے تخت نشین ہوتے ہی سازندے فوجی دھنیں بجایا کرتے تھے ۔ برنیئر کی بیان کی ہوئی تفصیل کے مطابق چبوترے پر بادشاہ کے سامنے سے انسانوں، گھوڑوں، اور ہاتھیوں کا جگمگاتا ہوا جلوس گذرتا تھا ۔ راقم نے برٹش میوزیم سے ایک نامکمل رنگین تصویر حاصل کر کے اپنی کتاب لاهور ۔ ماضی و حال (*Lahore-Past and Present*) میں شائع کی ہے (مقابل صفحہ ۳۷۲) جس سے پتا چلتا ہے کہ آج کل کے اس اجڑے ایوان میں ان دنوں کس شان و شکوہ سے شاهانہ مجالس ترتیب دی جاتی تھیں ۔ اس تصویر میں جھروکے کے قریب جہانگیر اپنے بیٹے شاهجہان کا استقبال کر رہا ہے ۔ امرا اور وزرا نیچے چبوترے میں رسمی درباری ملبوسات میں جمع ہیں، اور شہزادے کو حضور شاہ میں لانے والا سامان تزئین سے لدا ہوا ہاتھی مہاوت سمیت بیٹھا ہوا ہے ۔ سامنے شاهی رسم کے مطابق

بادشاہ کو پیش کی جانے والی نذر متعدد خدام بشقابوں میں اٹھائے ہوے حاضر ہیں۔ غالباً برنیئر نے اس قسم کا کوئی منظر دیکھا تھا، جس کا ذکر وہ اپنے سیاحت نامے میں کرتا ہے۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں دیوان عام کا نام ہی تخت رکھ دیا گیا تھا، لیکن یہ سکھ حکمراں خود شاہی تخت پر کسی وجہ سے کبھی براجمان نہ ہوا (پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی، ج ۱، شمارہ ۱، ص ۳۶)۔

رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد اس کی ارتھی جلائے جانے سے پہلے کچھ وقت کے لیے اسی ایوان میں پڑی رہی۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد اس ایوان کو انگریزوں کی سکونت کے لیے بیرکوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایوان کی تمام محرابوں کو اینٹوں سے پر کر کے اسے ایک وسیع ہال میں تبدیل کر لیا گیا اور پھر اس کے اندر لکڑی کے تختے لگا کر کمرے بنا لیے گئے۔ تقریباً بہتّر سال پہلے یہ سب چیزیں ہٹا کر پھر ایوان کو کشادہ کر دیا گیا۔

جہانگیر کے احاطے کے شاہی محل میں اور چبوترے پر ایک تاریخی تعمیر ''جھروکہ'' کے نام سے موجود ہے، جو سنگ سرخ کے چار ستونوں پر قائم ہے۔ یہ سنگ مرمر کی شہ نشین ہے۔ دیوان عام کی پشت پر اس عہد سے پہلے کے بنے ہوے بارہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جن میں سے اکثر شکستہ حالت میں ہیں۔ ان سے ملحق جھروکہ ہے، جو چبوترے پر کھلتا ہے اور اس سے چبوترے تک آنے کے لیے زینہ بھی بنا ہوا ہے۔ چبوترے کی پشت پر کمروں سے باہر نکل کر دیکھیں تو سامنے عمارات پر مشتمل ایک احاطہ نظر آتا ہے، جسے سکھوں کے عہد میں ''اکبری محل'' کہا جاتا تھا، لیکن عام طور پر یہ ''احاطۂ جہانگیر'' کے نام سے معروف ہے۔ بہر صورت یہ مغلیہ دور کی ابتدائی عمارات میں سے ہے۔ اس احاطے میں کمروں سے ملحق میدان کو قیام پاکستان کے بعد کھودا گیا تو یہاں سے عظیم الشان عمارات کی بنیادیں دستیاب ہوئیں۔ قیاس غالب ہے کہ دراصل یہی اکبری محل تھا جس کے کھنڈر تک باقی نہیں رہے۔ بہر صورت ان بنیادوں کو اب محکمۂ آثار قدیمۂ پاکستان نے بڑی کوشش سے محفوظ کر لیا ہے۔

مقبرۂ جہانگیر کے احاطے میں ایک بہت بڑی عمارت ''بڑی خوابگاہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ عمارت غالباً سکھوں کے عہد کی ہے اور اس میں مغلیہ دور کی کوئی رعنائی یا شکوہ نہیں۔ اسے آج کل میوزیم اور نمائش گاہ اسلحہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

احاطۂ جہانگیر سے متصل ایک وسیع صحن ہے جسے مغلیہ دور کے باغ کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس کے عین وسط میں سنگِ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جس میں ایک فوّارہ بھی لگا ہوا ہے۔ اس باغ کے شمال میں ایک کشادہ دالان ہے۔ جسے ''چھوٹی خوابگاہ'' کہا جاتا ہے۔ اسے غالباً شاہجہان نے ۱۶۳۳ء میں بنوایا تھا۔ یہ ایک نفیس اور خوبصورت کشادہ دالان ہے جو سر تا سر سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور ڈاٹوں والے ستونوں کی پانچ قطاروں پر قائم ہے۔ شمال کی جانب کی ڈاٹیں سوراخ دار پردے سے بند کر دی گئی ہیں۔ دالان کا فرش سنگِ مرمر کا ہے اور اس کے عین وسط میں ایک فوارہ ہے جس کے پیندے میں قیمتی پتھر جڑے ہوے تھے، جنھیں تباہ کاروں نے وہاں سے نکال لیا ہے۔

انگریزوں کے تسلط کے بعد اس عمارت کو فوجی گرجے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ کھلی ہوئی ڈاٹوں پر پردے ڈال دیے گئے تھے اور سوراخ دار جالی کے پردے اور فوارے کو مسالے سے پُر کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں آثارِ قدیمہ کے

کیوریٹر میجر اے۔ ایچ ۔ ایچ ۔ کول نے حکومت سے سفارش کی کہ چھوٹی خوابگاہ میں سے گرجے کا سامان اتار لیا جائے، لیکن بیس سال بعد لارڈ کرزن کے حکم سے اس عمارت کو اصلی شکل پر بحال کر دیا گیا.

مثمن برج قلعے کے شمال مغربی کونے میں محل کا وہ حصہ ہے جو مثمن کے نام سے معروف ہے۔ یہ نام سکھوں کے عہد میں رکھا گیا تھا، ورنہ اس کا تاریخی نام شاہ برج ہے ۔ ہاتھی پول یعنی اس تک براہِراست پہنچنے کے دروازے پر بھی اس کا نام شاہ برج ہی درج ہے ۔ اور اس سے آگے ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس تک پہنچنے کی وسیع اور فراخ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، جو حفاظتی تدابیر کے پیشِ نظر پیچدار ہیں ۔ دراصل شاہی محل تک رسائی کا یہ محفوظ راستہ ہے.

معاصر درباری مؤرخوں نے شاہ برج کی عمارات میں ایک وسیع تالار کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہال اب ''شیش محل'' کے نام سے معروف ہے۔ یہی وہ جگہ ہے، جہاں ۲۶ دسمبر ۱۸۴۶ء کو سرہنری ہارڈنگ نے سکھوں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کیے تھے ۔ اور پھر یہیں مارچ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب پر اپنے تسلط کا اعلان کیا تھا ۔ اس تاریخی واقعے کی یادگار کے طور پر ایک کتبہ شیش محل کی دیوار میں نصب کیا گیا تھا، جو چند سال سے اتار دیا گیا ہے۔ شیش محل کا نام معاصر تاریخوں میں موجود نہیں ۔ گو عبدالحمید لاہوری اس کے لیے ''ایوان'' کا لفظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی ذکر کرتا ہے کہ اس کی تزئین کے لیے ''مرایای حلبی'' (حلب کے شیشے) (استعمال کیے گئے ہیں (بادشاہ نامہ، ج ۲، ۵۱۴).

شیش محل کے وسطی تالار کے ساتھ ساتھ نو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، ان میں سب سے بڑے کمرے کی عقبی دیوار کے وسط میں سنگ مرمر کی بے حد خوبصورت جالی بنی ہوئی ہے۔ شیش محل کی چھت پر سکھوں نے ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کر دی تھی ۔ اس میں شیر سنگھ نے کچھ اضافہ کیا ۔ اس طرح شیش محل کی دیوار کے باہر ایک چھوٹا سا دالان بھی سکھوں نے بنایا ، جس میں رنجیت سنگھ کبھی کبھی اپنے امرا سے ملا کرتا تھا ۔ رنجیت سنگھ کے زمانے کی تصاویر کا جو مجموعہ حکومت پاکستان نے چند سال پہلے خریدا تھا اور جن کی نمائش مائی جندان کی حویلی میں لگا دی گئی ہے، اس میں ایک تصویر میں رنجیت سنگھ کے شکار کا منظر پیش کیا گیا ہے.

نولکھا : شیش محل کے مغرب میں ایک خوبصورت عمارت نولکھا کے نام سے معروف ہے ، جو سر تا سر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور جس میں تزئین کے لیے قیمتی پتھر نہایت نفاست اور باریکی سے جڑے ہوے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر نفیس اور باریک کام یہاں پتھر میں ہوا ہے، شاید کاغذ پر بھی اس نفاست سے بیل بوٹے بنانا ممکن نہ ہو ۔ روایۃً اس پر نو لاکھ روپئے خرچ آئے تھے، جس کی وجہ سے اس کا نام نولکھا پڑ گیا، لیکن تواریخ میں کسی ایسے نام کا ذکر موجود نہیں.

باغات : تیموری دور کے معروف باغات میں سے اس وقت بھی دو بڑے باغ لاہور میں موجود ہیں ۔ ان میں سے پہلا مقبرۂ جہانگیر کا باغ ہے، جسے جہانگیر اپنی توزک میں باغ دلآمیز کے نام سے یاد کرتا ہے (توزک جہانگیری، ص ۴۳) ۔ عام طور پر معروف ہے کہ اس باغ کی بنیاد جہانگیر کی ملکہ نور جہاں نے رکھی تھی، لیکن تاریخی شہادت موجود نہیں، البتہ جہانگیر دو دفعہ اپنی توزک میں اس باغ میں اپنی آمد و رفت کا ذکر کرتا ہے (توزک جہانگیری، ص ۶۲) ۔ یہ ایک وسیع مربع

باغ ہے جو پندرہ سو فٹ مربع کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے، اس کے گردا گرد پختہ اینٹوں کی دیوار ہے۔ مغربی دیوار کے وسط میں ایک خوبصورت دروازہ بنا ہوا ہے جس سے ہو کر باغ میں پہنچتے ہیں۔ اس دروازے کے اندر دونوں جانب حجرے بنے ہوے ہیں، جنھیں اس صدی کے شروع میں انگریز ڈاک بنگلے یا مہمان خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بعد میں جب اس باغ کے قریب پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلوے کی پٹری گذاری گئی تو ان حجروں کو ورکشاپ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور دروازے سے ملحق کمرے انگریز افسروں کے سکونتی مکان کے طور پر استعمال ہوے۔ شاھدرے کے قصبے کے قریب اس باغ میں جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ دریاے راوی نے باغ کی جنوبی دیوار کو سیلاب سے بہت نقصان پہنچایا ہے اور یہ دیوار تقریباً گر چکی ہے۔

شالا مار باغ : [رک بآں] تیموری عہد کے بہت سے باغات صرف اس وجہ سے وجود میں آئے کہ امور و مہمات سلطنت سر انجام دینے کے لیے یہ لوگ ملک بھر میں گردش کرتے رہتے تھے اور دوران سفر میں بڑے شہر کے قریب انھیں اپنی اقامت کے لیے خیمے لگانے پڑتے تھے، باغات انھیں خیموں کا بدل تھے، جو شاھی لشکر کو قناتوں اور خرگاھوں سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ عبدالحمید لاھوری نے شالامار باغ کی تعمیر کی یہی وجہ بتائی ہے (بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۱۰)۔

شالا مار باغ امرتسر سے لاھور آنے والی سڑک پر مغل پورہ کے قریب واقع ہے۔ باغ کے بانی شاھجہان کے معاصر مؤرخ اس کے دو تختوں کے نام ''فرح بخش'' اور ''فیض بخش'' بیان کرتے ہیں (محمد صالح کنبوہ : عمل صالح، ج ۲، ۳۷۶ اور بادشاہ نامہ، ج ۲، ۳۱۳)۔ راقم کی تحقیق کے مطابق شالا مار باغ نام سب سے پہلے اورنگ زیب کے معاصر مؤرخ سجان رائے کے ھاں ملتا ہے (خلاصۃ التواریخ، ص ۶۶)۔ لیکن یہ نام کب اور کیوں رکھا گیا، اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اس طرح باغ کی تاریخ بنیاد بھی مختلف اصحاب نے مختلف لکھی ہے، لیکن معاصر تاریخ اس کی شاھد ہے کہ شاھجہان نے اس باغ کا افتتاح ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ کو کیا تھا اور روز بنیاد سے اس تاریخ تک ایک سال، پانچ مہینے اور چار دن گزر چکے تھے (بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۱۱)۔ معاصر مؤرخ محمد صالح کنبوہ نے بھی اس کی تائید کی ہے (عمل صالح، ج ۲، ص ۳۷۳)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شاھجہان پہلی مرتبہ سات شعبان ۱۰۵۲ھ یا ۳۱ اکتوبر ۱۶۴۲ء کو اس باغ میں آیا تھا اور قمری سال کے اعتبار سے اس باغ کی بنیاد ۳ ربیع الاول ۱۰۵۱ھ (۱۲ جون ۱۶۴۱ء) کو رکھی گئی تھی۔ اس باغ کو سیراب کرنے کے لیے مادھو پور سے دو لاکھ روپے کے صرف سے نہر لائی گئی تھی۔ یہ نہر آب رسانی کے انجینئر علی مردان اور ملا علاءالملک کا متحدہ کارنامہ تھا۔ اس کا نام ''شاہ نہر'' تھا اور شاھجہان کے سولھویں سال جلوس ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس وقت اس نہر میں صحیح طور پر پانی نہیں آتا۔ اب باغ کو ٹیوب ویل سے پانی ملتا ہے۔

معاصر کتب تواریخ میں باغ کی جو تفاصیل موجود ہیں، ان سے آج پونے چار سو سال گزرنے کے بعد بھی بہت کم فرق آیا ہے۔ سب سے اوپر کا تختہ جس کا تاریخی نام ''فرح بخش'' ہے، ۳۳۰ گز مربع ہے اور باغ کے علاوہ اس میں آٹھ عمارات ہیں۔ زیریں تختہ ''فیض بخش'' کے نام سے موسوم ہے۔ اور یہ بھی رقبے میں فرح بخش کے مساوی ہے۔ باغ کے اصلی اور قدیم دو دروازے مشرقی اور مغربی

دیواروں میں تھے، لیکن جب لاهور کو ایک شاهراہ کے ذریعے امرتسر سے ملایا گیا تو لاهور کے ڈپٹی کمشنر میجر میکریگر نے اوپر کے تختے میں ایوان شاهی کے عین وسط میں ایک دروازہ بنوا دیا۔ اینٹوں کی ایک دو منزلہ عمارت اوپر کے تختے میں مشرق کی جانب کنویں کے قریب رنجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ اس عمارت کے اوپر ابھی تک سنگ مرمر کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر یہ لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ کی تعمیر کردہ اس عمارت میں مشہور سیاح ولیم موئر کرافٹ مئی ۱۸۲۰ء میں ترکستان جاتے ہوے ٹھیرا تھا، جہاں وہ ۱۸۲۵ء میں فوت ہو گیا۔

مزار سلطان قطب الدین ایبک: ملک قطب الدین ایبک لاهور میں ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا اور ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تک سریر آراے سلطنت رہا۔ وہ لاهور میں چوگان کھیلتے ہوے گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا۔ اس کے مزار کا صرف چبوترہ باقی رہ گیا تھا۔ اب محکمہ آثار قدیمہ نے یہاں ایک خوبصورت مزار تعمیر کیا ہے۔

جہانگیر کا مقبرہ: راوی کے دائیں کنارے اور لاهور سے کچھ آگے شاهدرہ میں باغ دلآمیز کے وسط میں جہانگیر کے مقبرے کی خوبصورت اور عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے۔ چار دیواری میں محصور باغ کی زمین کا رقبہ ایک سو بیگھ ہے، لیکن عمارت تیس بیگھ زمین میں بنی ہوئی ہے۔ باغ کے اندر پختہ روشیں اور سڑکیں موجود ہیں، اور باغ فوّاروں اور بارہ دریوں سے آراستہ ہے۔ پختہ حار دیواری میں مغرب کی جانب داخل ہونے کا بہت بڑا دروازہ ہے جو پچاس فٹ بلند اور دو منزلہ ہے۔ باغ کے عین وسط میں جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ پچیس سیڑھیوں کے ایک زینے سے ہم ایک چبوترے پر پہنچتے ہیں، جس کے چاروں کونوں پر چار منزلہ اونچے خوبصورت مینار بنے ہوے ہیں۔ یہ مینار نہایت خوبصورت طرز سے مزین ہیں۔

مقبرے کے اندر سفید سنگ مرمر کا حسین تعویذ ہے، جس پر بڑے خوبصورت انداز میں پتھروں کو کندہ کر کے گلکاری کی گئی ہے۔ تعویذ کی دو اطراف پر اللہ تعالٰی کے ۹۹ اسماء الحسنٰی درج ہیں۔ سر کی طرف یہ تحریر ہے: ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب و الشہادہ ھو الرحمن الرحیم اور پائنتی کی طرف یہ عبارت درج ہے: مرقد منور اعلی حضرت غفران پناہ نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ فی سنۃ ۱۰۳۷ء۔

جہانگیر ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ/۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو راجوری میں فوت ہوا۔ وہاں سے اس کا جسد خاکی یہاں لا کر دفن کیا گیا۔ پھر اس کے بیٹے شاهجہان نے دس سال کی مدت میں دس لاکھ روپیہ صرف کر کے یہ مقبرہ تعمیر کرایا (محمد صالح کنبوہ: عمل صالح، ج ۱، ص ۱۳)۔

مقبرے کی چھت کے عین وسط میں روشنی اور ہوا کے لیے کھلی جگہ رکھی گئی تھی۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی رپورٹ (۱۹۰۶ - ۱۹۰۷ء) سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کے روشندان کو ۱۹۰۶ء میں بند کرا دیا گیا تھا۔ اس عمل سے مقبرے کا اندرونی حصہ تاریک ہو گیا ہے اور تعویذ کی شان بھی گہنا گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس چھت کو کھول کر اصلی حالت میں تعمیر کیا جائے۔

مقبرۂ آصف خان: آصف خان یا آصف جاہ شاهجہان کی ملکہ ارجمند بانو بیگم (جو تاج محل آگرہ میں دفن ہے) کا باپ تھا جو ۱۶۴۱ء میں بے شمار دولت چھوڑ کر فوت ہوا اور اس کا مقبرہ شاهجہان کے عہد میں اس باغ دلآمیز کے اندر تعمیر ہوا۔ سکھوں کے عہد میں اس کی زینت اور آرائش کے بہت سے حصے اتار لیے گئے اور اب یہ خوبصورت عمارت بالکل ویران پڑی ہے۔

مقبرۂ نورجہاں: مقبرۂ جہانگیر سے کچھ دور ریلوے لائن کے پار جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کا مزار ہے۔ جہانگیر سے دس سال بعد ۱۶۳۸ء میں وہ فوت ہوئی اور اس عمارت میں دفن ہوئی جو اس نے خود تعمیر کرائی تھی۔ اس کا سنگِ مرمر کا تعویذ اسی حجم کا تھا، جیسا جہانگیر کے مقبرے کا ہے۔ یہ تعویذ نہایت عمدہ کاریگری کا نمونہ تھا، لیکن اسے وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس مقبرے کی محرابدار دیواروں پر بھی سنگِ مرمر لگا ہوا تھا۔ جس پر گلکاری کی گئی تھی، لیکن رنجیت سنگھ نے جب لاہور کے مقابر کو تاراج کر کے ان سے قیمتی پتھر اکھاڑنا شروع کیا تو یہ مقبرہ بھی اس کی زد میں آیا۔

انارکلی کا مقبرہ: روایت یہ کہتی ہے کہ نادرہ بیگم یا شرف النساء کا نام انارکلی تھا اور یہ خاتون اکبر کے حرم میں داخل تھی۔ ایک دن آئینے میں اس نے دیکھا کہ انارکلی شہزادہ سلیم کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اس سے برافروختہ ہو کر اکبر نے انارکلی کو زندہ دفن کرا دیا۔ سلیم اس واقعے سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد اس مدفن پر ایک بہت شاندار عمارت تیار کرا دی جو مقبرۂ انارکلی کے نام سے معروف ہوئی۔

یہ روایت مختلف اشخاص نے مختلف تفاصیل کے ساتھ بیان کی ہے، لیکن تاریخی طور پر اس کا کوئی حوالہ یا سند دستیاب نہیں۔ یہ شش پہلو عمارت اس وقت پنجاب سول سکرٹریٹ کے احاطے میں ہے، قبر کا تعویذ جو اب اپنی اصلی جگہ سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا ہے، دو تاریخوں کا حامل ہے۔ (سنہ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء) اور (۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء)۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم مقالہ کی کتاب مذکور)۔

محلات اور دیگر قابلِ ذکر عمارات:

مرزا کامران کی بارہ دری: بابر کے بیٹے اور ہمایوں کے بھائی مرزا کامران نے یہ خوبصورت عمارت راوی کے دائیں کنارے پر تعمیر کی تھی۔ اس کے ارد گرد نہایت خوبصورت باغ تھا۔ راوی اس وقت یہاں سے دو میل کے فاصلے پر بہتا تھا لیکن اب راوی نے اس عمارت کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور یہ آہستہ آہستہ منہدم ہو رہی ہے۔

چوبرجی: یہ ایک باغ کا دروازہ ہے جو ملتان روڈ پر [جہاں قبرستان میانی صاحب والی سڑک ملتی ہے] بنا ہوا ہے۔ اس کی بیرونی دیواریں نیلی اور سبز کاشی کاری کا مرقع ہیں۔ ایک روایت ہے کہ باغ نواں کوٹ سے لے کر شہر لاہور کے مغرب تک پھیلا ہوا تھا، لیکن اب اس کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ عمارت پر اس کی تاریخ تعمیر ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء درج ہے۔ محراب پر فارسی میں یہ شعر درج ہے:

بگشت مرحمت این باغ بر میا بائی
زلطف صاحب زیبندہ بیگم دوران

مقبرۂ شرف النساء بیگم: بیگم پورہ کے قریب شرف النساء بیگم کا یہ مقبرہ ایک بلند چبوترے پر ہے، جس کے گنبد کے اندرونی حصے پر بیحد خوبصورت خطاطی کے معاصر نمونے ابھی تک موجود ہیں۔

باغ جناح (لارنس باغ): شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) پر منٹگمری ہال کے ارد گرد ۱۱۲ ایکڑ پر مشتمل یہ باغ ۱۸۶۰ء میں بننا شروع ہوا۔ انگریزوں کے عہد کی غالباً یہ سب سے پر فضا جگہ ان کی خوش ذوقی کی دلیل ہے اس میں تقریباً اسی ہزار درخت اور چھے سو پودے مختلف انواع کے لگے ہوئے ہیں۔ پہلے اس کا نام ''لارنس گارڈنز'' تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا نام ''جناح گارڈنز'' کر دیا گیا اور اس کے ایک حصے کا نام ''گلستانِ فاطمہ''

قرار دیا گیا۔

مزار اقبال: بادشاهی مسجد لاهور کی مشرقی دیواروں کے سایے میں حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کا مزار ہے جو تیرہ سال میں مکمل ہوا۔ اس کا نقشہ حیدر آباد دکن کے ماہر تعمیرات نواب زین یار جنگ بہادر نے تیار کیا تھا اور حکومت افغانستان نے اس کی عمارت کے لیے بیشتر پتھر افغانستان سے بھجوایا تھا۔ مزار کے اندر نسخ، نستعلیق اور دیگر انواع خط میں بڑی خوبصورت خطاطی کی گئی ہے۔ مزار کی ساخت و تعمیر کا کام ''مرکزیہ مجلس اقبال لاهور'' نے اپنے وسائل سے سرانجام دیا ہے۔

قلعۂ لاهور کا سکھ میوزیم: قلعۂ لاهور میں رانی جندان کی حویلی کے کھنڈرات کو محکمۂ آثارِ قدیمۂ پاکستان نے از سرِ نو تعمیر کر کے اس میں سکھ میوزیم قائم کیا ہے، جس میں رنجیت سنگھ اور اس کی اولاد سے متعلق تاریخی نوادر جمع کیے گئے ہیں۔ اسی میوزیم میں تاج محل آگرہ کا ایک نہایت عمدہ ماڈل بھی محفوظ ہے۔

مینارِ پاکستان: ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو دریاے راوی کے کنارے اس وقت کے منٹو پارک (جس کا نام اب اقبال پارک رکھ دیا گیا ہے) کے وسط میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لیے ایک قرار داد منظور کی تھی جس کو بعد میں پاکستان کے تصور کو عملی شکل دینے کے لیے مسلمانوں کے عزم کا سنگ بنیاد قرار دیا گیا۔ اسی مقام پر جہاں یہ قرار داد منظور ہوئی تھی، ایک مینار یادگار کے طور پر بنایا گیا ہے، جس میں اوپر کی منزل تک پہنچنے کے لیے بجلی کی لفٹ لگی ہوئی ہے۔ اس مینار کے ارد گرد بڑے خوبصورت چمن بنائے گئے ہیں اور اهل لاهور اور لاهور کے زائرین کثرت سے ہر روز اس یادگار کو دیکھنے جاتے ہیں۔

لاهور بحیثیت مرکز علم و عرفان: لاهور نے برعظیم پاک و هند کو ہر دور میں بے شمار علما، شعرا، ادبا، اولیا، صوفیہ، اهل همت و سخا محدثین، سیاست دان، پہلوان، اطبا، ماهرینِ فنون لطیفہ، صنّاع، محققین اور صحافیوں وغیرہ کے وجود گرامی سے مالا مال کیا ہے جنھوں نے ہر جگہ اپنا لوہا منوایا ہے۔[ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کے سوانحی خاکے پیش کرنا تو درکنار نام گنوانا بھی ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں مجلۂ نقوش لاهور کا ''لاهور نمبر'' (۱۹۶۲ء) دیکھا جا سکتا ہے جس میں ہر میدان کے ناموروں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں اور ان دینی مدارس کا حال بھی لکھا ہے جو اپنے اپنے دور میں علم و عرفان کے دریا بہاتے رہے ہیں]۔

لاهور کے چند خاندان: فقیر خاندان: دربار رنجیت سنگھ کے سر برآوردہ اهلکار عزیزالدین امام الدین اور نور الدین کے والد سید غلام محی الدین سید غلام شاہ کے بیٹے تھے، جو لاهور کے گورنر نواب عبدالصمد خان اور زکریا خان کے عہد میں سرکاری منصب پر فائز تھے۔ سید غلام شاہ کا خاندان ۱۵۰۰ء سے چونیاں ضلع لاهور میں آباد تھا اور اس سے پہلے بہاولپور کے علاقہ اُچ میں سکونت پذیر تھا۔ خاندان کے بانی جلال الدین ساتویں صدی ہجری میں عربستان سے نقل مکانی کر کے ہلاگوخان کے دربار میں بخارا جا کر ملازم ہوے۔ اس سے پہلے وہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ میں ایک زاهد عالم کی حیثیت سے معروف تھے۔ بخارا میں بھی انھیں اپنے زهد و تقوٰی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی اور یہاں بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہلاگو سے ان بن ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اپنے پوتے بہاءالدین کو ساتھ لے کر پنجاب پہنچے۔ پھر اُچ پہنچ کر وہیں مستقلاً آباد

ہو گئے ۔ جلال الدین ۱۲۹۳ء میں جلال الدین فیروز خلجی کے عہد میں فوت ہوے ۔

سید غلام محی الدین کے والد غلام شاہ نوجوانی ھی میں فوت ہو گئے تھے اور ان کی والدہ نے لاہور میں اقامت اختیار کی ۔ یہاں لاہور کے مشہور معالج اور ان کے شوہر کے دوست عبداللہ انصاری نے ان کی دستگیری کی اور غلام محی الدین کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری سنبھالی ۔ غلام محی الدین نے تعلیم سے فارغ ہو کر پیشۂ طبابت اختیار کیا اور کتابوں کا کاروبار کیا ۔ پھر فقیر امانت شاہ قادری کے مرید ہوے اور اس وجہ سے فقیر کا لقب اختیار کیا ۔

غلام محی الدین کے تین بیٹے تھے ۔ ان میں سب سے بڑے عزیز الدین نے لاہور کے سب سے بڑے طبیب لالہ حاکم رائے سے طب پڑھی اور اسی طبیب نے ۱۷۹۹ء میں اسے رنجیت سنگھ کے علاج پر اس وقت مقرر کیا جب وہ لاہور پر قبضے کے بعد آشوب چشم میں مبتلا تھا ۔ رنجیت سنگھ فقیر سید عزیز الدین کے علاج اور توجہ سے بہت مطمئن اور خوش ہوا اور اس نے اسے ایک جاگیر دے کر اپنا معالج خصوصی مقرر کر لیا ۔ بعد میں اسے مشیر خصوصی مقرر کیا، اسے اپنا خاص نمائندہ اور سفیر بنا کر انگریزوں کے پاس بھی بھیجا ۔ ۱۸۳۵ء میں جب امیر دوست محمد خان نے سکھوں سے پشاور کی باز یابی کے لیے پشاور کی طرف فوج کشی کی تو رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین کو قاصد کے طور پر امیر کے پاس بھجوایا ۔ عزیز الدین نے بڑی لیاقت سے امیر کو قائل کیا اور وہ جنگ لڑے بغیر واپس چلا گیا ۔ جب عزیزالدین واپس اپنے کیمپ میں پہنچا تو رنجیت سنگھ نے اس کے اعزاز میں فوج کی سلامی دی ۔

سکھوں کے دربار میں فقیر عزیزالدین کا اثر و رسوخ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد بھی کم نہ ہوا اور وہ بدستور تا وفات (۳ دسمبر ۱۸۴۵ء) خدمات سرانجام دیتا رہا ۔

عزیزالدین صوفی منش، منتظم، مدبر، فارسی کا شاعر اور جید منشی تھا ۔ اس نے لاہور میں عام و خاص کے لیے فارسی اور عربی کی تدریس کے سلسلے میں اپنے خرچ پر ایک درسگاہ قائم کی جس سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں اس زمانے کے بعض معروف اہل علم شامل ہیں ۔

فقیر امام الدین رنجیت سنگھ کے عہد میں امرتسر اور اس کے مضافات کا گورنر رہا ۔ امرتسر کا قلعہ گوبند گڑھ اور بارود خانہ اسی کی تحویل میں تھا ۔ وہ رنجیت سنگھ کی اکثر جنگی مہمات میں شریک رہا اور ۱۸۴۴ء میں فوت ہوا ۔

فقیر نورالدین ایک عالم شخص تھا اور ۱۸۱۰ء تک بیشتر وقت مطالعے اور عبادت میں صرف کرتا رہا ۔ اس سال رنجیت سنگھ نے اسے دربار میں بلا کر ضلع دھنی کا حاکم مقرر کر دیا ۔ یہ کام اس نے اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ گجرات کا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا ۔ پھر ۱۸۱۲ء میں اسے جالندھر کا حاکم بنا دیا گیا ۔ اگلے سال سیالکوٹ ڈسکہ اور وزیر آباد اس کی تحویل میں دے دیے گئے ۔ ۱۸۱۸ء میں اسے دربار لاہور میں فرائض تفویض ہوے اور شاہی قلعہ، محلات، باغات اور بارود خانہ اس کے سپرد ہوا ۔ رنجیت سنگھ نے موتی مسجد موتی مندر میں تبدیل کر کے جب خزانہ اس میں رکھا تو ایک چابی فقیر نور الدین کے سپرد ہوئی ۔ وہ جنگی مہمات میں شریک ہوتا رہا اور بطور سفیر و قاصد بھی کام کرتا رہا ۔ دسمبر ۱۸۴۶ء میں جب وزیر راجہ لعل سنگھ کو ہٹا کر لاہور میں کونسل آف ریجنسی بنائی گئی تو اسے بھی اس کا ایک رکن بنایا گیا ۔ وہ ۱۸۵۲ء

میں فوت ہوا۔

اس تاریخی خاندان کے مختلف افراد ابھی تک لاہور میں باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی قدیم حویلی یعنی فقیر خانہ میں نوادر کا ایک خزینہ ابھی تک (۱۹۷۸ء) موجود ہے، جسے حکومت پنجاب کی مالی اعانت سے بحال رکھا گیا ہے۔

میاں خاندان: لاہور میں ارائیوں کے چھے گھرانے میاں خاندان کے نام سے معروف ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اس خاندان کا بانی محمد اسحٰق تھا، جس نے شالا مار کے قریب اسحٰق پور آباد کیا تھا۔ اس خاندان میں سب سے زیادہ علمی و مجلسی حیثیت میاں محمد شاھدین کو نصیب ہوئی۔ وہ ۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی نظام الدین ایک فاضل بزرگ تھے۔ ان کے دادا مولوی قادر بخش فارسی اور عربی کے جید عالم تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد میں وہ شاہی خاندان کے بچوں کی اتالیقی پر مامور تھے۔ طبیعت شعر و سخن کے لیے نہایت موزوں پائی تھی اور نادر تخلص کرتے تھے۔

میاں محمد شاھدین بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں تحصیل علم کی غرض سے انگلستان چلے گئے اور وہاں کی ''مڈل ٹمپل ان'' سے بیرسٹری کر کے واپس آئے۔ وہ پنجاب کی مجلس وضع قوانین کے رکن نامزد ہوئے۔ انگریزی اور اردو میں عمدہ تقریروں کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی اور پھر عدالت عالیہ میں جج مقرر ہوئے، جہاں عارضی طور پر چیف ججی کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔

ان کی زندگی ہمہ تن عمل اور اصلاح قوم میں صرف ہوئی۔ سر سید مرحوم نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو میاں شاھدین نے بھی ان کی تعلیمی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ لاہور میں اصلاحی مشاعرے شروع ہوئے تو وہ ان میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ہمایوں تخلص کرتے تھے۔ مطالعے کا شوق رکھتے تھے جو آخر عمر تک قائم رہا۔ ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات پر اقبال نے بھی ایک نظم لکھی جو اب بانگ درا میں بعنوان ''ہمایوں'' موجود ہے؟

ان کا کلام ان کے اکلوتے صاحبزادے میاں بشیر احمد بارایٹ لاء نے جذبات ہمایوں کے نام سے شائع کرایا۔

میاں بشیر احمد ۲۹ مارچ ۱۸۹۳ء کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ آکسفرڈ کالج سے ۱۹۱۳ء میں تاریخ میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی اور پھر ۱۹۱۴ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ وطن واپس آ کر علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ زار تخلص تھا۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں اردو کا مشہور رسالہ ہمایوں لاہور سے جاری کیا، جس میں زمانے کے چیدہ اور منتخب اہل علم و ادب مضمون لکھتے رہے۔ خود ان کا منظوم کلام اور تاریخ و فلسفہ پر بڑے اہم مضامین بھی شائع ہوئے۔ میاں صاحب ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۱ء تک ترکیہ میں پاکستان کے پہلے سفیر تھے اور ۱۹۵۱ء میں ان کی سعی سے ترکیہ اور پاکستان کے مابین دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔

میاں بشیر احمد ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو فوت ہوئے۔

میاں صاحب کی مشہور تصنیف ''طلسم زندگی'' ان کے طبعزاد اردو مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ایک مفید کتاب ''کارنامۂ اسلام'' اور رسالہ ''مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' اور انگریزی میں اپنے والد کی سوانح عمری یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔

اس خاندان کے دیگر قابلِ ذکر افراد میاں سر محمد شفیع، ان کی بیٹی بیگم شاهنواز اور میاں افتخار الدین اور میاں عبدالعزیز فلک پیما تھے۔

ممدوٹ خاندان: قصور کا قدیم شہر جو لاهور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر کے حکم سے پٹھانوں کی سکونت گاہ بنایا گیا، جن کی تعداد ۳۵۰۰ تھی۔ انھیں میں حسن زئی قبیلے کے سردار بھی شامل تھے۔ جو زوالِ مغلیہ تک قصور میں مقیم رہے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عروج کے زمانے میں پٹھانوں کی اس آبادی کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر ۱۸۰۲ء میں اس پر حملہ کر دیا لیکن ۱۸۰۷ء تک رنجیت سنگھ کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور قصور پر پٹھانوں کا قبضہ قائم رہا، لیکن مذکورہ سال میں جب رنجیت سنگھ نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ قصور پر حملہ کیا تو قبیلے کے سردار قطب الدین کو شکست ہوئی اور وہ ستلج پار کر کے اپنی جاگیر ممدوٹ میں چلا گیا۔ یہ جاگیر قطب الدین نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر راے کوٹ کے راجا سے ۱۸۰۰ء میں چھینی تھی۔ ۱۸۲۱ء میں مروپ کے جاگیر دار فتح دین خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ سازش کر کے ممدوٹ پر حملہ کر دیا۔ قطب الدین کو شکست ہوئی اور اس جنگ میں وہ شدید زخمی ہو کر امرتسر پہنچا اور وہیں فوت ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے اس وقت ایک اور چال چلی کہ فتح دین خان کو واپس بلا کر ممدوٹ کی جاگیر قطب الدین کے بیٹے جمال الدین کو دے دی۔ ۱۸۴۸ء میں جمال الدین کی فوج نے اس کے بھائی جلال الدین کی سرکردگی میں ملتان میں سکھوں کے مقابلے میں انگریزوں کا ساتھ دیا، جس کے عوض اسے انگریزوں نے نواب کا خطاب دیا۔ جمال الدین کا سلوک رعایا سے کچھ اچھا نہ تھا۔ برطانوی حکومت نے ۱۸۵۵ء میں اس کے خلاف تحقیقات کر کے اسے گدی سے اتار دیا اور ریاست کو ضلع فیروز پور میں مدغم کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں نواب کو پنشن دے دی گئی اور اس نے لاهور میں رهنا شروع کر دیا۔ اس کی وفات ضلع فیروز پور کے قصبۂ ماچھیواڑہ میں مارچ ۱۸۶۳ء میں ہوئی، جہاں وہ لاهور سے جا کر آباد ہو گیا تھا۔

جمال الدین کے مرنے کے بعد اس کی اور اس کے بھائی جلال الدین کی اولاد میں وراثت کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔ جلال الدین کے متعلق انگریزوں کی راے اچھی تھی کیونکہ اس نے ۱۸۴۸ء میں ملتان میں ان کا ساتھ دیا تھا چنانچہ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل نے جلال الدین اور اس کی اولاد کو جائداد کا وارث قرار دے دیا۔ اس کے پوتے غلام قطب الدین کی وفات تک جائداد ان کے قبضے میں رہی، لیکن جب وہ مارچ ۱۹۲۸ء میں لاولد فوت ہوا تو جاگیر اور بقیہ جائداد نواب جمال الدین خان کے پوتے شاهنواز خان کو نواب کے جدی خطاب کے ساتھ منتقل ہو گئی۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں سر کا خطاب بھی دیا گیا۔

نواب سر شاهنواز خان امیر کبیر شخص تھے اور مخیر بھی۔ جب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو نواب نے بڑے خلوص اور نیک نیتی سے تحریک پاکستان کی مدد کی۔ لاهور میں غالباً یہ شرف نواب ممدوٹ ہی کو حاصل تھا کہ قائداعظم جب بھی لاهور تشریف لاتے تو ان کے ہاں قیام فرماتے۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے افتخار حسین خان نے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر تحریک پاکستان میں شاندار خدمات سرانجام دیں۔ تاسیس پاکستان کے بعد وہ کچھ عرصے تک پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بھی رہے۔

مآخذ: (۱) سید محمد لطیف: لاهور، ۱۹۰۴ء؛

(۲) Muhammad Baqir, *Lahore : Past and Present*، لاهور ۱۹۵۲ء؛ (۳) کنهیا لال : تاریخ لاهور، لاهور ۱۸۸۴ء؛ (۴) محمد دین فوق : لاهور عهد مغلیه میں، لاهور ۱۹۲۷ء؛ (۵) نور احمد چشتی : تحقیقات چشتی، لاهور ۱۹۶۲ء؛ (۶) مجلهٔ نقوش (لاهور نمبر)، لاهور ۱۹۶۲ء؛ (۷) کرنل بهولا ناتھ : شهر لاهور دی تاریخ، لاهور ۱۹۳۳ء؛ (۸) مفتی غلام سرور لاهوری : تاریخ مخزن پنجاب، لاهور؛ (۹) سید هاشمی فرید آبادی : مآثر لاهور، لاهور ۱۹۵۴ء؛ (۱۰) H. A. Newal : *Lahore*، لاهور ۱۹۲۱ء؛ (۱۱) H. R. Goulding : *Old Lahore*، لاهور ۱۹۲۴ء؛ (۱۲) T. H. Thornton : *A Historical and Discriptive note*، لاهور ۱۹۲۴ء؛ (۱۳) Muhammad Baqir : *The Tomb of Zibun Nisa*، لاهور ۱۹۵۲ء؛ (۱۴) مصنف مذکور : *Adina Beg Khan*، لاهور ۱۹۳۵ء؛ (۱۵) مصنف مذکور : تذکرهٔ شعرائے پنجاب، لاهور ۱۹۳۷ء، ص ۳۳، ۴۴، ۵۲، ۸۳، ۹۰، ۱۰۳، ۱۰۹، ۱۲۶، ۱۴۲، ۱۸۲؛ (۱۶) البیرونی : تحقیق ماللهند، لنڈن، ۱۸۸۷ء، ص ۱۶؛ (۱۷) گردیزی : زین الاخبار، برلن، ۱۹۲۸ء، ص ۷۹، ۱۰۳؛ (۱۸) سید علی الهجویری : کشف المحجوب (نسخهٔ خطی مملوکهٔ دانشگاه پنجاب، شماره Pe IV 78) ورق ۵۶؛ (۱۹) البیهقی : تاریخ بیهقی، کلکته ۱۸۶۲ء، ص ۵۲۳؛ (۲۰) الادریسی : نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق - (بنقل از ایلیٹ و ڈاؤسن)؛ (۲۱) ابن الأثیر : الکامل فی التاریخ، قاهره ۱۳۵۳ھ، ج ۲، ص ۳۰۱، ۳۰۲؛ (۲۲) شرف الزمان طاهر رونی : طبائع الحیوان، لنڈن ۱۹۴۲ء، ص ۳۹؛ (۲۳) یاقوت : معجم البلدان، لائپزگ ۱۸۶۶ء، ج ۴، ۱۹۴۲ء؛ (۲۴) فخر مدبر : آداب الحرب والشجاعة، نسخهٔ خطی، مملوکهٔ موزهٔ بریطانیه، شماره Add. 16583.، ورق ۱۲۲، "نیز در کتاب خانهٔ پنجاب یونیورسٹی" "روٹوگراف عدد ۲۸۳۹، ورق ۱۲۲-۱۲۴"؛ (۲۵) حدود العالم، تهران ۱۳۵۲ھ؛ (۲۶) العتبی : تاریخ یمینی، لاهور ۳۰۰، ۳۰۵؛ (۲۷) سجان رائے بهنڈاری : خلاصة التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء، ۶۴؛ (۲۸) مرتضٰی حسین : حدیقة الاقالیم، خطی مملوکهٔ دانشگاه پنجاب، برگ ۸؛ (۲۹) بوٹے شاه : تاریخ پنجاب، نسخهٔ خطی، مملوکهٔ دانشگاه پنجاب، شماره APe II 8، برگ ۱۶ - ب؛ (۳۰) فرشته : گلشن ابراهیمی، بمبئی ۱۸۳۱ء، ج ۱، ص ۳۰؛ (۳۱) عصامی : فتوح السلاطین، آگره، ۱۹۳۸ء، ص ۶۸؛ (۳۲) منهاج سراج : طبقات ناصری، ص ۱۴۳؛ (۳۳) عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ، کلکته ۱۸۶۸ء، ج ۱، ص ۱۶۷؛ (۳۴) ضیاءالدین برنی : تاریخ فیروز شاهی، کلکته ۱۸۶۲ء، ص ۱ - ۱۷۳؛ (۳۵) مصنف تاریخ مبارکشاهی، ۱۵۷، ۱۷۲؛ (۳۶) عبدالحمید لاهوری : بادشاه نامه، کلکته ۱۸۶۸ء؛ (۳۷) عبدالکریم خان : تاریخ احمد، کانپور ۱۸۴۹ء.

دیگر مآخذ کی مکمل ترین فہرست کے لیے ملاحظه فرمایے مقاله نگار کی کتاب *Lahore : Past and Present*، صفحات ۵۱۳ - ۵۰۳.

(محمد باقر)

تعلیقه (۱) : لاهور کا نام اور اس کی تأسیس : ⊗ تاریخ کی مدد سے لاهور کے نام اور اس کی تأسیس کے متعلق مقالے کی ابتدا میں جو کوائف پیش کیے گئے هیں، ان پر زمانی ترتیب سے از سر نو نگاه ڈال لینا ضروری هے - سکندر اعظم نے دریاے راوی کو کہیں لاهور کے قریب هی سے عبور کیا تھا، لیکن اس کے حالات میں اس شہر کا نام نہیں آیا - سٹرابو اور پلینی نے بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا - بطلمیوس دوسری صدی عیسوی کا جغرافیه دان هے - وہ ایک شہر لبوکلا کا نام لیتا هے، جسے لاهور کا شہر قرار دیتے هیں، لیکن بطلمیوس نے اس کا محل وقوع کیسپیر (کشمیر) کے علاقے میں بتایا هے -

لہٰذا اس پر پنجاب کے لاهور کا اطلاق مشکل ہے۔ بدھ سیاح ہیون سانگ نے ۶۳۰ء میں پنجاب کی سیاحت کی، اس نے کئی شہروں کا حال لکھا ہے۔ مگر لاهور کا نام تک نہیں لیا۔ یونانی اور بدھ مصنفین کے بعد اب مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ دانوں کی باری آتی ہے۔ بلاذری نے ملتان اور کابل کے مابین جس الاهوار کا ذکر کیا ہے، اس سے عین پہلے وہ بنّہ (بنّوں) کا نام لیتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ الاهوار سے سرحد (تحصیل صوابی) کا لاهور مراد ہے جو ضلع مردان میں ہنڈ کے نزدیک واقع ہے۔ [نیز دیکھیے خواجہ عبدالرشید، کرنل: *Historical Dissertations*، لاهور ۱۹۷۸ء، ص ۴۷] حدود العالم والے لہور میں بادام اور چلغوزوں کے درختوں کا ذکر ضرور موجود ہے، لیکن محض ان کی وجہ سے اسے سرحد کا لاهور نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ممکن ہے گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں لاهور کا موسم زیادہ گرم ہوگیا ہو۔ دوسرے سرحد کے لاهور میں اب ۱۹۷۸ء میں بھی بالکل معمولی سی آبادی ہے، جب کہ حدود العالم والا لہور ۹۸۲ء میں بھی ایک قابل ذکر قصبہ معلوم ہوتا ہے، جس میں بازار اور بت خانے تھے، البتہ اس وقت اس میں مسلمان ناپید تھے۔ معلوم ہوتا ہے یہ وہ لوہور ہے جس کا ذکر راوی کے کنارے پر فخر مدبر نے آداب الحرب والشجاعۃ (پنجاب یونیورسٹی لائبریری روٹو گراف عدد ۲۸۳۹، ورق ۱۲۲-۱۲۴) میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک راجا چچ بن بھندرا نے نویں صدی کے اواخر میں اس کو آباد کیا اور اس میں سورج دیوتا کا مندر بنایا۔ فخرِ مدبرؒ صراحۃً لکھتا ہے کہ اس وقت لوہور ایک جداگانہ ریاست تھی جو بیاس تا چناب پھیلی ہوئی تھی۔ البیرونی نے لاهور کا ذکر لوهاور لکھ کر کیا ہے۔ وہ بھی اسے اشارۃً ایک ریاست ہی بتاتا ہے۔ جس کا صدر مقام مندھوکور تھا۔ البیرونی ایک قلعۂ لہور کا بھی نام لیتا ہے [دیکھیے البیرونی: تحقیق ماللہند، حیدرآباد دکن ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۵، ۱۶۷]، لیکن وہ کشمیر کی سرحد کے قریب وادی سندھ میں واقع تھا۔ مندھوکور، کا ذکر بیہقی نے بھی کیا ہے [دیکھیے بیہقی: تاریخ بیہقی، تہران ۱۳۲۴ ش، ص ۴۲۳] مگر وہ اسے مندکور لکھتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے اس کی عمارات کی طرف خصوصی توجہ دی، اس کا نام محمودپور پڑ گیا۔ دفاتر کے علاوہ یہاں ٹکسال قائم ہوئی چنانچہ اس سلطان کے نام کا ۴۱۹ھ کا محمود پور میں مضروب ایک دینار عجائب گھر لاهور میں موجود ہے، مگر سلطان محمود کی وفات کے بعد بہت جلد شہر کا عام نام لوهور شہرت پکڑ گیا۔ سلطان کا ایک پوتا سیف الدین محمود (۴۶۹ھ تا ۴۸۰ھ / ۱۰۷۶ تا ۱۰۸۷ء) یہاں کا والی مقرر ہوا تو اس نے شہر کو بڑی ترقی اور وسعت دی اور یہ اپنے موجودہ نام سے ہر طرف مشہور ہو گیا۔ تمام شعرا اور مصنف اس کا یہی نام استعمال کرنے لگے، اگرچہ تلفظ کا اختلاف موجود رہا۔ بنا بریں یہ کہنا درست ہے کہ شہر لاهور صحیح معنوں میں غزنویوں کے دور میں نمایاں ہوتا ہے۔ بالکل قرین قیاس ہے کہ آداب الحرب و الشجاعۃ میں فخر مدبر (نیز دیکھیے ہاشمی فرید آبادی: مآثر لاهور، ۱۹۵۶ء، ج ۱، ص ۱۵؛ ج ۲، ص ۱۷۳) نے جس لوهور کا ذکر کیا ہے، عوام کی زبان پر اس کا نام رواں ہونے کی وجہ سے محمودپور کا نام ختم ہو گیا۔ لاهور نام کے اور مقامات کا ذکر بھی سطور بالا میں آیا ہے۔ عین ممکن ہے رام چندر کے بیٹے لو کی وجہ سے اس نام کو اهمیت دے دی گئی ہو) [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔ (ادارہ)

تعلیقہ (۲): کچھ مزید معلومات:- فاضل مقالہ نگار نے مغلیہ دور میں اکبر اعظم کے زمانے

تک لاهور کے معلومات افزا حالات تفصیل سے لکھ دیے ہیں، بعد کے مغلیہ حکمرانوں تک کے حالات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے شاہان مغلیہ کے زمانے میں لاهور سے متعلق کچھ مزید حالات پیش کر دیے جائیں۔

لاهور عہد جہانگیر میں: اکبر اعظم کی وفات کے بعد شاهزادۂ سلیم نور الدین جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے ایک معتمد امیر سعید خان کو لاهور کا ناظم مقرر کیا۔ تخت نشینی کو چھے ہی ماہ گزرے تھے کہ شاهزادۂ خسرو نے جو لوگوں میں خاصا مقبول تھا، بغاوت کر دی۔ ۶ اپریل ۱۶۰۶ء کو وہ کسی بہانے آگرے سے نکلا، بہی خواهوں کے فوجی دستے تیار کیے اور سرمایہ فراهم کر کے پنجاب کا رخ کیا۔ جہانگیر نے اس کا پیچھا کیا۔ خسرو لاهور آ پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سعید خان فوج لیے ہوے باهر آیا۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، لیکن خسرو کو خلاف توقع راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ چناب کو عبور کرنا چاهتا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔

جہانگیر کے خیمے لاهور کے ایک باغ میں نصب تھے۔ یہیں خسرو کو پا بزنجیر پیش کیا گیا اور زندان میں ڈال دیا گیا، جہاں ۱۶۲۲ء میں وہ فوت ہوا۔ خسرو کی سرکوبی میں شیخ فرید بخاری نے نمایاں کام انجام دیے تھے، جن کے صلے میں اسے مرتضٰی خان کا خطاب دیا گیا اور بعد میں اسے لاهور کا ناظم مقرر کیا گیا (۱۶۱۱ء)۔

جہانگیر کی مہمات اور امور سلطنت سے قطع نظر صرف لاهور سے متعلق اس زمانے کے حالات پیش کیے جائیں گے۔

شیخ فرید کو عمارات بنوانے کا بڑا شوق تھا چنانچہ اپنی عمارات کے متصل ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ یہ سب عمارتیں سکھوں کے حملوں میں تباہ ہو گئیں۔ ۱۶۱۶ء میں شیخ فرید کا انتقال ہو گیا۔ اس کی خدمات کے لیے دیکھیے توزک جہانگیری (انگریزی، ترجمہ، ج ۱، ص ۳۲۴ تا ۳۲۵)۔ اسی سال پنجاب میں وبا پھیلی، جو لاهور تک بھی پہنچی۔ اس سے بیشمار نفوس لقمۂ اجل ہوے۔

لاهور کے ناظم مرتضٰی خان کی وفات کے بعد نور جہاں کے والد مرزا غیاث بیگ کو لاهور کا ناظم مقرر کیا گیا اور پھر ۱۶۱۸ء میں لاهور کی حکومت قاسم خان کو ملی جو اعتماد الدولہ وزیر اعظم کا داماد تھا۔

۱۶۲۰ء میں جہانگیر کشمیر سے واپس ہوا۔ اثناے سفر میں شیخوپورے کے قریب، جو اس کی شکارگاہ تھی شکار کھیلنے کے لیے گیا۔ یہاں اس نے عالم شاهزادگی میں جہانگیر آباد نام گاؤں آباد کیا تھا جو بعد میں شیخوپورہ کہلایا۔ تخت نشینی کے بعد یہ گاؤں سکندر مبین کو بطور جاگیر دے دیا کہ یہاں ایک تالاب، ایک مینار اور دولت خانہ تعمیر کرایا جائے، جس کی تعمیل کر دی گئی۔ تالاب اور ہرن مینار اب بھی موجود ہیں۔ جنھیں دیکھنے کے لیے لوگ جاتے ہیں۔ ۱۶۱۸ء میں جہانگیر نے حکم دیا کہ آگرے سے لاهور تک شاهراہ اعظم پر کوس کوس کے فاصلے پر ایک مینار تعمیر کرایا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر ایک کنواں کھودا جائے تاکہ سفر میں آسانی ہو۔ ایسا ہی ایک مینار ریلوے سٹیشن کے مشرقی جانب واقع ہے جو فن تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ جہانگیر نے شاهی قلعے میں شاهی برج کا بھی اضافہ کیا۔

جہانگیر سیر و سیاحت کے دوران مختلف وقتوں میں لاهور آتا رہا۔ ایک دفعہ قاسم خان کے دور نظامت میں، پھر ۱۶۲۵ء میں کابل سے واپسی

پر ۔ اس موقع پر اس نے یمین الدولہ آصف خان کو ناظم لاهور مقرر کیا ۔

حضرت میاں میر سے عقیدت : دارا شکوہ لکھتا ہے ''کہتے ہیں جہانگیر بادشاہ نے باوجودیکہ وہ اولیا اور درویشوں پر زیادہ اعتقاد نہ رکھتے تھے، اپنے ایک خاص شخص کو حضرت میاں جیو (میانمیر) کی خدمت میں بھیجا اور اپنے ہاں تشریف لانے کی التماس کی ۔ یہ عذر بھی کیا کہ لاهور کے قیام کے دوران میں آپ کا اسم شریف سن لیتا تو خود حاضری دیتا، لیکن اب جو وہاں سے آ گیا ہوں، واپس لاهور آنا ممکن نہیں، ـــــ تفصیل کے لیے دیکھیے سکینۃ الاولیا، اردو میں، ترجمۂ مقبول بیگ بدخشانی، پیکیجز لمیٹڈ لاهور، تاریخ ندارد، ص ۶۱-۶۳ ۔

آخری مرتبہ ۱۶۲۵ - ۱۶۲۶ء میں جہانگیر کشمیر گیا ۔ اس وقت وہ بیمار تھا ۔ کشمیر میں بھی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ پھر آخری آرام گاہ کی کشش اسے لاهور لے آئی اور راستے ہی میں وہ ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو فوت ہو گیا اور دریاے راوی کے پار اس مقام پر دفن ہوا، جہاں اس کے لیے نورجہاں نے نادرۂ روزگار مقبرہ تعمیر کرایا ۔

لاهور شاهجہان کے دور میں : شاهجہان کی تخت نشینی کے بعد خدمت پرست خاں رضا بہادر کو لاهور کا حاکم بنایا گیا، مگر جلد ہی یہ عہدہ آصف خان کو دے دیا گیا ۔ آخر ۱۶۳۲ء میں وزیر خان کو حاکم لاهور کا منصب سونپا گیا ۔ شاهجہان کا عہد مغلیہ سلطنت کے عروج اور فراغت و آسودگی کا عہد ہے ۔ اس دور کے حالات و مہمات سے قطع نظر ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں ۔

شاهجہان کے دور تک مغلوں کی سلطنت وسیع بھی ہو چکی تھی اور مستحکم بھی، شاهزادے، شاهزادیاں، امرا، عمائد سبھی ذی علم اور شاعر تھے ۔ اس کے زیر اثر علم و ادب اور فنون لطیفہ کو غیر معمولی فروغ نصیب ہوا ۔ اس کے دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب ممتاز صاحب تصنیف اور انشا پرداز تھے ۔ اس کی بیٹی جہاں آرا کی کتاب مونس الارواح خاصی مشہور ہے ۔ اس کے امرا میں ظفر خان احسن اور نواب شکر اللہ خان خاکسار کی طرح کے متعدد صاحب تصنیف لوگ ملتے ہیں ۔

فن موسیقی میں شاهجہانی عہد میں اکبر اور جہانگیر کے عہد سے بھی زیادہ ترقی ہوئی، مصوری اور خطاطی کو بھی بہت ترقی ہوئی ۔ جس میں لاهور کے فنکاروں کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ فن تعمیر کے لحاظ سے مغل سلاطین میں سب سے زیادہ اہم تعمیراتی آثار شاهجہان اور اس کے زمانے ہی سے متعلق ہیں ۔ دہلی، آگرہ اور کشمیر کے علاوہ لاهور میں شاهجہانی تعمیرات آج بھی اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتی ہیں ۔ شالامار باغ اس زمانے کے عجائبات میں سے ہے ۔ کسی ملک کا سربراہ، غیر ملکی عمائدین اور سیاح جب پاکستان آتے ہیں تو شالامار باغ دیکھنے ضرور جاتے ہیں ۔ اس میں مغل دور کے فن تعمیر کے آثار بہت نمایاں ہیں ۔

شاهجہان کا ورود لاهور : شاهجہان ۱۶۳۳ء میں لاهور آیا ۔ راستے میں بیاس کے کنارے خیمہ زن تھا (۱۵ اپریل ۱۶۳۳ء) کہ دارا شکوہ کی بیٹی کا انتقال ہو گیا، جس کا شہزادے کو بہت رنج ہوا ۔ اس کی صحت پر بھی اثر پڑا ۔ رفتہ رفتہ صحت خراب ہوتی گئی ۔ اس سلسلے میں داراشکوہ نے خود جو کیفیت بیان کی ہے، درج ذیل ہے :

''ایک مرتبہ اس فقیر (داراشکوہ) کو بیماری لاحق ہوئی ۔ علاج کرنے سے طبیب عاجز آ گئے ۔ بیماری نے چار ماہ طول پکڑا ۔ فقیر کو اب تک حضرت میاں میر سے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا اور انھیں پہچانتا بھی نہ تھا ۔ بادشاہ مجھے اپنے ساتھ

حضرت کی خدمت میں لے گئے اور کمال اخلاص اور نیاز مندی کے ساتھ التماس کی کہ اس فقیر کی شفا اور صحت کے لیے دعا فرمائیں ۔ حضرت نے میرا ہاتھ پکڑا، پھر مٹی کا پیالہ جس میں خود پانی پیا کرتے تھے، پانی سے بھر کر ہاتھ میں لیا اور اس پر دعا پڑھی اور پانی پینے کے لیے اس فقیر کو دیا ۔ پانی پینے کے ایک ہفتہ بعد میری بیماری جاتی رہی''۔

(سکینۃ الاولیا اردو میں ترجمہ مقبول بیگ بدخشانی مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ، لاہور تاریخ ندارد)۔

شاہجہان کی عقیدت حضرت میاں میر کے ساتھ: ''بادشاہ اسلام حضرت جہانگیر کی وفات کے بعد ان کے جانشین برحق شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ نے جب دو مرتبہ حضرت میاں میر کے ہاں جا کر شرف ملاقات حاصل کیا تو دونوں صحبتوں میں یہ فقیر موجود تھا ۔ ان صحبتوں میں بہت سی لطیف اور سود مند باتیں ہوئیں''(وہی کتاب، ص ۶۳)۔

دوسری مرتبہ بادشاہ نے عرض کی کہ توجہ فرمائیں کہ دنیا سے دل ہٹ جائے، آپ نے فرمایا کہ جب آپ کوئی نیک عمل کریں جس سے مسلمانوں کا دل آسودہ ہو، اس وقت اپنے لیے خود دعا کریں (وہی کتاب، ص ۶۴)۔

اس مرتبہ بادشاہ نے حضرت کو شال کی ایک دستار اور خرما کی ایک تسبیح بطور نذر پیش کی اور یہ عرض کی کہ آپ مال دنیا قبول نہیں فرماتے ۔ یہ نذر عقیدت تو میری طرف سے قبول فرما لیجیے ۔ حضرت نے دستار لوٹا دی، مگر تسبیح قبول کر لی اور پھر وہ تسبیح اس با اخلاص مرید (داراشکوہ) کو عنایت فرما دی (وہی کتاب، ص ۶۶، ۶۷)۔

قیام لاہور کے چھے دن بعد شاہجہان ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں وارد ہوا ۔ قلعے میں وزیر خان صوبیدار نے اکابر شہر کے ساتھ استقبال کیا ۔ وزیر خان نے مختلف صورتوں میں جو نذرانہ پیش کیا، اس کی مالیت تقریباً چار لاکھ روپئے تھی (محمد صالح کنبوہ: عمل صالح، کلکتہ، ج ۲، ص ۳، ۴، ۵) ۔ ۲۰ اپریل کو آصف خان نے شاہجہان کو اپنے محل میں مدعو کیا۔

تعمیرات: شاہجہان کو فن تعمیر میں بڑی دلچسپی تھی ۔ قلعۂ شاہی کی عمارات میں اس نے مرمت کرائی، کچھ نئی عمارتیں تعمیر کرائیں اور جہانگیر کے تعمیر کردہ شاہ برج کو آصف خان کی نگرانی میں از سر نو تعمیر کرایا ۔ وزیر خان کی نگرانی میں غسل خانہ اور خواب گاہیں بھی تعمیر ہوئیں ۔ اسی اثنا میں شاہجہان اپنے والد کے مقبرے کی زیارت کرنے کے لیے گیا اور وہاں حاجت مندوں کو دس ہزار روپیہ تقسیم کیا ۔ اسی ایک موقع پر اکتفا نہیں، قیام لاہور کے زمانے میں وہ اکثر اپنے والد کے مقبرے کی زیارت کے لیے جاتا اور ہزارہا روپیہ ضرورت مندوں اور مسکینوں میں تقسیم کرتا۔

شاہ نہر: ۱۶۳۹ء میں جب شاہجہان لاہور آیا تو علی مردان خان نے درخواست پیش کی کہ اس کے متعلقین میں ایک شخص جانی بیگ دریائے راوی سے ایک نہر نکالنا چاہتا ہے، جس سے باری دوآب کا علاقہ بھی سیراب ہو سکیگا اور نواح لاہور کے باغات بھی ۔ بادشاہ سے اجازت ملنے پر جانی بیگ نے ایک لاکھ روپئے کی شاہی امداد سے راجپوتانے کے مقام پر نہر نکالی اور اس کا نام شاہ نہر رکھا گیا۔

شالامار باغ: نہر کی تکمیل کے بعد شاہجہان نے حکم دیا کہ ایک عظیم الشان باغ کی بنیاد قائم کی جائے، چنانچہ ۱۲ جون ۱۶۴۱ء میں اس باغ کی رسم افتتاح ادا کی جو اب شالامار باغ [رک ہاں] کے نام سے موسوم ہے ۔ اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

شاهجہان ہی کے دور میں نورجہاں کا مقبرہ تعمیر ہوا، جسے سکھ گردی میں بہت نقصان پہنچا۔

۱۶۵۲ء میں دارا شکوہ ملتان، لاہور اور کابل کا حاکم مقرر ہوا کہ وہ ان کے وسائل استعمال کر کے قندھار فتح کرنے کی تیاری کرے۔ اس کے بعد لاہور کے کچھ اور حاکم مقرر ہوے۔ اس دور کا آخری حاکم سید عزت خان تھا۔

داراشکوہ کو لاہور سے بہت دلچسپی تھی۔ یہاں اس نے متعدد عمارات اور تجارتی منڈیاں تعمیر کرائیں۔ اس کی تعمیر کردہ عمارات میں ''آئینہ محل'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کا تو اب نام و نشان باقی نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ شہر کے کس علاقے میں تھا۔ مولوی محمد شفیع نے بتایا ہے کہ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے مزار اور امام باڑے کے مابین ایک عمارت کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں، جو ''شیش محل'' کے نام سے موسوم ہیں (اب تو وہ بھی موجود نہیں)۔ یہ عمارت مغل بادشاہوں کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ اسی کی نسبت سے یہ علاقہ ''محلۂ شیش محل'' کے نام سے موسوم ہوا۔ محمد طاہر عنایت خان آشنا (م ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰ء) پر ظفر خان احسن (م ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء) نے شیش محل کی تعریف میں دو مثنویاں لکھی ہیں جو مولوی محمد شفیع نے اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں شائع کی ہیں (دیکھیے مئی ۱۹۲۶ء)۔

قلعۂ قندھار لاہور میں: ۱۶۵۲ء میں دارا شکوہ نے تسخیر قندھار کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، جو ۱۶۴۹ء میں ایرانیوں نے فتح کر لیا تھا۔ اس مہم کے لیے ملک کے تمام وسائل وقف کر دیے گئے۔ تیاری کے سلسلے میں دارا شکوہ نے بڑی بڑی تنخواہوں پر فرنگی توپچیوں اور انجینئروں کی خدمات حاصل کیں۔ لاہور میں قلعۂ قندھار کے نمونے کا ایک مصنوعی قلعہ تیار کرایا، تاکہ فتح قندھار کا تجربہ کیا جا سکے۔ اس مصنوعی قلعے پر گولے برسائے گئے اور قلعہ شکن توپوں نے اسے تباہ کر دیا۔ اسے نیک شگون سمجھ کر لوگوں نے شاہزادے کو مبارک بادیں پیش کیں (دیکھیے قانونگو: داراشکوہ، ص ۳۸-۳۹)۔ داراشکوہ نے ساحروں اور نجومیوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اس طرح گویا وہ مادّی اور سحر و طلسم کے وسائل سے مسلح ہو کر نجومیوں کی بتائی ہوئی، یعنی ۱۱ فروری کو قندھار کی جانب روانہ ہوا (وہی کتاب، ص ۵۲)، قلعۂ قندھار سر نہ ہو سکا اور مغلوں کی فوج کو بے حد جانی و مالی نقصان اٹھا کر لوٹنا پڑا۔

لاہور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں: شاہجہان کی بیماری کے دوران ہی میں اس کے شاہزادوں مراد، شجاع، دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اس کا ذکر خارج از موضوع ہے۔ دارا کی جنگ اورنگ زیب کے ساتھ سامو گڑھ کے مقام پر ہوئی جس میں دارا نے شکست کھائی اور مختلف مقامات میں سے راہ فرار اختیار کرتا ہوا لاہور پہنچا اور ۱۵ جولائی ۱۶۵۸ء کو شہر پر قابض ہو گیا۔ یہاں اس نے بے دریغ دولت خرچ کر کے امرا و اکابر کو ساتھ ملایا اور ان کی مدد سے ۲۰ ہزار سوار جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا (محمد کاظم: عالمگیر نامہ، ص ۱۷۸)۔ اورنگ زیب کو اطلاع ملی تو اس نے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور کے لوگ سامو گڑھ میں اورنگ زیب کی فتح کا حال سن چکے تھے۔ اس لیے دارا شکوہ کا ساتھ چھوڑنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ دارا شکوہ نے صورت حال سے بددل ہو کر داؤد خان کو حاکم لاہور مقرر کر دیا اور خود ملتان کا رخ کیا۔

اورنگ زیب نے اپنے، شاہزادے محمد اعظم

کو لاهور بهیجا اور خود ملتان پهنچ کر دارا شکوه سے دو دو هاتھ کرنے چاهے ۔ دارا شکوه نے وهاں سے بهی راه فرار اختیار کی ۔ اب اورنگ زیب لاهور آیا اور شالامار میں قیام کیا ۔ اس نے قلعے وغیره کے استحکامات کا جائزه لیا ۔ خلیل الله خان کو اس نے حاکم لاهور مقرر کیا اور اسے جاگیر بهی عطا کی ۔ خواجه اسمٰعیل کرمانی کو دیوان لاهور مقرر کیا ۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے دہلی کا رخ کیا ۔ حاکم لاهور خلیل الله خان ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب سے ملاقات کرنے دہلی کو روانه هوا، لیکن اثنائے سفر میں بیمار هو گیا اور دہلی پهنچ کر فوت هو گیا ۔

۱۸ دسمبر ۱۶۶۲ء کو اورنگ زیب نے کشمیر جاتے هوئے لاهور کے شالامار باغ میں قیام کیا ۔ ۳ مئی ۱۶۶۳ء کو کشمیر جانے کی غرض سے لاهور سے روانه هونے کا اراده کیا ۔ اس عرصے میں سخت بارش هوئی اور لاهور دریاؤں کی طغیانی کی زد میں آگیا ۔ بادشاه نے اس صورت حال کے پیش نظر ایک مستحکم بند باندهنے کا حکم دیا، چنانچه شالامار سے شاهی قلعے تک بند باندها گیا ۔ سجان رائے بٹالوی نے اس بند پر اس طرح اظهار خیال کیا هے که اسے سدّ سکندری کهنا چاهیے ۔ بادشاه نے ''لب دریا را مانند لبِ خوبان بیاراست'' (دیکهیے خلاصة التواریخ) اس بند کی وجه سے لاهور کئی برس دریا کی طوفانی موجوں سے محفوظ رها پهر دریا نے اپنی گزرگاه تبدیل کر لی ۔

۱۸ مئی ۱۶۷۰ء کو اورنگ زیب نے محمد امین خان حاکم لاهور کے بجائے اپنے دوده شریک بهائی فدائی خان کو حاکم لاهور بنایا ۔ اس کے زمانے میں اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۷۳ء میں شاهی مسجد کی بنیاد رکهی گئی ۔ خلاصة التواریخ کے بیان کے مطابق اس پر ۶ لاکھ روپے سے زیاده خرچ هوے ۔

۱۶۷۵ء کو سید احمد کو لاهور کا ناظم مقرر کیا گیا اور امانت خان کے خطاب سے نوزا گیا ۔ ڈیڑھ سال تک فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد اسے اجمیر کا صوبیدار بنا دیا گیا اور اس کے بجائے لاهور کی نظامت قوام الدین خان کو ملی (مستعد خان : مآثر عالمگیری، ص ۱۵۰) ۔

۱۶۸۰ء میں لاهور کی نظامت کے سلسلے میں اختلاف پیدا هو گئے، جنهیں دور کرنے کے لیے اورنگ زیب نے شہزادۂ اعظم کو لاهور کا صوبیدار مقرر کیا ۔ اس منصب پر مکرم خان اور سپه دار خان بهی فائز رهے ۔ ۱۶۹۱ء سے ۱۶۹۴ء تک یه منصب جلیله خان جہان بہادر کو سونپا گیا ۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے ابراهیم خان کو حاکم لاهور مقرر کیا اور مہابت خاں کے خطاب سے نوازا، لیکن اس کی زندگی نے زیاده عرصه وفا نه کی ۔ اس کی یادگار باغبان پوره کا ایک باغ هے جس کے کچھ حصے پر مکانات تعمیر هو چکے هیں ۔ باغ کے وسط میں ایک چبوترے پر مہابت خاں کی آخری آرام گاه هے ۔

اس کے بعد یه منصب ۱۶۹۶ء میں مکرم خاں کو ملا ۔ پهر اس منصب پر ابو نصر خاں فائز رها اور پهر شاهجہاں کے وزیر اعظم سعد الله کے بیٹے حفیظ الله خاں الملقب به میاں خاں کو یه منصب ملا ۔ رنگ محل سے قریب حویلی میاں خاں اس کی یادگار هے جس کا اب صرف صدر دروازه باقی هے ۔ حویلی کے باقی حصے پر ایک وسیع محله آباد هے جو اب بهی حویلی میاں خاں کے نام سے موسوم هے ۔

میاں خاں کے بعد کابل، ملتان اور لاهور کا نائب السلطنت فروری ۱۷۰۰ء میں شہزادۂ محمد معظم کو بنایا گیا جس کا نمائنده لاهور کی صوبیداری کے فرائض انجام دیتا تها ۔

لاهور عالمگیر کے جانشینوں کے زمانے میں : شہزادۂ محمد معظم پشاور میں تها که اسے والد کی

وفات کی خبر ملی ۔ وہ لاہور پہنچا تو منعم خان نے آداب شاہی کے مطابق اس کا خیر مقدم کیا ۔ چالیس لاکھ روپے بطور نذرانہ پیش کیے ۔ شہزادۂ محمد معظم نے شاہ عالم بہادر شاہ (اول) کے لقب سے اپنے نام کے سکے جاری کیے اور منعم خان کو وزیر سلطنت مقرر کیا، چونکہ اس نے تخت نشینی کے کسی متوقع جنگ کے خطرے کے پیش نظر پوری پوری تیاری کر لی تھی ۔ اب تمام شمالی ہند مع دہلی اور آگرہ اور بعد میں دکن شاہ عالم کے تصرف میں تھے ۔ تاریخ نے جنگ برادران کا واقعہ ایک بار پھر دہرایا ۔ شہزادۂ معظم نے ۱۴ مارچ کو دکن میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا ۔ پھر سامو گڑھ کے قریب جاجو کے مقام پر اعظم اور معظم (شاہ عالم بہادر شاہ) کے مابین جنگ ہوئی ۔ اس میں اعظم اور اس کا بیٹا بیدار بخت مارے گئے اور معظم کا بیٹا بری طرح مجروح ہوا ۔ دکن پہنچنے کے بعد ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو شہزادۂ کام بخش سے مقابلہ ہوا جس میں شاہزادہ بری طرح زخمی ہوا ۔

حکومت مغلیہ کے لیے اب حالات ناسازگار ہو رہے تھے ۔ ادھر راجپوتانے کے راجپوتوں نے مغلیہ حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک شروع کی، ادھر بندہ بیراگی نے مسلمان دشمنی کی سازشیں شروع کر دیں ۔ انھوں نے مغلوں کی فوجوں سے جنگ بھی کی اور مسلمانوں کی بستیوں کو تباہ بھی کیا ۔ سرھند کا گورنر بندہ کی فوج سے لڑتے ہوے مارا گیا ۔ بندہ نے چار دن تک سرھند کو لوٹا، مساجد کی بے حرمتی کی، گھر جلائے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا ۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی نہ بخشا (تفصیل کے لیے رک بہ William Irwine : *Later Moghals*، ج ۱، کلکتہ، ص ۹۶) ۔ پھر اس نے جالندھر کے علاقے کا رخ کیا اور اسے بری طرح پامال کیا ۔ بندہ بیراگی اور اس کے ساتھی جس مسلمان بستی کو لوٹتے، وہاں کے مسلمانوں کو ہر طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ۔ مآثر الامراء اور سیرا لمتأخرین (مصنفۂ غلام حسین طباطبائی، ۱۸۶۶ء، ص ۳۰۴) کے اوراق ان کی درندگی اور انسانیت کش اقدامات سے بھرے پڑے ہیں ۔ جالندھر کے علاقے کی بربادی کے بعد انھوں نے بٹالے کا رخ کیا، جو مسلمانوں کا علمی مرکز چلا آتا تھا ۔ وہاں کے مکتب اور مدرسے تباہ کیے اور ظالمانہ اقدامات یہاں بھی جاری رکھے اور پھر لاہور کا رخ کیا اور شالامار سے پرے لاہور کے مضافات کو لوٹ لیا ۔

بندہ بیراگی کی وحشت اور درندگی کی وجہ سے لاہور کے آس پاس کے لوگوں نے لاہور کا رخ کیا ۔ یہاں کے لوگ عرصے سے امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اب بندہ کے متوقع حملے کی وجہ سے اہل لاہور مدافعت کی تیاریاں کرنے لگے ۔ اس وقت مغلیہ حکومت کی طرف سے سید محمد اسلم لاہور کا نائب ناظم تھا اور کاظم خان یہاں کا دیوان تھا ۔ شاہ عالم بہادر شاہ کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا، لیکن شاہی فوج کے جلد آنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے اہل لاہور نے معاملہ اپنے ہاتھوں میں لیا ۔ لاہور کے بااثر لوگوں اور منصب داروں مثلاً سعد اللہ خان علوی کے ایک رشتے دار محمد تقی، موسیٰ بیگ لوہانی، اصغر خانی نے جاں نثاران لاہور کو جمع کیا، تاجروں نے مالی امداد کی، رسد رسانی کا اہتمام ہوا اور ایک رضاکار فوج تیار ہو گئی ۔ ان کا کیمپ عیدگاہ میں قائم ہوا ۔ *Later Moghals*، ص ۱۰۳) ۔ اس تحریک میں امن پسند ہندو بھی شامل تھے، جو بندہ بیراگی کی درندگی کو نفرت سے دیکھتے تھے ۔ ان میں ایک امیر راجہ بہار مل بھی شامل تھا ۔ اس موقع پر علما نے بندہ کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا ۔ کہیں

کے لشکر کے ساتھ رضاکار فوج کا تصادم لاہور کے گرد و نواح میں بھی ہوا، لیکن لاہور پر حلمہ کرنے کی انھیں جرأت نہ ہوئی ۔ کچھ عرصے بعد بہادر شاہ خود بھی فوج لیے ہوے لاہور آ گیا ۔ اگرچہ وہ بیمار تھا تاہم اس کی زندگی میں لاہور میں کسی حملہ آور کو قدم بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا ۔ لاہور سے باہر بھی بندہ کے لشکر نے متعدد جگھوں پر شکست کھائی اور راہ فرار اختیار کی.

جنگ برداران کا خونین منظر : یہ منظر ملک اور قوم نے لاہور میں دیکھا ۔ بہادر شاہ اول کے قیام لاہور میں جب اس کی صحت روز بروز گرتی جارھی تھی، اس کے بیٹے جہاندار شاہ، عظیم الشان رفیع الشان اور جہانشاہ تخت و تاج حاصل کرنے کی تیاریاں کرنے لگے تھے ۔ بہادر شاہ کی وفات (۲۷ فروری ۱۷۱۲ء) پر ذوالفقار خان وزیر مملکت نے عظیم الشان کی بے اعتنائی کے سبب باقی تین شہزادوں کو اس کے خلاف منظم کر دیا (*Later Moghals*، ج ۱، ص ۱۶۰) ۔ تینوں نے اپنے بڑے بھائی جہاندار شاہ کے خلاف متحدہ طور پر جنگ کرنے کا معاہدہ کر لیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ مملکت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے گا (وھی مصنف، ص ۱۶۱) ۔ تینوں نے متحدہ قوتوں کو جمع کیا، جہاندار شاہ کے خلاف شبخوں بھی مارے گئے، تفنگوں اور توپوں سے بھی جنگ ھوئی اور دست بدست بھی ۔ یہ خونین کھیل چھے دن جاری رھا اور زمین لاہور مغلیہ فوج کے خون سے لالہ زار بنی ۔ عظیم الشان جہانشاہ اور رفیع الشان یکے بعد دیگرے مارے گئے ۔ آخر جہاندار شاہ کی فتح کا نقارہ بجا، فاتحانہ تقریب کے لیے خیمے نصب کیے گئے اور مجمع کثیر میں جہاندار شاہ کی بادشاھت کا اعلان ھوا اور اس نے ابوالفتح محمد معزالدین کا لقب اختیار کیا ۔ بہادر شاہ کے زمانے کے عہدیدار اپنے اپنے منصب پر برقرار رھے اور جو امرا دوسرے شہزادوں سے غداری کر کے جہاندار شاہ سے آ ملے تھے، اعلٰی عہدوں پر سرفراز کیے گئے، انعام و اکرام بھی ملے ۔ زبردست خاں (علی مردان خاں) کو ناظم لاہور مقرر کیا گیا ۔ آخر جہاندار شاہ نے یکم مئی ۱۷۱۲ء کو لاہور سے دہلی کا رخ کیا ۔ زبردست خان کی وفات پر عبدالصمد خان کو ۲۲ فروری ۱۷۱۳ء کو ناظم لاہور مقرر کیا گیا جو عالمگیر کے زمانے میں دکن میں اپنی گرانقدر خدمات سے نام پیدا کر چکا تھا.

عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے جو حاکم بنگالہ تھا، جبونہیں بہادر شاہ کی وفات کی خبر سنی ۱۳ مارچ ۱۷۱۲ء کو اپنے باپ کی بادشاھت کا اعلان کر دیا، اس کے نام کے سکّے جاری کیے اور اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھوا دیا ۔ ۶ اپریل کو اسے اپنے والد کی شکست اور انتقال کی خبر ملی تو وہ خود اپنی بادشاھت کے لیے حالات سازگار کرنے لگا.

جہاندار شاہ کے کسی آدمی کو بھی یہ توقع نہ تھی کہ برسات کے موسم میں فرخ سیر دریاے جمنا کو آسانی سے عبور کر لے گا، لیکن وہ بادشاھت کے دعوے کے ساتھ اپنی فوج لیے آ پہنچا.

آگرے میں بہت خون ریز جنگ ھوئی جو نئی دن جاری رھی ۔ آخر فرخ سیر کو فتح حاصل ھوئی اور جہاندار شاہ نے لال کنور کے ساتھ دہلی کا رخ کیا ۔ ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو وہ دہلی پہنچ گئے ۔ یہاں ذوالفقار خان جس نے تین بھائیوں کو جہاندار شاہ کے خلاف متحد و منظم کیا تھا اور بعض دوسرے با اثر منصب داروں نے جہاندار شاہ کو وفاداری کے گمراہ کن پیغامات بھیجے تھے، بالآخر اسے اسیر کر کے زندان میں ڈال دیا گیا ۔ ۱۹ جنوری ۱۷۱۳ء کو جامع مسجد دہلی میں نئے بادشاہ فرخ سیر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا .

فرخ سیر کے عہد کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے ۔ پہلے اس نے جہاندار شاہ کو مروایا، پھر ذوالفقار کو، اسی طرح شاہزادگان کو سخت اذیت دی، (دیکھیے سید محمد لطیف : *History of the Punjab*، لاہور، ص ۱۸۷)۔

اس عرصے میں سکھوں کی سرکشی میں اضافہ ہوا ۔ پہاڑوں کی پناہ گاہوں سے نکل کر جگہ جگہ تباہی مچانے لگے ۔ ستلج اور لاہور کا درمیانی علاقہ انھوں نے پامال کیا ۔ عبدالصمد دلیر جنگ ناظم لاہور نے قمر الدین خان، محمد امین خان اور اصغر خان کو ساتھ لے کر سکھوں کے خلاف لشکر کشی کی ۔ اس موقع پر فرخ سیر بھی کثیر تعداد میں لشکر لیے ہوے پنجاب کی طرف آیا ۔ سکھوں کے گروہ محصور ہو گئے ۔ بالآخر انھوں نے ہتیار ڈال دیے ۔ بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے دہلی بھجوایا گیا، جہاں وہ اپنے انجام کو پہنچا (کتاب مذکور، ص ۱۸۸)۔

فرخ سیر کا عرصۂ حکومت ۱۹ جنوری ۱۷۱۳ء تا ۲۹ فروری ۱۷۱۹ء ہے ۔ اس عرصے میں امرا نے اپنی طاقت بڑھا لی اور اپنے اپنے مفاد کے لیے جد و جہد کرنے لگے ۔ سید بھائی جو تاریخ میں بادشاہ گر مشہور ہوے، فرخ سیر کے لیے پریشانی کا موجب بن گئے ۔ آخر حالات اس قدر برگشتہ ہوے کہ مخالفین کے ہاتھوں وہ گرفتار ہو گیا ۔ (ولیم اروِن : *Later Moghals*، ص ۳۹۲)۔

فرخ سیر کے عبرت ناک انجام کے بعد بادشاہ گر سید بھائیوں کا زور اور بڑھ گیا ۔ ایک ہی سال میں انھوں نے رفیع الشان کے دو بیٹوں رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو یکے بعد دیگرے تخت نشین کیا ۔ اس سال بہادر شاہ اول کے بھتیجے نکوسیر نے بادشاہت کا اعلان کیا، لیکن ان تینوں کی حکومت ۱۷۱۹ء سے آگے نہ بڑھ سکی ۔

محمد شاہ کا عہد حکومت : ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو سید بھائیوں نے جہانشاہ کے بیٹے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کیا ۔ اس کا عرصۂ حکومت ۲۶ سال ہے ۔

جیسے کہ پہلے ذکر ہوا لاہور کا ناظم عبدالصمد دلیر جنگ تھا جو ۱۷۲۶ء تک اس منصب پر فائز رہا، اس کے بعد اس کا بیٹا زکریا خان ناظم لاہور ہوا ۔ ان دونوں کو داخلی امور حکومت میں کامل اختیار حاصل رہا تھا ۔ ان کے دور میں لاہور میں امن و امان رہا ۔ کچھ تعمیرات کی طرف بھی توجہ ہوئی ۔ محلہ بیگم پورہ جو انجینئیرنگ یونیورسٹی کے عقب میں ہے، عبدالصمد کی بیوی بیگم جان نے آباد کیا تھا ۔ کچھ محلات بھی ان کی یادگار تھے ۔ عبدالصمد اور زکریا خان دونوں لاہور میں فوت ہوے اور بیگم پورے میں دفن ہوے ۔

حملۂ نادر شاہ افشار پر لاہور محفوظ رہا ۔ ۱۷۲۸ء میں نادر شاہ نے ہندوستان کا رُخ کیا ۔ اس کا پہلا نشانہ کابل تھا ۔ کابل کے حکمران نے مرکزی حکومت کو صورت حال سے آگاہ کیا، لیکن ارباب اقتدار نے کوئی توجہ نہ کی ۔ نادر شاہ نے صوبۂ کابل کو فتح کر کے دریاے اٹک کو عبور کیا اور حدود لاہور میں داخل ہو گیا ۔ اس کی متوقع آمد سے پہلے زکریا خان نے بھی مرکزی حکومت کو آگاہ کیا لیکن اس کی عرضداشت پر کوئی قدم نہ اٹھایا گیا ۔ اس عرصے میں زکریا خاں نے حتی الوسع مدافعت کی تیاریاں تو کرلیں لیکن یہ محسوس کیا کہ عساکر شاہی کی مدد کے بغیر وہ لاہور کو نہیں بچا سکے گا؛ چنانچہ اس نے مدافعت کے بجاے مصالحت کی طرف قدم بڑھایا اور صلح کی درخواست کی، جو نادر شاہ نے قبول کر لی ۔ زکریا خود بھی نادر شاہ سے ملا اور تیس لاکھ روپے نذرانے کے طور پر پیش کیے جو نادر شاہ نے قبول کر لیے اور لاہور کو ایذا

پہنچائے بغیر دہلی کی طرف روانہ ہوگیا ۔ زکریا خان کے دور نظامت میں بااثر زمینداروں نے بغاوتیں کیں، لیکن اس نے اپنے تدبر سے انھیں فرو کر دیا۔

زکریا خان اپنے تدبّر اور انصاف پسندی کی وجہ سے مقبول عوام تھا؛ چنانچہ اس کی وفات (یکم جولائی ۱۷۴۵ء) پر بلا امتیاز مذہب و ملّت سب نے اس کی آخری آرام گاہ پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے ۔ اس کی ایک یہ نمایاں یادگار بھی باقی ہے کہ اس نے خواجہ خاوند محمود [رکِ باں] کے مقبرے کا بلند و بالا برج تعمیر کرایا تھا۔

زکریا کی وفات کے بعد کچھ سیاسی انتشار پیدا ہو گیا ۔ اس کے تین بیٹے تھے ۔ یحیی خان، شاہنواز خان اور میر باقی ۔ یحیی خان کے ماموں اور خسر میر قمرالدین وزیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ یحیی خان کو ناظم لاہور مقرر کر دیا جائے ۔ آخر وہ اپنی خواہش میں کامیاب ہوا اور یحیی خان ناظم لاہور مقرر ہو گیا ۔ یحیی خان اور شاہنواز کے مابین باپ کے ترکے کے مسئلے پر ۱۷ مارچ ۱۷۴۶ء کو جنگ ہوئی جس میں آدینہ بیگ نے شاہنواز کا ساتھ دیا ۔ آخر جنگ کا فیصلہ شاہنواز کے حق میں ہوا اور یحیی خان بھاگ کر دہلی پہنچ گیا ۔

آدینہ بیگ سازش پسند شخص تھا، اس نے شاہنواز خان کو مشورہ دیا کہ وہ کسی متوقع حملے کے پیش نظر قندھار کے فرمانروا احمد شاہ درّانی سے مدد حاصل کرے ۔ شاہنواز نے اپنا سفیر احمد شاہ کے پاس بھیجا اور آپس کے معاہدے کی شرائط طے ہو گئیں ۔ یہ صورت حال میر قمرالدین کو معلوم ہوئی تو اس نے اپنے بھانجے شاہنواز کو خط بھیج کر واضح کیا کہ ہمارا خاندان حکومت مغلیہ کا ہمیشہ سے وفادار رہا ہے، اب اگر تم بے وفائی کرو گے تو یہ ہمارے لیے باعث ننگ ہوگا ۔ ماموں کے کہنے کا شاہنواز پر اثر ہوا اور اس نے احمد شاہ کو آنے سے روک دیا، حالانکہ وہ خود ہی اس بات کی دعوت دے چکا تھا۔

احمد شاہ درانی کا حملہ : احمد شاہ، شاہنواز کی ذہنی تبدیلی کی وجہ سے سخت برہم ہوا اور اسے عہد شکنی کی سزا دینے کے لیے لاہور پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ۔ ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو وہ شاہدرہ پہنچا ۔ شاہنواز نے بھی مقابلے کی تیاری کی ۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، لیکن شاہنواز نے شکست کھائی اور خزانے کا بہت سا روپیہ لے کر دہلی کو روانہ ہو گیا ۔ ۱۲ جنوری ۱۷۴۸ء کو احمد شاہ بیگم پورہ میں داخل ہوا، یہاں لوٹ مار اور قتل عام کیا ۔ آخر اکابر لاہور احمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوے اور تیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا اور قتل و غارت کا سلسلہ بند ہوا۔

احمد شاہ درانی نے اپنی طرف سے افغان سردار جملہ خان کو لاہور کا ناظم مقرر کیا اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا ۔ سرہند کے قریب احمد شاہ کا مقابلہ وزیر قمر الدین کے بیٹے میر معین الملک خان سے ہوا جس میں احمد شاہ کو شکست ہوئی اور لاہور پہنچ کر کابل واپسی اختیار کی ۔ سرہند میں فتح پانے کے صلے میں میر معین کو جو میر منو کے نام سے مشہور ہوا، لاہور کا ناظم مقرر کیا گیا۔

میر منو کی نظامت کے عرصے میں لاہور پر تین حملے ہوے ۔ سرہند کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے احمد شاہ نے دسمبر ۱۷۴۹ء میں دریاے سندھ عبور کیا اور دریاے چناب کے کنارے خیمہ زن ہوا میر منو بھی اس کا راستہ روکنے کے لیے چناب کے کنارے آیا ۔ دونوں کے مابین گفت و شنید ہوئی ۔ احمد شاہ کا مطالبہ تھا کہ اسے چار محال کا مالیہ سالانہ ادا کیا جائے ۔ میر منو نے گفتگو کو اس لیے طول دیا کہ باشاہ دہلی کی خدمت میں فوجی مدد کے

لیے درخواست کرے ۔ فوجی امداد کے بجاے یہ جواب آیا کہ چار محال کا مالیہ ادا کرنے کی شرط پر مصالحت کر لی جائے، چنانچہ احمد شاہ درانی سے صلح نامہ طے ہو گیا۔

چار محال کا مالیہ حسب معاهدہ احمد شاہ کو نہ بھیجا جا سکا تو وہ نیاز بیگ کے راستے سے لاهور آ پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا ۔ دہلی سے کوئی امداد نہ پہنچ سکی تھی ۔ میر منو کی فوجیں باهر نکلیں تو احمد شاہ نے ان پر حملہ کر دیا ۔ میر منو کچھ ایسی بہادری سے لڑا کہ احمد شاہ اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا ۔ احمد شاہ کو فتح تو ہوئی لیکن اس نے اپنی طرف سے میر منو ھی کو لاهور کا ناظم مقرر کر دیا ۔ اس کی نظامت کا آخری دور سکھوں کی تادیب میں صرف ہوا ۔ اس کی وفات ۱۷۵۳ء میں ہوئی ۔ کہا جاتا ھے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔

میر منو کے بعد اس کی بیگم مغلانی بیگم نے سرکار دہلی سے اپنے دوسالہ بیٹے محمد امین خان کو ناظم لاهور کا نائب مقرر کرا لیا اور لطف کی بات یہ کہ ناظم لاهور محمود خان کی عمر بھی تین سال تھی ۔ امور سلطنت کا انتظام میر مؤمن خان کے سپرد تھا لیکن دراصل حکومت کی باگ دوڑ مغلانی بیگم کے ھاتھوں میں تھی ۔ اس انتشار اور بد امنی کے دور میں زکریا خان کے چھوٹے بھائی خواجہ عبداللہ نے اپنے پیادوں اور سواروں کی مدد سے لاهور کی نظامت پر قبضہ کر لیا۔

آدینہ بیگ کا لاهور پر قبضہ : آدینہ بیگ کا تعلق لاهور سے میر منو کی وفات کے بعد کٹ گیا ۔ اب وہ دوآبۂ جالندھر کا خود مختار حاکم بن گیا تھا ۔ لاهور کی بد امنی سے اسے حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کا موقع ملا اور اس نے لاهور پر لشکر کشی کر دی ۔ خواجہ عبداللہ شکست کھا کر سندھ کی طرف فرار کر گیا اور آدینہ بیگ شہر پر قابض ہو گیا ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد صادق بیگ کو اپنا نائب مقرر کر کے خود جالندھر چلا گیا، اس کے بعد احمد شاہ درانی کے پے بہ پے حملے سکھوں پر ہوتے رہے اور لاهور بھی ان حملوں کی آماجگاہ بنا ۔ انگریزوں کے عہد میں لاهور میں امن و امان رہا۔

لاهور کی بعض مساجد : لاهور کی قدیمی مساجد وغیرہ کا ذکر مقالۂ بالا میں آ چکا ھے ۔ مناسب معلوم ہوتا ھے کہ بعض ایسی مساجد کا بھی ذکر کر دیا جائے جو موجودہ زمانے میں حکومت کی سرپرستی کے بغیر تعمیر ہوئیں۔

مسجد شہید : شاہ عالمی دروازے کے باهر سرکلر روڈ کے چوک کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد دو منزلہ عمارت میں ھے جس کے نیچے دکانیں ھیں، یہاں کبھی ایک چبوترا تھا، جس پر لوگ نماز ادا کیا کرتے تھے ۔ اس کے قریب ھی ھندوؤں نے مندر تعمیر کر لیا ۔ مسلمانوں نے چاھا کہ چبوترے کی جگہ پختہ مسجد تعمیر کر لیں، لیکن انگریزی حکومت نے ھند و مسلم مناقشت کے پیش نظر مسجد بنانے کی اجازت نہ دی ۔ اس پر پرجوش مسلمانوں نے راتوں رات مسجد کی تعمیر مکمل کر دی ۔ علامہ اقبال نے اس واقعے سے متأثر ھو کر ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ھے :

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ھے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ مسجد ایک شہری جھگڑے کی وجہ سے میونسپلٹی کی اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی تھی، اس لیے انگریزی حکومت نے منہدم کرا دی ۔ آخر ۱۹۳۴ء میں باقاعدہ منظوری حاصل کرنے کے بعد انجمن اسلامیہ لاهور نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔

مسلم مسجد : یہ خوبصورت اور وسیع مسجد انارکلی کے پرھجوم چوک میں واقع ھے ۔ ۱۹۲۵ء میں انجمن خادم المسلمین نے اس مسجد کا انتظام

سنبھالا ۔ تبلیغ و درس کا کام مولانا محمد بخش مسلم نے اپنے ذمے لیا ۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے ہر جمعے کو لوگ بہ تعداد کثیر ادائے نماز کے لیے جمع ہونے لگے، انھیں کی وجہ سے یہ ''مسلم مسجد'' کے نام سے موسوم ہوئی ۔ مسجد کی کرسی زمین سے ایک منزل بلند ہے ۔

مسجد شہدا : ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جو فوجی جوان اور افسر شہید ہوے، ان کی یاد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی، اس کے لیے زمین لاہور کارپوریشن نے دی ۔ مسجد شہدا شاہراہ قائد اعظم پر ہے ۔ اس مسجد کو ایک انفرادیت حاصل ہے ۔ یہ مستطیل یا مربع ہونے کے بجاے گول ہے اور ساری کی ساری گنبد کے نیچے ہے جو قدیم روایت تعمیر مساجد سے الگ ہے ۔ اس کے مغرب کی طرف نئی طرز کا منارہ بھی ہے جو باقی مسجدوں کے میناروں سے مختلف ہے ۔ ۱۹۷۷ء کی عوامی جمہوری تحریک میں یہ مسجد سیاسی تحریک کا مرکز بنی رہی ۔

اولیا کے مزارات : قدیم زمانے سے لاہور کو دینی، فکری، ثقافتی اعتبار سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اس لیے اولیاء اللہ اپنے خلفاے حق آگاہ اور مریدان با صفا تبلیغ اسلام کے لیے یہاں بھیجتے رہے ۔ یہاں وہ عمر بھر تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرتے رہے اور یہیں واصل بحق ہوے ۔

مقبرۂ حضرت علی ہجویری المشہور بہ دربار داتا گنج بخش : حضرت علی ہجویری [رک بہ داتا گنج بخش] کا مزار مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے تعمیر کرایا تھا ۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے حضرت علی ہجویری کے مزار کے قریب ایک ٹیلے پر اور حضرت معین الدین چشتیؒ [رک بآں] نے ان کے مزار پر چلہ کشی کی ۔ مزار بھاٹی دروازے سے باہر، مغربی سمت کو جانے والے بازار کے دائیں کنارے ایک بلند خشتی چبوترے پر واقع ہے ۔

احاطۂ مزار کے اندر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حجرۂ اعتکاف اور مسجد کے علاوہ کچھ قبریں بھی ہیں ۔ مزار کی مرمت مختلف وقتوں میں ہوتی رہی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ صرف اس کی مرمت کرائی بلکہ ہر سال وہ عرس کے موقع پر ایک ہزار روپے بھی نذر کرتا تھا ۔

دربار داتا گنج بخش ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء سے محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہے ۔ محکمۂ اوقاف کے زیر انتظام اسے نئی صورت دی گئی ہے ۔ صدر دروازہ پر چاندی کا دروازہ نصب کیا گیا ہے جو اصفہان سے بن کر آیا ۔

قیام پاکستان کے بعد داتا گنج بخشؒ کے نام پر محکمۂ اوقاف نے ''داتا دربار'' ہسپتال قائم کیا ہے ۔ یہاں غربا کو مفت طبی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ بھی اوقاف کی نگرانی میں خیراتی ادارے قائم ہوے ۔

مقبرۂ شاہ حسین : شاہ حسین ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء میں فوت ہوے [رک بہ مادھو لال حسین] ۔ انھیں پہلے شاہدرہ کی مشرقی سمت میں دفن کیا گیا، لیکن خود ہی اپنی زندگی میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ دریاے راوی تو ہماری قبر کو بارہ سال بعد گرا دے گا 'اس خیال سے کسی نے ان کی پختہ قبر نہ بنوائی' نہ مقبرہ ہی تعمیر کرایا، بہر حال کچھ عرصے بعد ان کی میت کا صندوق ''بابو پورہ'' میں وہاں لے آئے، جہاں اب ان کا مقبرہ ہے اور وہاں سپرد خاک کیے گئے (تحقیقات چشتی مطبوعۂ پنجابی ادبی اکادمی، ص ۱۱۸۲) معزالدین بن جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء) کی خواہش پر حضرت بلاول نے حضرت کا مقبرہ اپنی رہنمائی میں تیار کرا دیا ۔ دربار مادھو لال حسین کے گرد و نواح میں چاروں دیواریں پختہ ہیں ۔ دربار کی ڈیوڑھی مغربی

سمت میں ہے ۔ دربار کے چار دروازے ہیں، ایک دروازہ ڈیوڑھی دلاں میں ہے ۔ جو مغربی سمت میں ہے، دوسرا دروازہ جنوبی سمت میں اور ایک مشرقی سمت میں ہے، اسے بہشتی دروازہ کہتے ہیں، ایک اور دروازہ بطرف شمال ہے ۔ دروازۂ دلاں سے آمد و رفت ہوتی ہے ۔ احاطے کے درمیان میں اونچے چبوترے پر قبر کے تعویذ ہیں ۔ نواب زکریا خان نے مقبرے کی مغربی سمت میں مسجد تعمیر کرائی جو اب بھی موجود ہے ۔

ان کا عرس مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا ہے اس وقت مزار اور اس کے احاطے میں چراغ جلائے جاتے ہیں ۔ اس بنا پر عوام عرس کو ''میلۂ چراغاں'' کہتے ہیں ۔ چراغاں کا منظر دیکھنے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد لوگ شالا مار باغ بھی جاتے ہیں ۔ اس نسبت سے اس عرس کو اور اس چراغوں کے میلے کو لوگ شالا مار کا میلا بھی کہ دیتے ہیں ۔

مقبرۂ میراں سید محمد شاہ بن سید صفی الدین المشہور بہ موج دریا بخاری : حضرت میراں، سید محمد ۹۴۰ھ / ۱۵۳۳ء میں اچ میراں سے لاہور آئے اور یہیں مرکز تبلیغ قائم کیا ۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کو ان سے عقیدت تھی ۔ اقبال نامۂ اکبری میں اکبر کی مہم چتوڑ کے تفصیلی حالات کے سلسلے میں (دیکھیے ص ۱۶۵ تا ۱۶۷) میراں سید محمد شاہ کی دعا کا ذکر آیا ہے ۔ اکبر نے انھیں نو لاکھ روپے کی جاگیر بٹالے وغیرہ مقامات میں دی تھی (نور احمد : تحقیقات چشتی، مطبوعۂ پنجابی ادبی اکیڈمی، ص ۲۵۴) یہ جاگیر انھوں نے تبلیغ اسلام کی غرض سے قبول کر لی اور اسی غرض سے اسے صرف کیا ۔ ان کے ضعیفی کے زمانے میں اکبر نے ان کے لیے ایک مقبرہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء میں تیار کرایا تھا ۔ میراں سید محمد ۱۷ ماہ ربیع الاول ۱۰۱۳ھ میں فوت ہوے اور اکبر کے بنائے ہوے مقبرے میں آسودۂ خاک ہوے ۔

شاہراہ قائد اعظم پر واقع جنرل پوسٹ آفس کے پاس سے اکاؤنٹنٹ جنرل کے نئے دفتر کی طرف آئیں تو دائیں طرف ایک گلی ہے ۔ گلی کی محراب جس پر ان کا نام ثبت ہے، مزار کی طرف رہنمائی کرتی ہے ۔ گلی میں کچھ فاصلے پر دائیں طرف کو احاطۂ مزار شروع ہوتا ہے ۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف مڑیں تو سامنے ایک مسجد ہے ۔ مسجد کے ساتھ حضرت میراں سید محمد کا مزار ہے ۔

حضرت شاہ خیر الدین ابو المعالی قادری المتخلص بہ غربتی : ان کی ولادت بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۹۶۰ھ کو ہوئی ۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں ہوے ہیں اور حضرت میاں میر کے ہم عصر تھے ۔ ان کی وفات ۱۶ ماہ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں ہوئی ۔

مقبرۂ حضرت شاہ ابوالمعالی : ان کے کی نسبت سے چوک شاہ ابوالمعالی میں واقع ہے ۔ عرف عام میں یہ جگہ ''شبدر مالی یا شربت مالی'' کہلاتی ہے ۔ مقبرے کے گنبد کی وضع ہشت گوشہ ہے ۔ یہ مقبرہ حضرت ابوالمعالی نے اپنی زندگی میں شروع کروایا تھا، لیکن مکمل نہیں ہوا تھا کہ وفات پا گئے اور تکمیل اس کی بعد میں ہوئی (تحقیقات چشتی، ص ۱۱۲۱) ۔

مقبرۂ شاہ ابوالمعالی کی آمد و رفت کا دروازہ جنوبی سمت کو ہے ۔ ایک دروازہ شمالی سمت کو بھی ہے ۔ جنوبی سمت کے دروازے کے اوپر قرآن مجید کی آیات نقش کی گئی ہیں ۔ یہ مقبرہ ایک چبوترے پر ہے ۔ مقبرے کی مغربی سمت میں ایک مسجد ہے جو اپنی ابتدائی صورت میں خود انھوں نے بنوائی تھی ۔ مزار کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے جو اندر کی طرف سے سنگ سیاہ کے حاشیوں سے مزین ہے اور اب بھی مغل دور کی

صنعت و نقاشی کا پتا دیتا ہے۔ دروازے کی پیشانی پر زرد رنگ میں ایک پتھر پر یہ عبارت ثبت ہے ''روضۂ مقدس زبدۃ الواصلین، قدوۃ العارفین، مقبول بارگاہ باری تعالٰی، میراں سید محمد شاہ موج دریا بخاری نوّر اللہ مرقدہ۔ در عہد اکبر بادشاہ تعمیر یافت''

میراں سید محمد شاہ کا عرس ۱۷ ربیع الآخر کو ہوتا ہے۔

مقبرۂ سید شیخ عزیز الدین، پیر مکّی: مصنف خزینۃ الاصفیا نے حضرت پیر مکی کا نام سید شیخ عزیز الدین لکھا ہے، لیکن تاریخ لاہور میں ان کا نام سید جلال الدین درج ہے (تاریخ لاہور، ص ۳۲) ۔ صاحب خزینہ کی رو سے ان کا سال وفات ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء ہے۔

کنہیّا لال ہندی، صاحب تاریخ لاہور لکھتے ہیں کہ پیر مکی مکۂ معظمہ سے وارد ہوے اور لاہور میں استقامت اختیار کی۔

صاحب خزینہ کے مطابق انہوں نے ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء میں وفات پائی ۔ ان کا مزار بیرون بھاٹی دروازہ راوی روڈ پر جاتے ہوے تھوڑے ہی فاصلے پر بائیں جانب ایک گلی میں واقع ہے۔ مزار کی نسبت سے یہ علاقہ محلۂ پیر مکی کے نام سے موسوم ہے۔

مقبرۂ حضرت میاں میر: دارا شکوہ کے مطابق حضرت میاں میر ۶۰ برس لاہور میں رہے اور یہیں ربیع الاول ۱۰۴۵ھ میں ان کی وفات ہوئی ۔ مزار کے دروازے پر ملا فتح اللہ کا قطعہ درج ہے ۔ جس کے آخری مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

بفردوس والا میاں میر شد

۱۰۴۵ھ

مقبرے کی تعمیر کا آغاز حضرت میاں میر کے عقیدت مند شاہزادۂ دارا شکوہ نے کیا تھا ۔ اس کے لیے وافر مقدار میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر فراہم کیا ۔ مقبرے کی چار دیواری قد آدم تک تعمیر ہوئی تو شاہزادہ قتل ہو گیا ۔ ایک سال تک تعمیر رکی رہی، آخر اورنگ زیب عالمگیر نے مقبرے کے گنبد کی تعمیر کروائی اور مقبرہ تکمیل تک پہنچا ۔ نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ آمد و رفت کے دروازے کے طاق کا تختہ برنگ سبز اور باہر اس کے زینہ سنگ سرخ کا ہے ۔ عمارت کی کیفیت یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی سمت میں پانچ محرابیں تعمیر کی گئی ہیں ۔ اس چار دیواری کی تمام عمارت ایسی ہی محرابوں سے تیار ہوئی ہے۔ چار دیواری کا ارتفاع تخمیناً پانچ گز ہے ۔ مغربی سمت ایک عالی شان دالان ہے جس کی شمالی سمت میں چھے اور مشرقی سمت میں ایک محراب دار دروازہ ہے ۔ فرش سنگ سرخ کا ہے (دیکھیے تحقیقات چشتی) : صدر دروازے کے ساتھ کے کمروں میں محکمۂ اوقاف نے دارالمطالعہ قائم کیا ہے اور مقبرے کا انصرام بھی بعض دوسرے مقابر کی طرح محکمۂ اوقاف ہی کرتا ہے۔

مقبرۂ حضرت خاوند محمود المشہور ''بحضرت ایشان'' : [رک بہ ایشان] انہوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کرنے کے بعد لاہور کی مشرقی سمت بیگم پورہ میں قیام کیا ۔ یہیں بقول مفتی غلام سرور ۱۲ شعبان ۱۰۵۲ء میں وفات پائی۔

مقبرۂ حضرت ایشان بیگم پورہ میں ہے ۔ یہ مقبرہ لاہور کے تمام مقبروں سے بلند اور بڑا ہے ۔ مقبرے کے ہشت پہلوؤں پر استر کاری ہوئی ہے ۔ آمد و رفت کا دروازہ مغربی سمت کو ہے ۔

مقبرے کے اندر فرش چونے گچ کا ہے اور چاروں طرف محرابیں ہیں ۔ گنبد اندر سے تمام منقش اور رنگین ہے اور گلکاری سے آراستہ ہے۔ درمیان میں ایک بلند چبوترے پر حضرت ایشان کی قبر ہے ۔ چبوترے کی زیریں سطح پر جنوب مشرقی گوشے میں ایک اور پختہ مقبرہ ان کے صاحبزادے بہاء الدین

کا ہے۔

مقبرۂ حضرت شاہ چراغ، عبدالرزاق گیلانی: سادات گیلان سے تھے۔ ان کے جد امجد محمد غوث ست گھرا (ساہیوال) سے لاہور آئے اور شہر سے باہر جنوب مشرقی سمت اقامت اختیار کی۔

حضرت عبدالرزاق کی ولادت پر ان کے دادا عبدالقادر ثالث نے کہا کہ یہ ہمارے خاندان کا چراغ ہوگا۔ اس سے وہ ''شاہ چراغ'' کے لقب سے مشہور ہوے۔ ان کی وفات ۲۲ ذی القعدہ ۱۰۶۸ھ کو ہوئی۔ مزار ان کا عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے تعمیر ہوا (تاریخ لاہور: ۲۸۳)۔

مقبرۂ شاہ چراغ اس سڑک پر واقع ہے جو شاہراہ قائد اعظم پر واقع جنرل پوسٹ آفس کے عقب سے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر کی طرف جاتی ہے۔ اس مقبرے کے برج کا رنگ سبز ہے۔ یہ ہشت گوشہ ہے اور ہر گوشے میں محراب ہے۔ آمد و رفت کا دروازہ جنوبی سمت میں ہے۔ مزار کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے۔ گنبد کے اوپر کا حصہ نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ مقبرے سے ملحق ایک مسجد ہے جو شاہ چراغ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقبرہ اور مسجد اوقاف کے زیر اہتمام ہیں۔ اس سے ملحق عمارات میں اوقاف کا دفتر ہے۔ مسجد ایک اہم دینی اور تعلیمی مرکز بھی ہے۔

مزار حضرت ملا شاہ بدخشی: حضرت ملا شاہ بدخشان کے شہر روستاق کے رہنے والے تھے۔ بدخشان سے چل کر کشمیر آئے اور پھر تلاش مرشد انہیں لاہور لے آئی۔ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ملا شاہ کی وفات ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۹ء میں ہوئی ملا شاہ بدخشی کی خانقاہ تو کشمیر میں ہے، لیکن ان کا مقبرہ حضرت میاں میر کے مقبرے کے جنوب مغربی گوشے میں ہے۔ مقبرے کی تعمیر ان کے مرید دارا شکوہ ہی نے قیمتی پتھروں سے کروائی تھی۔ سکینۃ الاولیا میں اس نے ملا شاہ کا مفصل حال قلمبند کیا ہے (دیکھیے مقبول بیگ بدخشانی: سکینۃ الاولیا، اردو میں مطبوعۂ پیکیجز لمیٹڈ)۔

مزار حضرت محمد اسمٰعیل المشہور بہ میاں وڈا: (ولادت ۹۹۵ھ / ۱۵۸۶ء) سہروردیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام فتح اللہ تھا۔ آباو اجداد پوٹھوہار کے علاقے میں موضع ترکران میں رہتے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ زراعت تھا۔

حضرت میاں وڈا ۱۰۳۸ء میں لاہور آئے اور مشرقی سمت مقام تیل پورے میں اقامت اختیار کی۔ تاریخ وفات ۵ شوال ۱۰۸۵ھ برنگ کانسی خانقاہ کے جنوبی دروازے پر نقش ہے۔ مقبرے کے گرد و نواح میں چاروں طرف خشتی پختہ دیواریں ہیں۔ آمد و رفت شمالی دروازے سے ہوتی ہے۔ اس راستے پر سجادہ نشین کے کمرے ہیں۔ بائیں طرف کو مسجد ہے۔ یہاں میاں وڈا درس دیتے تھے۔ اس کے بالمقابل ایک چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

عالمگیر اورنگ زیب نے ان کا فیضان عام دیکھ کر سات مزروعہ کنویں جو مسجد کے گرد و نواح میں تھے لنگر اور درویشوں کے اخراجات کے لیے معافی میں دے دیے تھے۔ لنگر بدستور جاری ہے اور درس کا سلسلہ بدستور قائم۔ اب یہ مزار محکمۂ اوقاف کے زیر اہتمام ہے۔

مقبرۂ گھوڑے شاہ: ان کا اصل نام جھولن شاہ ہے۔ لقب گھوڑے شاہ کی وجہ یہ تھی کہ انہیں گھوڑوں کا بہت شوق تھا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اکثر شہر میں آیا کرتے تھے۔ اس لقب کی وجہ سے انہیں ایسی شہرت ہوئی کہ لوگ اصل نام بھول گئے اور گھوڑے شاہ زبانوں پر آ گیا۔ ان کی وفات

۱۱۴۶ھ کو ہوئی ۔ ان کے نام کی نسبت سے آس پاس کا علاقہ گھوڑے شاہ ہی کے نام سے موسوم ہے ۔

گھوڑے شاہ کا مزار ایک تین زینہ بلند چبوترے پر واقع ہے ۔ نہ آمد و رفت کے لیے دوئی خاص دروازہ ہے، نہ اس پر دوئی برج ہے ۔ مقبرے کی شمالی اور مشرقی دیوار موجود ہے ۔ جنوب مغربی دیوار مسمار ہو چکی ہے ۔

مزار کے شمالی طرف مسجد گھوڑے شاہ ہے ۔

مزار پر اکثر عقیدت مند آتے ہیں اور مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے نذر کے طور پر لاتے ہیں ۔ مزار کے ارد گرد ایسے ہی گھوڑوں کے انبار لگے رہتے ہیں ۔

مقبرۂ شاہ حسین زنجانی: شاہ حسین زنجانی، حضرت علی ہجویری کے پیر بھائی تھے (زلف ۱۱، ج ۹، ص ۹۲) حضرت علی ہجویری جس دن لاہور آئے، اس دن شاہ حسین زنجانی کا انتقال ہوا ۔ ان کا مزار چاہ میراں میں ہے، جسے عرف عام میں ''میراں دی کھوہی'' کہا جاتا ہے ۔ مزار ایک طویل و عریض باغ میں ہے، جسے سکھوں نے لگایا تھا ۔ اب یہ مزار ایک قد آدم خشتی چار دیواری کے اندر ہے ۔ مزار کا دروازہ مشرق کی طرف ہے ۔ شمال کی جانب ایک خشتی دالان ہے ۔

مقبرۂ سید یعقوب زنجانی، صدر دیوان: سید یعقوب زنجانی، شاہ حسین زنجانی کے ساتھ لاہور آئے تھے ۔ ان کا مزار سرائے لالہ رتن چند اور لیڈی ویلنگٹن ہسپتال کے درمیانی علاقے میں ہے ۔

مقبرۂ شاہ عبدالجلیل ملقب بہ چوھڑ بندگی: شاہ عبدالجلیل نے چوھڑ بندگی لقب اختیار کیا ۔ اس کی وجہ تسمیہ دستگیر نامی نے یہ بتائی ہے: چوھڑ ریاست بہاولپور میں ہے، جہاں سے وہ لاہور میں رونق افروز ہوئے (دیکھیے تاریخ جلیلہ، ص ۱۰۷) اور اس علاقے میں اقامت اختیار کی جو اب قلعۂ گوجر سنگھ کہلاتا ہے ۔ ان کی وفات ماہ رجب ۹۱۰ھ/ ۸ دسمبر ۱۵۰۴ء کو ہوئی اور ان کا مقبرہ بھی قلعۂ گوجر سنگھ ہی میں ہے ۔ مقبرے کی چار دیواری کی مغربی سمت احاطے میں ایک مسجد ہے جو خود شیخ چوھڑ بندگی نے تعمیر کرائی تھی ۔

شیخ موسی آھنگر: شیخ موسی جو اپنے پیشے کی وجہ سے آھنگر کے لقب سے مشہور ہوئے، لودھی بادشاھوں کے زمانے میں ملتان سے ہوتے ہوئے لاہور آئے اور حضرت عبدالجلیل چوھڑ بندگی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے اکتساب فیض بھی کیا اور ان کے ھاتھ پر بیعت بھی کی ۔ حضرت چوھڑ بندگی نے اپنی مملوکہ زمین سے دو بیگہ زمین شیخ موسی کو دی ۔ یہیں عمر بھر رہے اور یہیں ۹۲۵ھ میں انتقال کیا (تحقیقات چشتی، ص ۱۱۰۱) ۔

شیخ موسی کا مقبرہ قلعۂ گوجر سنگھ میں میکلوڈ روڈ کے قریب واقع ہے ۔ تحقیقات چشتی کے مطابق شیخ موسی کا مقبرہ اکبر بادشاہ کی والدہ نے بنوایا تھا ۔ مقبرے کا رنگ سبز اور گنبد فیروزی کانسی کا ہے ۔ تمام عمارت خشتی ہے مگر لب بام سے ایک فٹ نیچے تک کانسی کا کام ہوا ہے ۔ اس گنبد کے گرد چار دیواری خشتی ہے ۔

لاہور ہمیشہ سے دینی تعلیم کا اہم مرکز رہا ہے ۔ یہاں اب بھی ہر مسلک کے چھوٹے بڑے دارالعلوم قائم ہیں، جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے ۔

مرکزی دارالعلوم نعمانیہ: یہ دارالعلوم اندرون ٹکسالی دروازہ واقع ہے ۔ یہ ایک قدیمی درسگاہ ہے جو مرکزی انجمن نعمانیہ کے زیر اھتمام ہے ۔ اس کی تاسیس ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی اور اس وقت سے تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے ۔ اس کے تدریسی کمرے ۵ اور برآمدے ۲ ہیں ۔ دارالاقامہ بھی ہے، جس میں ۸ کمرے ہیں ۔ کتابخانہ بھی ہے، جس میں رفتہ رفتہ کتابوں کا اضافہ ہوتا

رہا ہے، مسلک حنفی بریلوی۔

مدرسۂ قاسم العلوم: انجمن خدام الدین شیرانوالہ عرصۂ دراز سے تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، مسلک حنفی دیو بندی ہے۔

جامعۂ عربیۂ رحیمیہ: نیلا گنبد میں ہے اور اب محکمۂ اوقاف کے زیر اہتمام ہے۔ یہ بھی لاہور کی قدیمی درسگاہوں میں ہے، مسلک حنفی دیو بندی، نصاب درس نظامی رائج ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ادیب عربی، عالم عربی اور فاضل عربی کی تدریس بھی ہوتی ہے۔

مدرسۂ غوثیۂ عالیہ: اندرون شہر تکیۂ سادھواں میں ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی۔ نصاب درس نظامی رائج ہے۔

دارالعلوم حزب الاحناف: بیرون بھاٹی دروازہ لال کوٹھی میں واقع ہے۔ دارالعلوم کے بانی مولانا سید دیدار علی تھے۔ انھوں نے شروع میں تو ۱۹۲۴ء میں اس کی بنیاد اندرون دہلی دروازہ ایک چھوٹی سی مسجد میں رکھی تھی۔ چند سال سے یہ دارالعلوم لال کوٹھی میں منتقل ہو گیا ہے۔ سڑک کے کنارے وسیع مسجد ہے۔ اس کے ساتھ دارالاقامہ کے چار کشادہ کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔ تدریسی کمرے ۶ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کمرے میں کتابخانہ اور ایک میں دفتر ہے۔ ایک کمرے میں دارالافتا ہے۔ نصاب درس نظامی اور مسلک حنفی بریلوی ہے۔ دارالعلوم کا ایک ماہنامہ ہے جس کا نام رضوان ہے۔

جامعۂ حنفیہ: دو مقامات پر قائم ہے۔ ایک کا نام مدرسۂ عربیۂ حنفیہ ہے، جو بہاولپور ہاؤس میں ہے اور دوسرے کا نام دارالعلوم حنفیہ ہے، جو سٹیڈیم روڈ گلبرگ نمبر ۳ میں ہے۔ مسلک حنفی دیوبندی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں تعلیم و تدریس کی ابتدا ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد بہاولپور ہاؤس میں مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا گیا اور جامعۂ حنفیہ یہاں منتقل ہوئی۔ اب اس کے ۹ تدریسی کمرے ہیں اور ہر کمرے کے آگے برآمدہ ہے۔ سٹیڈیم روڈ پر دارالعلوم حنفیہ کا قیام ۱۹۶۵ء میں ہوا تھا۔ درس نظامی دونوں مدارس میں رائج ہے۔ بہاولپور ہاؤس کے مدرسے کے کتابخانے میں بہت سی کتابیں ہیں۔

جامعۂ اشرفیہ: یہ خوبصورت اور وسیع و عریض دارالعلوم ہے، جو فیروز پور روڈ پر واقع ہے۔ عربی کی تدریس کی یہ بہت بڑی درس گہ ہے۔ ابتدائی شکل میں یہ درسگاہ امرتسر کی مسجد نور میں قائم ہوئی، اس کے بانی مفتی محمد حسن تھے، جو مولانا اشرف علی تھانوی کے شاگرد اور مرید تھے۔ قیام پاکستان پر وہ لاہور آ گئے اور نیلا گنبد کے قریب مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام اپنے استاد کے نام پر مدرسۂ اشرفیہ رکھا۔ پھر فیروز پور روڈ پر ۱۲۵ کنال کا ایک وسیع قطعۂ اراضی حاصل کیا گیا اور ایک عالی شان دارالعلوم کا سنگ بنیاد ۱۳۷۴ھ میں رکھا گیا۔ اب یہاں ایک وسیع و عریض جامع مسجد ہے جس کا اندرونی ہال کمرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے دونوں طرف بھی بڑے بڑے ہال کمرے ہیں۔ مشرقی سمت وسیع دارالقرآن ہے۔ جامعہ کے جنوبی دروازے کے باہر سامنے کی طرف درسگاہ کی مسلسل عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ تدریسی کمرے ۲۴ ہیں۔ تمام کمروں کے سامنے برآمدے ہیں۔ طلبہ کی اقامت کے لیے دارالاقامہ ہے۔ اس کی پہلی منزل میں ۱۸ کمرے ہیں اور بالائی منزل میں چھے۔ تمام کمروں کے آگے برآمدے ہیں۔ اساتذہ کے لیے مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ خادموں کے لیے بھی کوارٹر ہیں۔ جامعہ میں دو ٹیوب ویل نصب ہیں۔ جامعہ میں کئی شعبے ہیں، شعبۂ درس نظامی، شعبۂ حفظ و تجوید، دارالافتا، شعبۂ تبلیغ۔ کتابخانے

میں بہت سی کتابیں موجود ہیں ۔ مسلک حنفی دیوبندی ہے ۔

مدرسۃ البنات : یونیورسٹی گراؤنڈ سے متصل ۱۵ لیک روڈ پر ہے ۔ یہ درسگاہ ''انجمن مدرسۃ البنات'' کے زیر اہتمام ہے ۔ اس کے بانی مولانا عبدالحق عباس (م ۱۹۶۰ء) تھے ۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں مدرسۃ البنات کی مستقل درسگاہ جالندھر میں قائم کی ۔ قیام پاکستان پر ۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لیک روڈ کی موجودہ عمارت میں یہ درسگاہ قائم کی گئی ۔ نصاب پہلی سے دسویں تک ہر جماعت میں عربی زبان میں ہے اور قرآن مجید نصاب کا لازمی حصہ ہے ۔ موجودہ دینی نصاب بھی رائج ہے ۔ طالبات کو عربی میں گفتگو کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے ۔ ''کلیۃ البنات'' کے نام سے کالج بھی ہے ۔

مدرسۂ شمشادیہ نہ ماہی تعلیم القرآن : لاہور چھاؤنی کے صدر بازار کے خراس محلے میں ہے ۔ سید شمشاد حسین کے نام کی مناسبت سے یہ مدرسہ شمشادیہ کے نام سے موسوم ہے ۔ شروع میں یہ مدرسہ کانپور (بھارت) میں قائم ہوا ۔ ۱۹۴۰ء میں یہ مدرسہ دہلی میں منتقل ہوا ۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مدرسہ مذکورہ محلے میں قائم ہوا ۔ نہ ماہی تعلیم القرآن کے مدرسے کے ساتھ شعبۂ ابتدائیہ (پرائمری) بھی ملحق ہے ۔ عمارت میں ۶ تدریسی کمرے اور ایک ہال کمرہ ہے ۔ مسلک حنفی بلا تخصیص ۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام : اسے مدرسۂ غزنویہ بھی کہتے ہیں ۔ ۱۹۰۱ء میں مولانا عبدالجبار غزنوی نے اس کی بنیاد مسجد غزنویہ امرتسر میں قائم کی تھی ۔ ۱۹۴۷ء میں یہ دارالعلوم شیش محل روڈ پر ایک سہ منزلہ عمارت میں قائم ہوا ۔ اس کے مہتمم سید داؤد غزنوی تھے ۔ پہلی منزل میں وسیع ہال کمرہ ہے ۔ یہاں تدریس کا کام ہوتا ہے ۔ دوسری منزل میں دارالاقامہ ہے ۔ جس کے چار کمرے ہیں یہیں دفتر بھی ہے ۔ تیسری منزل میں مہتمم کی سکونت ہے ۔ نصاب ترمیم شدہ درس نظامی ہے اور مسلک اہل حدیث کا ہے ۔ کتابخانے میں ضرورت کی بہ تعداد کثیر کتابیں ہیں ۔ فارغ التحصیل طلبہ کو دورۂ حدیث کی سند دی جاتی ہے ۔

جامعۂ امامیہ : ۲۵ ایمپرس روڈ پر ہے ۔ مسلک اثنا عشری شیعہ ہے ۔ اس کے بانی نواب مظفر علی قزلباش ہیں ۔ شروع میں یہ جامعہ کربلائے گامے شاہ میں قائم ہوئی تھی، پھر اسے ایمپرس روڈ کی مذکورہ کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا ۔ یہاں تدریس کے لیے چار بڑے کمرے مختص ہیں ۔ ان کے آگے کھلے برآمدے ہیں ۔ ہال کمرے کچھ اور بھی ہیں ۔ کتابخانہ خاصا بڑا ہے ۔ ادیب عربی اور فاضل عربی کی کلاسیں بھی جاری ہیں ۔

جامع قاسمیۂ مصباح العلوم : چاہ میراں روڈ پر فیض باغ میں ہے ۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں درس و تدریس شروع ہوئی ۔ تدریس کے کمرے ۸ اور دارالاقامہ کے کمرے ۴ ہیں ۔ دو برآمدے ہیں ۔ یہاں حفظ و ناظرہ کا انتظام بھی ہے ۔ مصباح العلوم میں شعبۂ طالبات بھی ہے ۔ ان کی تدریس کے لیے معلمات مقرر ہیں ۔ مسلک حنفی بریلوی ہے ۔

جامع المنتظر : یہ درسگاہ جامع المنتظر کے زیر اہتمام چل رہی ہے ۔ جامعہ کی بنیاد شروع میں ۱۹۵۴ء میں وسن پورہ میں قائم ہوئی تھی ۔ اب اس جامعہ کی عمارت ماڈل ٹاون ایچ بلاک میں تقریباً ۱۸ کنال اراضی میں تعمیر ہوئی ہے ۔ اس میں وسیع مسجد، مجلسوں کے لیے وسیع ہال، درس و تدریس کے کمرے وسیع دارالاقامہ، مہتمم کی اقامت گاہ، اساتذہ کے قیام کی جگہیں، خادموں کے کوارٹر، دفتر اور ڈسپنسری موجود ہیں ۔ نئی عمارت کی بنیاد ۱۳۸۹ھ میں رکھی گئی تھی ۔

مدرسۂ نظامیۂ قرآنیہ : قلعۂ گوجر سنگھ میں نظامیہ روڈ پر پولیس لائن کے مقابل واقع ہے ۔ اس کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی تھی ۔ درسگاہ کی عمارت سہ منزلہ ہے ۔ جس میں ۱۶ کمرے ہیں ۔ اس میں درس نظامی رائج ہے ۔ حفظ و ناظرہ اور قراءت و تجوید کا انتظام ہے ۔ اس کے علاوہ یہاں نظامیہ گرلز سکول بھی ہے ۔

جامعۂ مدنیہ : راوی روڈ پر کریم پارک میں ہے، مسلک حنفی دیو بندی ہے ۔ ۱۹۵۵ء میں مسلم مسجد لُہاری دروازے میں یہ درسگاہ قائم ہوئی تھی، آخر یہ درسگاہ راوی روڈ پر ایک وسیع قطعۂ زمین میں تعمیر ہوئی ۔ مسجد کا ہال ایک کنال میں ہے ۔ اس کے ساتھ متعدد کمرے اور ۶ برآمدے ہیں ۔ دارالحدیث کا ایک بہت بڑا کمرہ ہے ۔ دارالاقامہ بھی ہے ۔ نصاب درس نظامی رائج ہے اور دورۂ حدیث اور قراءت و حفظ کا بھی انتظام موجود ہے ۔ بچوں اور بچیوں کے لیے پرائمری سکول بھی ہے ۔

مرکزی دارالعلوم : بازار داتا گنج بخش میں ہے ۔ اس کی تأسیس ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی ۔ نصاب درس نظامی ہے ۔ قراءت و تجوید کی تدریس بھی ہوتی ہے ۔ کتابخانے میں توسیع ہو رہی ہے ۔

دارالعلوم بات قیات الصالحات : بادامی باغ قلعۂ لچھمن سنگھ میں ہے ۔ اس کی تأسیس ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی ۔ اس میں ۱۱ تدریسی کمرے اور دو کمرے دارالاقامہ کے ہیں ۔ قراءت و تجوید کی تدریس ہوتی ہے ۔ ایک ہائی سکول بھی اس سے متعلق ہے جو اب حکومت کے زیر اہتمام چل رہا ہے ۔

دارالعلوم جامعۂ نعیمیہ : محمد نگر میں علامہ اقبال روڈ پر واقع ہے ۔ اس کے بانی مفتی محمد حسین نعیمی ہیں، جو بھارت سے لاہور آئے اور چوک دالگراں کی مسجد میں درس و تدریس شروع کی ۔ ۱۹۵۸ء میں یہ دارالعلوم چوک دالگراں سے محمد نگر میں منتقل ہوا، جہاں ایک وسیع مسجد تعمیر کی گئی ۔ جامعہ کی پہلی منزل میں تدریس کے لیے ۱۴ کمرے ہیں ۔ ان کے علاوہ عام مطالعے کے لیے دو کمرے مختص ہیں ۔ بالائی منزل میں دارالاقامہ ہے جس کے چودہ کمرے ہیں ۔ عمارت میں ٹیوب ویل بھی نصب ہے ۔ محاسب، مُحصّل اور خطیب کے لیے الگ الگ کمرے ہیں ۔ دارالعلوم کے کتابخانے میں بہ تعداد کثیر کتابیں موجود ہیں ۔ نصاب درس نظامی ہے، دورۂ حدیث کا بھی انتظام موجود ہے ۔ جامعہ کے زیر اہتمام خیاطی اور خطاطی کے فن کی بھی تربیت دی جاتی ہے ۔ جامعہ میں دارالافتاء کا بھی مستقل انتظام ہے ۔

جامعۂ نظامیۂ رضویہ : کی ابتدا ۱۹۵۷ء میں مسجد خراسیاں لُہاری دروازے میں ہوئی ۔ پھر ۱۹۷۱ء میں باغیچۂ نہال چند میں ۲ کنال ۱۷ مرلے میں جامع کی تعمیر ہوئی ۔ مسلک حنفی بریلوی ہے اور درس نظامی رائج ہے ۔ حفظ و ناظرہ کا انتظام ہے ۔

مرکزی دارالترسیل : لٹن روڈ، مسجد باغیچۂ نواب صاحب مزنگ میں ہے ۔ ۱۹۵۸ء میں درسگاہ کی تأسیس ہوئی ۔ درس و تدریس مسجد میں ہوتی ہے ۔ قراءت و تجوید کی تدریس کا بھی انتظام ہے ۔ ایک کمرے پر مشتمل دارالاقامہ بھی ہے ۔ مسلک بلا تخصیص ۔

مصطفٰی آباد دھرم پورے میں دو مدرسے ہیں مدرسۂ قاسم العلوم جس کی تأسیس ۱۹۵۹ء میں ہوئی اور مدرسۂ فرقانیہ جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا ۔ مدرسۂ قاسم العلوم طالبات کے لیے ہے، جو حفظ و ناظرہ کی تحصیل میں مشغول ہے ۔ مدرسۂ عالیہ فرقانیہ میں، چھوٹے بچے اور بچیاں

قرآن مجید ناظرہ پڑھتے ہیں، قراءت و تجوید کی بھی تدریس ہوتی ہے۔

مدرسۂ عزیزیۂ حنفیۂ تعلیم القرآن: چھاؤنی میں دہلی روڈ پر صدر بازار کی جامع مسجد میں قائم ہے۔ اس کی تأسیس ۱۹۵۹ء میں ہوئی تھی۔ مدرسہ انجمن اسلامیۂ لاہور کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔

مدرسۂ حنفیۂ فضلیۂ حیات القرآن: چوک نواب صاحب میں ہے، مسلک حنفی بریلوی ہے۔ یہاں حفظ و ناظرہ اور تجوید و قراءت کی تدریس کی جاتی ہے۔ اس میں بیرونی ممالک کے طلبہ بھی تعلیم پاتے ہیں۔

جامعۂ صدیقیۂ سراج العلوم: بیرون مستی دروازہ سرکلر روڈ پر واقع ہے، مسلک حنفی بریلوی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں یہاں درس و تدریس کی ابتدا ہوئی، نصاب درس نظامی ہے۔ حفظ و ناظرہ اور قراءت و تجوید کا انتظام بھی ہے۔

مدرسۂ دارالقرّاء: جامع مسجد بی بلاک ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ مسلک حنفی دیوبندی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس کی تأسیس ہوئی۔ یہاں قراءت و تجوید اور حفظ و ناظرہ کی تدریس ہوتی ہے۔

جامعۂ فضلیۂ عالی: مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ میں ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس کی تاسیس ہوئی نصاب درس نظامی ہے۔

غوث العلوم جامعۂ رحیمیہ رضویہ: نیو سمن آباد لاہور میں ہے۔ مسلک حنفی بریلوی ہے ۱۹۶۵ء میں اس کی تأسیس ہوئی۔ مدرسے کے کتابخانے میں بہ تعداد کثیر کتابیں ہیں۔ درس نظامی کے مطابق تدریس ہوتی ہے۔ حفظ و ناظرہ کا انتظام بھی موجود ہے۔

مدرسۂ جامعۂ اسلامیہ: مسلم آباد شالامار ٹاؤن میں ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اس کی تأسیس ہوئی۔ یہاں حفظ و ناظرہ اور تجوید و قراءت کی تدریس کے علاوہ درس نظامی رائج ہے۔ مولانا عبیداللہ انور امیر خدام الدین مدرسے کے سرپرست ہیں۔

جامعۂ تجوید القرآن نورانی: صدر بازار چھاؤنی کی جامع مسجد نورانی میں ہے۔ ۱۹۶۷ء میں یہاں درس و تدریس کی ابتدا ہوئی۔ یہاں ۱۲ تدریسی کمرے ہیں۔ حفظ و ناظرہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ ابتدائی درس نظامی بھی رائج ہے۔ بیرونی ممالک کے کچھ طلبہ بھی یہاں تعلیم پا رہے ہیں۔

مدرسۂ رحمانیہ: گارڈن ٹاؤن میں ہے اہل حدیث کا مدرسہ ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ یہ مدرسہ مجلس التحقیق اسلامی کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ درس نظامی کے علاوہ عہد حاضر کے علوم کی بھی تدریس ہوتی ہے۔ کتابخانے میں بہ تعداد کثیر کتابیں ہیں۔ محدث مدرسے کا ماہنامہ رسالہ ہے۔

جامعۂ حامدیۂ رضویہ: جامع مسجد اسلام پورے میں سولہ سترہ سال سے اسلامی علوم کی درس و تدریس ہو رہی ہے۔

مظفر المدارس (مدرسۃ الواعظین): یہ مدرسہ فاضل حضرات کی تبلیغی اور تصنیفی رہنمائی کے لیے ۱۹۷۵ء میں ایمپریس روڈ پر قائم ہوا۔ اس کے بانی بھی مظفر علی قزلباش ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حافظ نذر محمد: جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان۔

[مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا]
(ادارہ)

لاہور میں مراکز ذرائع ابلاغ۔

اخبارات و رسائل وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہو رسالۂ نقوش، لاہور نمبر)۔

تعلیقہ: لاہور مرکز علم و ادب و ثقافت ہے گزشتہ مباحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ لاہور کی تأسیس غزنوی دور میں ہوئی یا اس سے قدیم تر زمانے میں

ہوئی، اتنا بہر حال یقینی ہے کہ غزنوی دور ہی میں پہلی مرتبہ اسے تہذیبی اورسیاسی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی علم و ادب کے مرکز کی حیثیت بھی اسے حاصل ہوتی گئی، جو آج تک قائم ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غزنوی دور میں لاہور میں ایک طرف فارسی شاعری کا آغاز ہو رہا ہے تو دوسری طرف ہندوؤں میں فارسی جاننے والے افراد نظر آتے ہیں، ان میں ایک تلک بن جے سین بھی تھا ۔ جس کی فارسی دانی کا مؤرخین نے خاص طور پر ذکر کیا ہے ۔ اس دور میں غزنہ اور لاہور میں موجود اختلاط عام ہوا اور لاہور کو غزنۂ صغیر کہا گیا ۔ اس میل جول کے نتیجے میں فارسی گو شاعر اس وقت کی ہندی زبان میں بھی شاعری کرنے لگے (مسعود سعد سلمان سے ایک ہندی دیوان منسوب ہے) اور مقامی ہندی میں فارسی کے الفاظ داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ ابوالفضل البیہقی کے بیان کے مطابق ثقافتی لحاظ سے غزنہ اور لاہور ایک ہی تہذیب کے دو شہر معلوم ہوتے ہیں ۔

غزنوی دور میں لاہور میں فارسی شاعری کا ایک دبستان قائم ہو جاتا ہے، اس دور میں، لاہور سے تعلق رکھنے والے متعدد شعرائے فارسی، ہمارے علم میں ہیں ۔ ان میں مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے علاوہ بہت سے اور بھی ہیں جن کا عوفی نے اپنے تذکرۂ لباب الالباب میں متعدد جگہ ذکر کیا ہے ۔

لاہور میں فارسی کا پہلا قابل ذکر شاعر نکتی لاہوری تھا، جو ابوالفرج اور مسعود سعد سلمان سے مقدم تھا ۔ اس فہرست میں یوسف دربندی لاہوری کا نام شامل کیا جا سکتا ہے ۔ اور مسعود بن شالی کوب کا بھی جو دربار لاہور سے منسلک نہ تھا، مگر لاہور کا رہنے والا تھا ۔

غزنویوں کے زمانے میں فارسی شعر و ادب کو جو فروغ حاصل ہوا، وہ تو معلوم ہے، لیکن برصغیر میں اس دور میں عربی کو بھی دینی، ادبی اور تہذیبی حیثیت حاصل رہی، چنانچہ عوفی کی لباب الالباب میں دو زبانوں (عربی اور فارسی) میں لکھنے والے شاعروں کے تذکرے موجود ہیں ۔

ان شعرا میں عربی کے ایک شاعر ابوالعطا بن یعقوب الغزنوی (۴۹۱ھ / ۱۰۹۷ء) کو نسبۃً زیادہ شہرت حاصل ہوئی ۔ عوفی کے بیان کے مطابق جب سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی نے ہندوستان کا رخ کیا، تو ابو العطا اس وقت لاہور کے قید خانے میں تھا ۔ عوفی نے اس کے عربی کلام کے نمونے دیے ہیں ۔ مسعود سعد سلمان نے اس کی مدح میں قصیدہ کہا اور اس کی وفات پر مرثیہ لکھا ۔

اس دور کے دوسرے مصنف جن کا غزنوی دور میں کسی نہ کسی طور پر لاہور سے تعلق رہا ہے، وہ ہیں البیرونی، ابوالقاسم، ابو المنصور بن علی الغزنوی النوکی، مسعود سعد سلمان وغیرہ ۔

اس دور کے بعض اور اکابر : شیخ اسمٰعیل لاہوری جو ۳۹۵ / ۱۰۰۴ء میں بخارا سے لاہور آئے ابوالقاسم محمد بن خلف لاہوری، ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن لاہوری، منہاج الدین ابراہیم الجوزجانی کے ناموں کے ساتھ لاہوری کی نسبت ان کے تعلق لاہور کا پتا دیتی ہے ۔

سراج منہاج : (دیکھیے ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، طبع پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء (جلد دوم حصّۂ عربی، ص ۶۱ تا ۱۲۵) کو بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب شیخ محمد اسمٰعیل (م ۴۴۸ھ) بخارا سے لاہور آئے اور وعظ و درس کا سلسلہ شروع کیا، تو ہزاروں لوگ ان کے وعظ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے گئے (رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ہند) ۔

لاهور کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ حضرت داتا گنج بخش (علی بن عثمان الہجویری) نے، جن کی کتاب کشف المحجوب صوفیانہ ادب میں ایک بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے، لاهور کو اپنے فیوض کی اشاعت کا مرکز بنایا۔

الہجویری شاعر بھی تھے، لیکن ان کا دیوان ضائع ہو گیا ۔ شیخ محمد اکرام نے ان کے چند اشعار فارسی بطور نمونہ دیے ہیں۔ ابراہیم غزنوی کے زمانے میں فارسی کا ادبی دبستان لاهور میں بھی قائم ہو گیا ۔ ابو نصر فارسی نے اس کی تربیت میں خاص حصہ لیا اور مقامی لوگ بھی فارسی سمجھنے لگے۔

مسعود ثالث نے علوم کے تحفظ کے لیے لاهور میں ایک دارالکتب (کتابخانہ) قائم کیا۔

دور غزنوی کے لاهور کی تاریخ میں امیر ایاز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ایاز کی سپہ‌سالارانہ صلاحیتیں اور منتظمانہ قابلیتیں اپنی جگہ مسلّم ہیں (دیکھیے مشتاق بھٹی : ''ملک ابو النجم ایاز بن لویماق'' در ضمیمۂ اورئینٹل کالج میگزین، ماہ نومبر ۱۹۴۳، مئی ۱۹۴۴ء)، اس کے ذوق حسن و ذوق شعر کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں، عنصری کی ایک رباعی، رونی کا ایک قصیدہ اور فرخی کا ایک قصیدہ اس کی سرپرستیِ ادب کی گواہی دیتے ہیں۔

اس قیاس کے لیے کافی شواهد موجود ہیں کہ ایاز ہی موجودہ لاهور کا بانی اور پہلا صوبے دار تھا ۔ لاهور کے علاقۂ رنگ محل میں ایک قبر موجود ہے، اسے ایاز (یا الیاس) کا مزار کہا جاتا ہے۔ اور عقیدت مند لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے رہتے ہیں۔ تو نتیجہ یہ کہ جس طرح فارسی اور اردو کی شاعری میں ایاز کی شخصیت حسن و جمال کی علامت ہے، اسی طرح زمانے نے اسے خوش ذوقی کی سند بھی عطا کی۔ زلالی نے پونے پانچ سو صفحے پر مشتمل ایک ادبی مثنوی لکھ کر اس کی یاد کو پائدار بنا دیا ۔ اور بعد کے ایک شاعر نے محمود نامہ لکھ کر اس کی عقیدت کو مستقل طور پر نقش کر دیا ۔ ایاز سے ایک اختراع بھی منسوب ہے جسے ایاس (= ایاز) کہتے ہیں، جو ایک کپڑا ہے جسے برف باری کے زمانے میں سفر کرتے وقت آنکھوں پر باندھ لیتے تھے تاکہ برف کی سفیدی اور ٹھنڈک سے آنکھوں کو ضرر نہ پہنچے (مشتاق احمد بھٹی : کتاب مذکور)۔

غوریوں کا دور: خسرو ملک پر (۵۸۳ھ میں) سلطنت غزنویہ کا انقراض ہو گیا، لیکن غوریوں کی سلطنت کو زیادہ ثبات نصیب نہ ہوا اور خاندان غلاماں کا آغاز ہو گیا، اور دارالحکومت بھی دہلی منتقل ہو گیا، تاہم قطب الدین ایبک کا لاهور میں چوگان کھیلتے ہوے انتقال ہو گیا۔

دور غوریہ و غلاماں میں عہد غزنویہ کی ادبی روایت ایک حد تک قائم رہی ۔ اس دور میں لاهور کے جن دو شاعروں نے شہرت پائی وہ سراج منہاج لاهوری اور عمر اسحٰق لاهوری ہیں۔

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے کی ادبی تاریخ پر کچھ تاریکی چھائی ہوئی ہے ۔ اس زمانے کے ادب میں لاهور کی حصہ داری متعین کرنا مشکل ہے فارسی ادب کی عام تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو عبدالغنی (شمس العلما) : *Persian Literature during the Pre-Mughal Period*، نیز عربی کے لیے دیکھیے زبیداحمد : *Indian Contribution to Arabic Literature*.

مغلوں کے زمانے کی ادبی تاریخ نسبۃً صاف ہے ۔ اس میں لاهور کی ادبی سرگرمیوں کا حال مل جاتا ہے ۔ میخانے کا مصنف عبدالنبی قزوینی فخر الزمانی جب ۱۰۲۵ھ کے آغاز میں لاهور پہنچا، تو اسے یہ شہر بہت پسند آیا، اس کی خوش حالی اور ثقافتی خوش دلی سے متأثر ہوا ۔ اس پر تعجب کرتے

هوے لکھتا ہے :

''عجب ملکے بنظر این حقیر در آمد، ارزانی و فراوانی، دیگر یکی از خوبی‌هاے هندوستان این که هر کس در هر محل بهر طریقے که زیست کند هیچ کسے را قدرت این نیست که نهی آن امر نماید، باخود قرارداد که جاے توطن تو این ملک است (طبع محمد شفیع لاهوری)، ص ۵۰۲، س ۲) ایک اورضمن میں یہی مصنف لکھتا ہے .

''ملکے دیدم بغایت آبادان و معمور و بلادے مشاهده کردم از براے آسایش و رفاهیت بی نهایت مطبوع باخود قرار دادم که تمام عمر درین دیار صرف کنم'' (کتاب مذکور، ص ۴۲۳) - اسے لاهور (هندوستان) کی زندگی کا یہ پہلو بہت اچھا لگا که :

''هر نوع که کسی خواهد، باشد، منع و تکلیفی نباشد'' ظاهر ہے که یہ باتیں ایک ایسے معمورے هی میں هو سکتی هیں جس میں کشاده دلی اور کلچر انتہا کو پہنچ گیا هو، یہ وہ وصف ہے جس کا ذکر ایک صدی بعد کا شاعر خالص استرآبادی (المتوفی ۱۱۲۲ھ) بھی کر رہا ہے - وہ کہتا ہے :

ز خوبیهای هند این خوبی اش بس
که هر گز نیست کس را کار با کس

یہ اگرچہ هند کی تعریف میں ہے، مگر اس کا خاص تعلق لاهور هی سے ہے .

خوشگو نے بھی سفینۂ خوشگو میں فیضی کے حالات میں اسی طرح کا تأثر دیا ہے - وہ لکھتا ہے که بقول صاحب مأثر رحیمی ''فیضی ملاذ الفضلا و ملجأ الشعراء بود - اکثر مستعدان خراسان بشوق خدمتش به هند رسیده، کامیاب باطن و ظاهر شدند - هر کس که در ایران قدرت گفتن مصرعی و طبع موزونی داشته، به هند آمد، نتائج طبع خود را بشرف اصلاح وی رسانید - دران وقت دارالسلطنت لاهور دارالشعراء گردید'' یہ اس زمانے کی بات معلوم هوتی ہے جب اکبر نے لاهور میں اپنے قیام کو طول دیا - لہٰذا چودہ سال کے اس عرصے میں لاهور هی اس کا ادبی دربار بن گیا .

اب لاهور کے دارالشعراء هونے کی حقیقت یہ ہے که لاهور میں مقیم، اور لاهور کے عارضی باشندے جو باهر سے آتے تھے، لاهور کو اپنے قیام سے ضرور مشرف کرتے تھے، جیسا که تذکروں میں ہے - اس کا خلاصہ دیکھیے مجلۂ نقوش لاهور نمبر، ''فارسی شاعری میں لاهور کا ذکر'') .

بعد کے زمانوں میں بھی ایسا هی هوتا رها، علمی و تعلیمی دنیا کا یہ واقعہ بھی اهم ہے که یہیں شہر لاهور میں عیسائی (Jesmits) مشن نے مرآۃ القدس کے نام سے بائیبل کا فارسی ترجمہ اکبر کی خدمت میں پیش کیا - اکبر نے عیسائیوں سے جو رابطہ رکھا، اس پر دینی حلقوں میں بڑا احتجاج بھی هوا، لیکن لاهور کی وسیع تر ادبی فضا میں وسعت مشرب کو خاص اهمیت حاصل تھی اور لاهور کی اس کشاده دلی کا ذکر تو میخانہ کی عبارتوں سے هم معلوم کر هی چکے هیں.

جہانگیر نے بھی لاهور هی میں عیسائی مشن کا استقبال کیا - اس پر بھی دینی حلقوں میں احتجاج هوا، لیکن جہانگیر کی کشاده دلی کا اعتراف خود پادریوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے .

مشاعرے: مغلوں کے عہد میں شعری مباحثے = مشاعرے) کا خاصا رواج تھا (عبدالباقی نے مأثر رحیمی میں متعدد مرتبہ ذکر کیا ہے - اس نے طرز تازہ گوئی کی تنقیدی مجلسوں کا بھی ذکر کیا ہے جو لاهور اور دہلی دونوں جگھوں میں منعقد هوئیں - مشاعروں کا ذکر لاهور کے سلسلے میں اورنگ زیب کے بعد کے زمانے کے تذکروں میں بکثرت ملتا ہے - لاهور کے چند ایسے مشاعروں کا ذکر حاکم لاهوری نے اپنی کتاب

مردم دیدہ میں کیا ہے، اس میں مسجد وزیر خان اور شالامار باغ میں مشاعروں کا خاص ذکر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اہل ادب کے گھروں میں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ دہلی اور دوسرے مقامات پر، ادب کی جو رسمیں موجود تھیں، وہ لاہور کے لیے اجنبی نہ تھیں ۔ شعر و شاعری، کی جو سرگرمیاں دور غزنوی سے شروع ہوئیں، انھیں توران اور ایران دونوں طرف سے، لاہور اپنے اندر جذب کرتا رہا اور اس پر ایک مقامی روایت اردو سے پہلے پنجابی شاعری کی بھی چلتی رہی اور ہیر وارث شاہ کو بطریق نالۂ اشتیاق پڑھنے یا گنے کا سلسلہ بھی لاہور کے لیے ذوق فزا رہا بلکہ آخری عہد انگریزی میں بھی گرمی محفل کا ساماں پہنچاتا تھا ۔ اس کے پہلو بہ پہلو، مثنوی رومی کا وجد آور وعظ، واعظوں کی تقریروں میں ڈھل کر گلی کوچوں میں وجد آفرینی کرتا تھا آخری دور مغلیہ میں لاہور کی ثقافتی سرگرمیوں کا حال انند رام مخلص کی کتاب بدائع وقائع میں بھی ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ سرخوش لاہوری کے تذکرۂ کلمات الشعراء میں بھی لاہوری شعرا کا ذکر موجود ہے ۔ مشاعروں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک سنیما کے فروغ نے اسے بالکل دبا نہیں دیا ۔ اردو پنجابی مشاعروں کا سلسلہ انگریزی دور میں اور بھی منظم ہوا، یہاں تک کہ مشاعروں کی سرگزشتیں لاہور کے اخبارات مثلاً پنجابی اخبار اور انجمن پنجاب رسالے میں چھپتی تھیں ۔ کئی ادبی انجمنیں محض مشاعرے کے لیے قائم ہوئیں ۔ (دیکھیے آغا محمد باقر: ''مضمون انجمن پنجاب'' نیز، اسلم فرخی، محمد حسین آزاد، اور گارساں دتاسی: خطبات).

انجمن پنجاب: کی بنیاد لاہور میں ۱۸۵۰ء میں پڑی اور نئے انداز کے مدرسے قائم ہوئے ۔ ان مدرسوں سے پہلے آرنلڈ کی رپورٹ کے مطابق، مکاتب و مدارس موجود تھے اور اسی کے مطابق ۸۰ فی صد لوگ خواندہ تھے ۔ انگریزی حکومت کے تحت تعلیمی ادبی سرگرمیوں کا انداز جدا ہوگیا، مگر اس مقالے میں اس کی روداد بیان نہیں کی جا سکتی.

تعلیمی دائرے میں ۱۸۶۴ء میں لاہور کا اہم تعلیمی واقعہ گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام تھا ۔ اس کے فوراً بعد (۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو) انجمن پنجاب کی تأسیس ہوئی ۔ اس تخیل کا محرک اول ڈاکٹر لائٹنر تھا جو گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل اور بعد میں یونیورسٹی کالج (اور یونیورسٹی اورینٹل کالج) کا پرنسپل تھا ۔ ۱۸۸۲ء میں جب پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کا پہلا رجسٹرار بھی وہی تھا ۔ انجمن پنجاب کی تأسیس جس جلسے میں ہوئی (۲۱ جنوری ۱۸۶۵) اس میں پنڈت من پھول میر مجلس تھے اور جلسہ سکھشا سبھا کے مکان میں ہوا جو ''چوک نوگزہ'' کے قریب ہے ۔ انجمن کا نام ''انجمن برائے اشاعت علوم مفیدہ'' (یا مطالب مفیدہ) تھا.

اسی انجمن نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کی تأسیس کے لیے جد و جہد کی، اس کا ایک مجلہ بھی تھا جس میں علمی مضامین کے علاوہ انجمن کے جلسوں کی رودادیں شائع ہوتی تھیں (انجمن کے حالات کے لیے دیکھیے، خطبات گارساں دتاسی، خطبہ ۱۸۶۶ء؛ آغا محمد باقر: انجمن پنجاب، در ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین.

اسی انجمن کے زیر اہتمام محمد حسین آزاد نے شعر و انشا کی اصلاح سے متعلق مضامین پڑھے جن سے نئے ادب کی تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کیا (دیکھیے محمد صادق اور اسلم فرخی کی کتابیں) نیز برج موہن دتا تریہ کیفی کی کتاب منشورات).

نظم اردو کے مشاعرے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ کی اس خواہش سے ہوے کہ سرکاری مدارس کے ذریعے اردو نظم کا رواج ہو جائے ''چنانچہ میجر (بعد میں کرنل) ہالرائیڈ نے اردو نظم (بطرز مغربی) کی تحریک شروع کی جس میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے بھی حصہ لیا ۔ لاہور کی اس تحریک کا سارے ملک پر اثر ہوا (اسلم فرخی: محمد حسین آزاد، حصۂ اول، ص ۲۴ و بعد) ۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر اردو کی نظم جدید کی تحریک بھی اسی ابتدا کی ترقی تھی ۔ قیام پاکستان کے بعد نئی پود، ''ادب مر گیا'' اور ''ادبی جمود'' قسم کے نعرے بھی لاہور ہی سے اٹھے ۔ اب لاہور علم و فن اور ادب و شعر کا عظیم مرکز ہے (اس کے لیے دیکھیے اردو ادب کی مختلف تاریخیں).

سر سید کی لاہور میں آمد :

۱۹۰۰ء سے پہلے کے پچیس سال کا ایک علمی و تعلیمی واقعہ سر سید احمد خان کی لاہور میں آمد ہے ۔ سید صاحب نے اپنے تعلیمی مشن کی خاطر چار مرتبہ لاہور کا سفر کیا ۔ اول دسمبر ۱۸۷۳ء میں، دوم جنوری، فروری ۱۸۸۴ء میں، سوم دسمبر ۱۸۸۸ء میں اور چوتھی مرتبہ اپریل ۱۸۹۴ء میں ۔ یہی وہ موقع ہے جب سر سید نے مسلمانان اہل لاہور کے جوش و خروش کو دیکھ کر انھیں ''زندہ دلان لاہور'' کا خطاب دیا تھا ۔ حسن اتفاق سے تیسرے سفر کی مفصل روداد سید اقبال علی نے سر سید احمد خان کا سفر نامۂ پنجاب میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ اخبار انجمن پنجاب اور پنجابی اخبار اور رفیق ہند میں بھی مل سکتی ہے.

سر سید ۱۸۸۴ء ۳۰ جنوری کو امرتسر سے پانچ بجے لاہور پہنچے اور ۴ فروری ۱۸۸۴ء تک لاہور میں قیام کیا ۔ اس موقع پر لاہور کے ریلوے سٹیشن پر بڑا استقبال ہوا ۔ استقبال کرنے والوں میں شہر لاہور کے اکابر (مسلمان اور ہندو) موجود تھے ۔ اس کے بعد، ہر روز سید صاحب کو ایک سے زیادہ تقریبوں میں سپاسنامے پیش ہوے جن کا جواب سید صاحب دیتے تھے ۔ تعلیم کے اہم مسائل، ملکی یکجہتی اور اتحاد کے موضوعات پر تقریریں ہوئیں ۔ محمد حسین آزاد، مولانا فیض الحسن اور دوسرے اہل علم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں ۔ سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ نے بڑی عزت و تکریم کی ۔ اس موقع پر سر سید نے جن اہم موضوعات پر کھل کر باتیں کیں، ان میں اول ہندو مسلم اتحاد، دوم اسلام کی حقانیت، سوم تعلیم نسواں کے بارے میں محتاط رویہ رکھنے کے متعلق اظہار خیال تھا ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اردو کے بلند پایہ ادیبوں اور مصنفوں میں سے بعض یونیورسٹی اورینٹل کالج میں استاد یا اس کے فیض یاب رہے ان میں شبلی، فیض الحسن سہارنپوری اور مفتی عبداللہ ٹونکی شامل ہیں ۔ شہر کے باقی نمایاں ادیبوں اور شاعروں اور مصنفین کے تذکرے کے لیے دیکھیے مجلۂ نقوش لاہور نمبر ۔ اس کے علاوہ لاہوری ادیبوں کی ایک کھیپ گورنمنٹ کالج لاہور سے ابھری، ان کا ادب میں بڑا مقام ہے.

رسالۂ مخزن (۱۹۰۰ء): اگرچہ لاہور میں ۱۹۰۰ء سے قبل بھی اخبارات و رسائل موجود تھے، لیکن ادب کی دنیا میں شیخ عبدالقادر کے رسالۂ مخزن لاہور) نے جو دیر پا اثر ڈالا، وہ اسی کا حصہ تھا ۔ یہ رسالہ دس سال تک لاہور کی ادبی فضاؤں میں گرمی ہنگامہ کا سامان پیدا کرتا رہا اور اگرچہ اس نام سے بعد میں بھی طلوع و غروب کے منظر دکھاتا رہا، مگر لاہور ہی میں اس کے زیر اثر زمانے کے بڑے بڑے شاعر آسمان شہرت پر چمکے ۔ اقبال کی بھی بعض نظمیں مخزن کی زینت بنیں ۔ ان کے علاوہ، ادب اردو میں انشاے لطیف اور لطیف

رومانیت کی تحریک کے علمبردار بھی مخزن ھی کے ذریعے روشناس ھوے۔

یہ عجیب اتفاق ھے کہ زیر بحث زمانے کی اکثر تحریکیں اور ان سے وابستہ اکثر اھل علم لاھور کے محلۂ بازار حکیماں (بھاٹی دروازہ) ھی کے ارد گرد مقیم نظر آتے ھیں (دیکھیے حکیم احمد شجاع : لاھور کا چیلسی، در.....)۔

غرض جس طرح ۱۹۱۰ء کے بعد لاھور کا موچی دروازہ اور ۱۹۲۰ء کے بعد دہلی دروازہ اور اس کا باغ سیاسی ھنگاموں کے لیے مشہور ھوا، ۱۹۱۰ء سے قبل علمی، تعلیمی اور ادبی شخصیتوں کے قیام اور سرگرمیوں کے لیے بھاٹی دروازہ اور بازار حکیماں کو امتیاز حاصل ھوا ۔ یوں تو لاھور کو از ابتدا تا حال اھم مرکز صحافت کہا جا سکتا ھے، لیکن مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار لاھور (اور ستارۂ صبح) کو اس لحاظ سے خصوصی اھمیت نصیب ھوئی کہ اس کے دامن میں زمانے کے بڑے بڑے صحافیوں اور ادیبوں نے پرورش پائی ۔ ان میں عبداللہ عمادی، سلیم پانی پتی، مہر و سالک اور حسرت کاشمیری جیسے نامور صحافی بھی شامل ھیں۔

زمیندار کا امتیاز یہ تھا کہ اس نے صحافت کی رومانی، جذباتی روش کو فروغ دیا، جس کا بالواسطہ ادب اردو کے ارتقا پر بھی اثر پڑا ۔ زمیندار کئی تحریکوں کا علمبردار اور بڑا اثر رکھتا تھا ۔ برصغیر میں جن چند اخباروں کو اردو صحافت کی اولین رھنمائی کی سند ملی، ان میں لاھور کے زمیندار کو اول الاولین کہا جا سکتا ھے ۔ رفتہ رفتہ لاھور کو ایک مستقل ادبی دبستان کا درجہ حاصل ھو گیا اور قیام پاکستان کے بعد تو اسے اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز کہا جا سکتا ھے اور اس میں اتنی قوت اور توانائی آ گئی کہ بقول بسمل اللہ آبادی :

مرکز زبانِ اردو کا لاھور ھو گیا
دلی و لکھنؤ کو پکارا کرے کوئی

لاھور کے دبستان اردو کا شعور خودی قیام پاکستان سے پہلے ھی خود اقبال کے کلام میں بیدار نظر آتا ھے، چنانچہ انھوں نے فرمایا :

اقبال لکھنؤ سے، نہ دہلی سے ھے غرض
ھم تو اسیر ھیں خمِ زلفِ کمال کے

لیکن اس شعور کمال کو جس کے خالقوں میں ظفر علی خان کا بھی بڑا حصہ ھے، نیاز مندان لاھور کے ایک ادبی اعلان کے ذریعے خاص تقویت نصیب ھوئی، یا یوں کہیے کہ یہ اعلان اس شعور کی علامت تھا۔

نیاز مندان لاھور کا پیغام کیا تھا ؟ ''یو ۔ پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں'' کے عنوان سے مجلّہ کارواں لاھور، نمبر ۲ (۱۹۳۴ء) میں لاھور کی وہ آواز سنائی گئی، جسے لاھور کے ادبی بلوغ کا برملا اظہار و اعلان سمجھنا چاھیے ۔ پیغام میں لکھا ھے کہ یو ۔ پی، حیدر آباد اور لاھور اردو کے تین مراکز ھیں ۔ ان میں سے لاھور میں زبان کی حالت ایک ھونہار تنو مند نوجوان کی ھے ۔ جس کا خون گرم ھے جس کے اعضا میں لچک ھے، جو چھلانگیں مارتا جاتا ھے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا قدم پگڈنڈی پر پڑتا ھے یا نہیں اسے سمت کا اتنا ھی شعور ھے، جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ھوتا ھے، یعنی یہ کہ سوا گرمیِ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوت نامیہ خود وھی رستہ ڈھونڈتی ھے جو بخط مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ھوا کی طرف جاتا ھے''۔

اور یہی کھلی روشنی اور تازہ ھوا تھی جس نے اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر اقبال کو پیدا کیا جس کے کمال میں لاھور کا فیض بھی شامل ھے۔

اسی کھلی روشنی اور تازہ ھوا میں جس کا ذکر

نیاز مندان لاهور نے اپنے پیغام میں کیا ۔ بعد کے جملہ شعری اور فنی، علمی دبستان ابھرے اور ملک کی ساری ادبی فضا پر محیط ہو گئے (شعرا و ادبائے لاهور کی مفصل فہرست کے لیے دیکھیے مجلۂ نقوش لاهور نمبر)۔

ترقی پسند تحریک: اس تحریک کی تأسیس اگرچہ خصوصی طور سے، لاهور میں عمل میں نہیں آئی، لیکن سید سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی (طبع لاهور، ۱۹۵۶ء) میں ان مشاورتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو اس تحریک کی تنظیم کے لیے لاهور میں ہوتی رہیں ۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں: ''یہ وهم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لاهور کی ادب پرور سر زمین پر یہ وہ پہلا لغزیدہ قدم ہے جو بعد کو اردو ادب کے کھلیان میں سنہرے خوشوں کا اتنا انبار لگا دے گا ۔ چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر، فیض، بیدی، ندیم قاسمی، میرزا ادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر، فکر، عارف، رهبر، اشک وغیرہ ..... نے ترقی پسندی کے عَلَم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے دوسرے حصے کے ادیبوں کے لیے قابل رشک بن گئیں'' (ص ۹۴)۔

حلقۂ ارباب ذوق:

لاهور میں ابھرنے والی اهم ادبی تحریکوں میں حلقۂ ارباب ذوق اس لیے نمایاں ہے کہ یہ خالصۃً لاهور کے ادبی ماحول سے ابھرا ۔ اسے ترقی پسند تحریک کا رد عمل یا اثر بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ابتدا میں یہ دونوں تحریکیں کچھ یکساں سی معلوم ہوتی تھیں، مگر آهستہ آهستہ دونوں کا نقطۂ نظر (لہٰذا طریق اظہار اور رنگ مطالب) جدا ہوتا گیا ۔ ترقی پسند تحریک اب ۱۹۷۸ء میں کسی منظم صورت میں موجود نہیں، لیکن حلقۂ ارباب ذوق کئی نشیب و فراز سے گزرتا ہوا اب بھی موجود ہے۔

اس کا پہلا نام ''بزم داستان گویان'' تھا، اس کا پہلا اجلاس ۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوا، لیکن بعد میں یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں اس کا نام تبدیل کر دیا گیا ۔ اور ''حلقۂ ارباب ذوق'' اس کا نام ٹھیرا ۔ اول اول ترقی پسند نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ اور بعد میں ادب میں آزادی کے نظریے کی حمایت میں، حلقہ پھلتا پھولتا اور پھیلتا گیا ۔ اس کی ایک خصوصیت بالالتزام ہفتہ وار نشست رہی ہے اور اب بھی ہے ۔ اس مجلس (حلقے) کے ماحول سے، بہت سی ادبی شخصیتیں ابھریں اور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ملک کے ادب پر گہرا اثر ڈالا (حلقے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ان کے ادب پاروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے امتحانی مقالہ مرتبہ یونس جاوید: حلقۂ ارباب ذوق، یونیورسٹی لائبریری لاهور: نیز انور سدید، ادبی تحریکیں (مقالہ دکتوری پنجاب یونیورسٹی)۔

انجمن حمایت اسلام: اس موقع پر انجمن حمایت اسلام لاهور کا تذکرہ بھی خالی از فائدہ نہ ہو گا جس کے سالانہ اور غیر معمولی اجلاسوں میں ملک بھر کے نامور عالم، خطیب اور ادیب حصہ لیتے رہے ۔ ان کاموں میں اقبال کے علاوہ مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، سید سلیمان ندوی اور صدر الصدور امور مذهبی حبیب الرحمن خان شروانی ..... شامل ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ انجمن تعلیم کے علاوہ ادبی و ثقافتی دائرے میں بھی مؤثر کردار ادا کرتی رہی۔

مشرقیات کے سلسلے میں یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاهور، علمی تحقیق (بانداز جدید) میں سرگرم رہا، جس میں ڈاکٹر لائٹنر کے بعد ڈاکٹر اے سی ولنڈ پروفیسر سنسکرت کے علاوہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، پروفیسر حافظ، محمد اقبال اور پروفیسر حافظ

محمود خان شیرانی کے نتائج تحقیق نے ایک دبستان نقد و تحقیق کی بنیاد رکھی۔

اهم بنیادی رسالے: اس موقع پر لاهور میں صحافت کی تاریخ لکھنی مقصود نہیں، صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس شہر میں کون سے ایسے رسالے اشاعت پذیر ہوے، جن کا ملک بھر کی صحافت و ادب پر گہرا اثر پڑا، یا جن کو کسی نہ کسی وجہ سے انفرادیت حاصل ہوئی۔

لاهور کے رسائل میں مخزن کا تذکرہ آ چکا ہے، اس کے بعد، خصوصی اهمیت، رسالۂ همایوں (مدیر میاں بشیر احمد) کو حاصل ہوئی جس کے اوراق میں رومانیت و عقلیت کا امتزاج نظر آتا ہے اور ملک کے بہت سے ادیبوں نے اسی کے ماحول میں پرورش پائی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد شباب اردو (مدیر: احمد حسین خان) میں ارزاں جذباتیت کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ اس کے بعد نیرنگ خیال (مدیر، حکیم یوسف حسن) نکلا جس نے صحیح تنقیدی ذوق پیدا کیا۔ پھر عالمگیر (مدیر: حافظ محمد عالم) کی باری آئی جس کے باعث ادب تجارتی مقاصد کی طرف بڑھا۔ ادب لطیف (مدیر: میرزا ادیب وغیرہ) نے ادب کے ترقی پسندانہ نظریے کی بہت خدمت کی) خیالستان (اختر شیرانی) ادبی دنیا (مدیر: تاجور۔ بعد میں مولانا صلاح الدین احمد)، شاهکار (تاجور)، قیام پاکستان سے پہلے کے رسائل ہیں جن میں سے بعض بعد میں بھی جاری رہے۔ اور ان کے ساتھ کچھ نئے رسالے نقوش (مدیر: محمد طفیل)، اور فنون (مدیر: احمد ندیم قاسمی) شائع ہوے اور اب تک (۱۹۷۸ء) تک چل رہے ہیں۔ . . . اور اگر قرب زمانی و مکانی کے لحاظ سے اوراق (مدیر: وزیر آغا) کو بھی شامل کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان جرائد نے مل کر پاکستانی ادب کی رهنمائی کی خاص خدمت کی۔ لاهور کے رسائل اور بھی ہیں۔ (ان کے علاوہ اخبارات کے ادبی ایڈیشن بھی ہیں)، جن کے ذریعے ادب کی مؤثر خدمت ہوئی۔ یہ سب بلند پایہ رسائل ہیں، ان میں نقوش اپنی محیط ادبی کاوشوں کے لیے، فنون آزاد ترقی پسندانہ میلان کے لیے اور اوراق اپنے ادبی خلوص کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ نیرنگ خیال پہلا اهم پرچہ ہے جس نے فن شناسی اور مغربی طریق ادب شناسی کی لاهور میں بنیاد رکھی۔

لاهور باغوں کا شہر: لاهور کو باغوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ دور مغلیہ سے پہلے، لاهور میں کتنے باغ تھے اور کہاں کہاں تھے، یہ ابھی قابل تحقیق ہے لیکن شعرائے غزنویہ، غوریہ کے کلام کے ذریعے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عہد باغوں سے خالی نہ تھا۔ یہی صورت عہد غلاماں و سلاطین دیگر قبل از مغلیہ کی ہے۔ سکھوں کے عہد میں ویرانی خاصی ہوئی۔ کچھ آبادی بھی ہوئی۔ انگریزی عہد میں لارنس باغ، گول باغ اور چھاونیوں وغیرہ کے ساتھ باغ بنے، انگریزوں نے اکثر پرانے باغوں کی از سر نو تعمیر کرائی۔ لیکن خاصی تعداد میں باغات. . . . پر لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، دور مغلیہ میں باضابطہ طور پر باغ سازی اور باغ آرائی سب سے پہلے مرزا کامران (برادر همایوں) نے کی۔ اس کے بعد یہ برطانوی دور کے آغاز تک سلسلہ جاری رہا۔ خود برطانوی عہد میں بھی باغ آرائی ہوتی رہی، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ذوق باشندگان لاهور کے لیے بسنت پتنگ وغیرہ کے تیوہار کی طرح ایک امر طبعی تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے نقوش۔ لاهور نمبر، مضمون: دور مغلیہ کے باغات و دیگر مضامین)۔

لاهور قدیم کے واقعات اور اس کے باغات (اور دیگر عمارات وغیرہ) کے بارے میں مفتی تاج الدین نے ۱۸۶۷ء میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس میں باغات مغلیہ کی خاصی تفصیل دی ہے۔ اور لکھا ہے

کہ تقریباً ہر بڑی مسجد اور ہر بڑے مزار کے ساتھ باغ ہوتے تھے (میر تقی میر نے کہا ہے ؎

دشت کے ٹوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستاں ہوتے ہیں

لاہور میں باغ روضوں کے ساتھ بھی ہیں اور عمارتوں اور مدرسوں کے ساتھ بھی، گویا ذوق باغ آرائی یہاں عام ہے۔ شالا مار باغ عہد شاہجہانی میں تعمیر ہوا اور عجائبات میں سے ہے۔ شاہجہان کے عہد میں باغ آرائی کی رسم اور بھی بڑھی۔ عہد اورنگ زیب میں یوں ہوا کہ دریائے راوی کی تباہ کن طغیانیوں سے لاہور کو بچانے کے لیے، اس بادشاہ نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کرایا (جس کے آثار کہیں کہیں اب بھی باقی ہیں) اور اس کے بعد حکم دیا کہ امرا اور منصب دار شہر کے رخ مکانات و محلات تعمیر کرائیں۔ اس فرمان کے مطابق وہ علاقہ باغات سے پر ہو گیا۔

مفتی تاج الدین نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ مقبرۂ جہانگیر کی تعمیر کے بعد اس طرف بھی سیکڑوں باغات اور مقبرے تعمیر ہو گئے اور یہ بھی لکھا ہے:

''غرض کہ اس عہد میں یہ شہر نمونۂ بہشت تھا، دنیا کی ہر ممکن الحصول چیز یہاں موجود تھی، ہر ہنر و کمال اور علم کی قدر ہوتی تھی۔ لوگ مرفہ الحال اور دولت سے مالا مال، بہت سچے اور ایماندار تھے، جو منہ سے نکالتے سوا سچ کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء، فروری ۱۹۴۸ء میں سکھوں کے عہد کے باغات کا ذکر ہے، اس جگہ لاہور کے سب باغات کا ذکر مطلوب نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ لاہور کی ثقافتی زندگی کے اس پہلو کو معرض توجہ میں لایا جائے، جس کا تعلق باغوں کی محبت سے ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے نقوش، لاہور نمبر)۔

شہر لاہور کے گرد فصیل (اب منہدم) کے ارد گرد گولائی میں، میونسپل باغ بڑی مدت تک لوگوں کی سیر گاہ اور طلبہ کے پڑھنے کی جگہ بنی رہی۔ اہل شہر لاہور کی باغ پسندی تو بدستور قائم ہے، لیکن اس وقت (۱۹۷۸ء) ایک افسوسناک رجحان کے تحت باغوں کی تعداد کم ہو رہی ہے اور مغربی طرز کی تفریحات کی وجہ سے باغوں کی سیر کا رواج کم ہو رہا ہے۔ آبادی بڑھ گئی ہے اور لوگ شب و روز فکر دنیا میں منہمک رہتے ہیں اس لیے نئے باغات کی تعمیر اب رک سی گئی ہے۔ ان باغوں میں سیاسی جلسے اور ہندو مسلم مناظرے ہوتے تھے اور کبھی کبھی میلا بازار بھی لگتے تھے۔

مال روڈ: لاہور کی ثقافتی زندگی میں شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) کو خاصی اہمیت حاصل ہے، انگریزی دور میں یہ سول لائنز کے بڑے بڑے عہدے داروں کی سیرگاہ اور آمد و رفت کا ذریعہ تھی۔ موجودہ سڑک سے قدرے مختلف اس کے دونوں کناروں پر گھڑ سوار لوگوں کے لیے ایک ایک سڑک دونوں طرف تھی اور درخت زیادہ تھے۔ یہ سڑکیں لارنس باغ سے گزر کر کوٹھی لاٹ صاحب سے ہوتی ہوئی چھاؤنی تک چلی گئی ہیں۔

مال روڈ کی سیاسی اہمیت: غالباً ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے بعد، اس سڑک کا سیاسی تحریکوں سے تعلق پیدا ہو گیا۔ مارشل لا کے اسیر جن میں بڑے بڑے اکابر لوگ تھے، اس سڑک پر سے، شاید پیدل چلائے جاتے تھے اور پبلک انہیں آتا جاتا دیکھتی تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شہر کے اکثر سیاسی جلوس اسی سڑک سے گزرنے لگے، اگرچہ بعض جلوس ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازے کے اندر سے ہوتے ہوئے مسجد وزیر خان و سنہری مسجد کے راستے شہر میں گھوم کر لوہاری یا بھاٹی دروازے پر ختم ہو جاتے۔ یا موچی

دروازے (کہ ۱۹۱۲ء کے بعد شہر کا اہم ترین سیاسی پلیٹ فارم تھا) سے ہو کر انارکلی اور گول باغ سے بھاٹی کے اندر سے واپس اپنی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مال روڈ جلوسوں کی عام گزرگاہ ہے۔ مسجد شہدا بھی اسی پر واقع ہے، سیاسی تحریکوں میں کئی مرتبہ اس سڑک پر مظاہرین پر گولی چلی، چنانچہ ۹ اپریل ۱۹۷۷ء کی اندھا دھند فائرنگ (جو سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کے مخالف جلوس پر ہوئی) بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ غرض اب مال روڈ (شاہراہ قائداعظم) ہر لحاظ سے ہنگاموں کا محل اور سیاسی عمل کا مرکز ہے۔ گول باغ اس کے مغربی سمت میں اور الفلاح مشرقی جانب ہے یہ چھوٹا سا ٹکڑا گویا بلا کی تماشاگاہ ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں بلائی ہوئی سربراہی کانفرنس کی یادگار بھی یہیں ہے اور بعض اہم اخبارات کے دفتر بھی اسی کے قرب و جوار میں ہیں۔

کچھ اور معلومات: اس وقت (۱۹۷۸ء) شہر کے اکثر اہم ہوٹل اور قہوہ خانے اور ہال اسی سڑک پر واقع ہیں۔ ان میں ایک Y.M.C.A. ہال بھی، جو انگریزی دور میں، ادبی، ثقافتی، علمی سرگرمیوں کے لیے جگہ مہیا کرتا تھا، اسی سڑک پر ہے۔ لاہور کے تین بڑے ہال، یونیورسٹی ہال، بریڈ لا ہال (عقب سنٹرل ٹریننگ کالج) اور برکت علی محمڈن ہال، مشہور ہیں، مگر اس وقت ثانی الذکر متروک الاستعمال ہے۔ پاکستان نیشنل سنٹر اور الفلاح کے بڑے ہال بھی مال روڈ ہی پر ہیں اور بہت مقبول ہیں، مزید یہ کہ انارکلی بازار بھی اس سڑک کے شمال میں ہے۔

لاہور میں خصوصی طور سے چند بڑے سیاسی واقعات ہوے، ان میں پچھلی صدی کے سازش کیس اور نئے زمانے میں بھگت سنگھ اور دت کی سزاے موت، غازی علم الدین شہید کا جلوس، گاندھی جی کے جلوس، مولانا ظفر علی خان، علی برادران اور قائد اعظمؒ کے عظیم جلوس یادگار تھے۔

لاہور دم تحریر (۱۹۷۸ء) بھی علم و فن کا ایک عظیم مرکز ہے۔ اس میں اخبارات، رسائل اور جرائد بتعداد کثیر نکل رہے ہیں (نقوش لاہور نمبر)، تحقیق، تنقید اور علمی موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، کالجوں کے علاوہ، علمی ادارے، مثلاً مرکزی اردو بورڈ، مجلس ترقی ادب، مرکزی اقبال اکیڈمی، بزم اقبال، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، آرٹس کونسل، پنجاب آرٹس کونسل، آرٹسٹس ایکوٹی، رائٹرز گلڈ، حلقۂ ارباب ذوق وغیرہ متعدد انجمنیں کام کر رہی ہیں۔

لاہور کا یہ مختصر سا حال بطور مرکز علم و ثقافت آیا ہے۔ بعض اور پہلو قابل ذکر تھے، مگر نقوش لاہور اور مآثر لاہور، اور *Lahore : Past and Present* میں مختلف شعبہ‌ہاے زندگی کے بارے میں اتنا لکھ دیا گیا ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دینا نامناسب ہوگا۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں، ممتاز اور نمایاں ادیبوں، عالموں، مصنفوں اور فن کاروں کا اور میلوں وغیرہ کے لیے دیکھیے مجلّہ نقوش لاہور نمبر (سید عبداللہ رکن ادارہ نے لکھا)۔

(ادارہ)

لاهیجان: ایران کے صوبہ گیلان کا ایک شہر جو دریاے سفیدرود کے مشرق اور کوہ دُلْفک [درفک] کے شمال میں واقع ہے (دیکھیے ایک قدیم قوم کا نام Δέρβικαι)۔ اس کا محلِ وقوع دریاے چمخالہ (پردیسر) پر ہے جو ۸ میل اوپر کی طرف لنگرود کے درمیان میں بہتا ہے۔ لنگرود موجودہ ضلع رانِ کوہ کا صدر مقام ہے۔

اگرچہ قدیم عرب جغرافیہ دان لاهیجان سے

واقف نہ تھے مگر یقینی طور پر یہ گیلان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے ۔ اس کا بانی افسانوی لاهج بن سام بن نوح قرار دیا جاتا ہے ۔ دریاے سفید رود گیلان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ۔ قدیم زمانے میں یہ دریا مشرق میں آماردی Amardoi اور مغرب میں کادوسی Kadusioi یا گیلیون Gelai کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا ۔ دیکھیے Andreas : *Amardos* در Pauly-Wissowa کی *Real Encyclopaedie* اسلامی زمانے میں گیلان کا وہ حصہ جو دریا کے مشرق میں واقع ہے، بی پیش کہلاتا تھا اور مغربی جانب کا حصہ بی پس کے نام سے معروف تھا ۔ (لفظ بیہ بمعنی آب، (دیکھیے امین احمد رازی در Dorn : *Auszuge*، ص ۱۰۰) یہ لفظ اوستائی کلمہ vaidhi بمعنی گذرگاہ آب سے مطابقت رکھتا ہے ۔ کاشانی کے قول کے مطابق بی پیش کے لوگ علوی (زیدی) تھے اور بی پس والے حنبلی یا استاد ابوجعفر (= طبری) کے پیرو تھے . . . .

مآخذ: متن میں آ گئے ہیں .

(V. MINORSKY) [و تلخیص از ادارہ])

⊗ **لائٹنر** : گوت لیب ولیہلم (Gottlieb Wilhelm Leitner) لسانیات، آثار قدیمہ اور تعلیم کے ماہر مستشرق؛ لائٹنر ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۰ء کو بوداپست (ہنگری) میں پیدا ہوے ۔ ان کے والد ڈاکٹر (Physician) تھے ۔ لائٹنر آٹھ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور والدہ نے ایک انگریز افسر سے شادی کر لی ۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۸ء یعنی گیارہ سال تک لائٹنر ترکیہ میں رہے ۔ برسہ اور استانبول کے مدرسوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ انھوں نے پروٹسٹنٹ کالج مالٹا اور کنگز کالج لنڈن میں اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کیے ۔ ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا (۱۸۵۵ - ۱۸۵۶ء) کے موقع پر ہزمجسٹی کمسریٹ Commissrate میں ترجمان درجۂ اول کی حیثیت سے ملازم ہوے ۔ ۱۸۵۹ء میں لائٹنر کنگز کالج لنڈن عربی اور ترکی زبانوں کے لیکچرار مقرر ہوے ۔ ۱۸۶۱ء میں عربی کے علاوہ اسلامی قانون کے پروفیسر بنا دیے گئے ۔ اسی سال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن بنے ۔ ۱۸۶۲ء میں فری بورگ یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی ۔ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی تاسیس ہوئی اور ڈاکٹر لائٹنر کا تقرر بطور پرنسپل ہوا ۔ نومبر ۱۸۶۴ء میں انھوں نے لاہور آ کر پرنسپل کا عہدہ سنبھالا ۔ ڈاکٹر لائٹنر کے لاہور پہنچنے سے شمالی ہند، خصوصاً پنجاب کی تعلیمی، ادبی اور علمی فضا بہت متأثر ہوئی ۔ انھوں نے یہاں پہنچتے ہی حالات کا بغور جائزہ لیا اور مقامی باشندوں کا تعاون حاصل کر کے ایک ہمہ گیر تحریک کا آغاز کیا جو آگے چل کر بہت بار آور ثابت ہوئی اور اسی کے نتیجے میں بالآخر پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی .

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی جس کے صدر ڈاکٹر لائٹنر تھے ۔ لاہور، امرتسر اور پنجاب کے دیگر شہروں کے سربرآوردہ حضرات اس انجمن میں شامل تھے ۔ ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں انجمن کے اغراض و مقاصد میں یہ امور شامل کیے گئے : (۱) قدیم مشرقی علوم کا احیا؛ (۲) باشندگان ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت؛ (۳) صنعت و تجارت کا فروغ؛ (۴) علمی، ادبی، معاشرتی، سیاسی مسائل پر بحث و نظر؛ (۵) سوہنے کے بارسوخ، اہل علم طبقات اور افسران حکومت میں رابطہ قائم کر کے مذکورہ بالا مقاصد کی پیشرفت ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ان اغراض و مقاصد کی خاطر بڑے جوش اور خلوص سے کام شروع کیا ۔ جا بجا تقریریں کیں ۔ لاہور میں ایک پبلک لائبریری، ریڈنگ روم اور تعلیمی کمیٹی قائم کرنے کے علاوہ ۱۸۶۵ء ہی میں مشرقی علوم

کا ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا ۔ پھر لاہور سے باہر پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی انجمن کی شاخیں قائم کر کے سکول اور کتابخانے قائم کیے اور مختلف زبانوں میں شعور عامّہ کی تربیت کے لیے رسائل اور اخبارات جاری کیے ۔ تعلیم عام کرنے کے ان مختلف کاموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر لائٹنر نے بڑے پُر زور انداز میں پنجاب میں ایک اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کی تحریک شروع کی اور اس مقصد کے لیے امرا و رؤسا کو گران قدر عطیّات دینے پر آمادہ کر لیا ۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کو انھوں نے شمالی ہند و پنجاب کے لیے اورینٹل یونیورسٹی کا منصوبہ پیش کیا ۔ مقامی باشندوں کی پرزور تائید کے علاوہ انھوں نے اس منصوبے کے لیے کچھ یورپی حضرات کی حمایت بھی حاصل کر لی ۔ ڈاکٹر لائٹنر کلکتہ یونیورسٹی کے نصابات کو یہاں کے باشندوں کے لیے ناکافی اور یہاں کے ذہن و فکر اور تہذیبی روایات سے بے آہنگ خیال کرتے تھے ۔ وہ تعلیم میں یہاں کے باشندوں کو شریک کر کے ان کے مزاج اور ضروریات کے مطابق نظام تعلیم استوار کرنا چاہتے تھے، جس کی غایت مختصر الفاظ میں اتنی ہی تھی کہ مشرقی علوم اور ملکی زبانوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہو ۔ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ میں ایک تعلق قائم کیا جائے اور جدید علوم ملکی زبانوں میں پڑھائے جائیں ۔ ڈاکٹر لائٹنر کا یہ نظریہ انگریزی حکومت کی سیاسی حکمت عملی اور اس کے مخصوص مصالح سے بہت مختلف تھا، اس لیے انھیں اپنے نظریات کی پیشرفت کے لیے طویل اور صبر آزما جد و جہد کرنی پڑی، لیکن وہ اپنے مقاصد میں بمشکل تھوڑی سی کامیابی حاصل کر سکے، یعنی اورینٹل کالج کا قیام اور پنجاب یونیورسٹی کے مقاصد میں مشرقی علوم کی اہمیت کا اعتراف اور دیسی زبانوں کو با ثروت بنانے کا عزم جو تمہید (Preamble) کے طور پر یونیورسٹی کے دستور العمل میں ۱۹۰۰ء تک شامل رہا ۔ اس اعتراف حقیقت کے باوجود ان اصولوں کو عمل میں لانے کے لیے ہمیشہ بے دلی سے کام لیا گیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر لائٹنر کی آرزوئیں تشنۂ تکمیل رہیں اور وہ یہاں سے دل شکستہ واپس گئے ۔

انجمن پنجاب کی تعلیمی، ادبی، علمی، معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کی پرخلوص رہنمائی کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر نے اپنی علمی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اس کے لیے دشوار گزار علاقوں کی سیاحت کر کے وہاں کے باشندوں کی زبان، ادب، رسم و رواج، عقائد و تصوّرات کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کر کے انھیں شائع کیا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۱۸۶۶ء میں کشمیر اور بدخشاں کے درمیانی علاقے (بلتستان ، گلگت ، ہنزہ ، ناگر، چترال، کافرستان) کا پُر خطر سفر کر کے برف پوش پہاڑوں کے درمیان گھرے ہوئے علاقوں کے باشندوں سے پہلی بار رابطہ قائم کیا ۔ اس سیاحت اور مطالعے کا نتیجہ *The Languages and Races of Dardistan* کے متعدد حصوں کی صورت میں علمی دنیا کے سامنے آیا ۔ اس علاقے کا یہ نام ''دردستان'' ڈاکٹر لائٹنر ہی کا دیا ہوا ہے ۔ بین الاقوامی علمی حلقوں نے لائٹنر کی ان خدمات کا اعتراف کیا اور انھیں دردستان کا دریافت کنندہ (Explorer of Dardistan) قرار دیا ۔ کشمیر اور بدخشان کے درمیان ان علاقوں کی سیاحت اور تحقیق کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا ۔ تخت باہی کے قریب بدھ یونانی آثار کی دریافت بھی لائٹنر کے حصے میں آئی ۔

۱۸۶۹ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے بُرسہ (ترکی) کے جرمن کونسل کی صاحبزادی کیرولین شواب سے شادی کی اور اسی سال ان کی تعلیمی تحریک کے نتیجے

میں حکومت نے پنجاب یونیورسٹی کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا (۸ دسمبر ۱۸۶۹ء) جس کے ڈاکٹر لائٹنر پہلے رجسٹرار بنے ۔ یہ منصب گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی کے علاوہ تھا ۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کی سینیٹ کا پہلا اجلاس ۱۱ جنوری ۱۸۷۰ء کو لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ کی صدارت میں ہوا جس میں اورینٹل کالج کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل بھی ڈاکٹر لائٹنر بنائے گئے ۔ چند برس تک انھوں نے اس منصب کے فرائض اعزازی طور پر انجام دیے اور یکم اگست ۱۸۷۷ء سے پرنسپل کے عہدے کی تنخواہ پانچسو روپے ماہوار قبول کی ۔ ۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۵ء کے دوران میں وہ طویل رخصت پر یورپ میں رہے اور جب مارچ ۱۸۷۶ء میں واپس آئے تو اورینٹل کالج بڑی نازک صورت حال سے دو چار تھا ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کالج کے معاملات درست کیے اور بہت جلد اسے علمی اور تعلیمی لحاظ سے بلند مقام تک پہنچا دیا ۔ اس ترقی کے باوجود حکومت اورینٹل کالج کے بارے میں مطمئن نہیں تھی اور کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر تعلیمات کی نکتہ چینی کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اپنی سالانہ رپورٹوں (۱۸۸۱ - ۱۸۸۲ء) میں اس کا مسکت جواب دیا ۔ وہ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج دونوں کے بیک وقت پرنسپل تھے، اس لیے تعلیم کے سرکاری اور قومی نقطۂ نظر کے فرق کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کو ڈگریاں دینے کا اختیار نہیں ملا تھا اور طلبہ ابھی تک کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات دینے پر مجبور تھے ۔ اس دو عملی کا لائٹنر کو بڑا افسوس تھا اور وہ جلد سے جلد اس دو عملی کو ختم کرکے پنجاب یونیورسٹی کو مکمل طور پر بااختیار یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنے کے متمنی تھے ۔ ۱۸۷۶ء میں جب وائسرائے ہند لارڈ لٹن Lytton پنجاب آئے تو ڈاکٹر لائٹنر نے ان سے یہ وعدہ لیا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے گا ۔ ۱۸۷۷ء میں اس وعدے کی توثیق امپرئیل اسمبلی میں کر دی گئی اور طویل انتظار کے بعد بالآخر ۱۴ اگست ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے وجود میں آ گئی ۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کا یہ سہرا صحیح معنوں میں ڈاکٹر لائٹنر کے سر ہے ۔ وہ اس یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوے ۔ ۱۸ نومبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی کی پہلی کانووکیشن منعقد ہوئی جس کی صدارت وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے بحیثیت سرپرست کی اور ڈاکٹر لائٹنر نے اردو میں رپورٹ پیش کی ۔ اسی کانووکیشن میں ڈاکٹر لائٹنر کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ڈی ۔ او ۔ ایل کی ڈگری دی گئی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر لائٹنر ڈیپوٹیشن پر ایجوکیشن کمیشن میں گئے اور پھر دو سال کے لیے طویل رخصت پر یورپ چلے گئے ۔ دسمبر ۱۸۸۴ء میں وہ واپس آئے اور اپنے مناصب کا چارج لیا ۔ لیکن تعلیمی نظام کے بارے میں حکومت کی پالیسی اور ان کے نقطۂ نظر میں جو شروع سے اختلاف چلا آتا تھا، وہ اب شدید تر ہو گیا تھا ۔ لائٹنر تعلیم کو یہاں کے باشندوں کے احساسات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اسے قومی شکل دینا ضروری سمجھتے تھے ۔ حکومت اس سے متفق نہیں تھی ۔ اس صورت حال سے لائٹنر خاصے دل برداشتہ ہو چکے تھے ۔ ان کی صحت بھی جواب دے رہی تھی ۔ اپریل ۱۸۸۶ء میں وہ چند ماہ کے لیے حکومت ہند کے دفتر امور خارجہ سے وابستہ رہ کر کشمیر، گلگت اور چترال گئے ۔ ۱۸۸۷ء میں لائٹنر انگلستان چلے گئے اور اپنے مناصب سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ووکنگ میں رائل ڈرامیٹک کالج کی عمارت

حاصل کرکے وہاں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اور تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا ۔ سہ ماہی ایشیاٹک ریویو (*Asiatic Quarterly Review* بعد میں ''ایشیاٹک ریویو'') جاری کیا اور دس سال تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے ۔ انھوں نے ۲۲ مارچ ۱۸۹۹ء کو اٹھاون سال کی عمر میں بون Bonn (جرمنی) میں وفات پائی۔

ڈاکٹر لائٹنر تقریباً پچیس زبانیں جانتے تھے ۔ انھوں نے مستشرقین کی کئی کانفرنسوں میں شریک ہو کر مقالات پڑھے اور علما سے داد حاصل کی ۔ وہ کئی مشہور علمی اداروں کے رکن تھے جن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، رائل ہنگیزین اکادمی آف سائنسز، اکیڈمی آف پیرس وغیرہ شامل ہیں ۔ انھوں نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ لاہور میں گزارا ۔ وہ صحیح معنوں میں پنجاب کے محسن تھے ۔ انھوں نے یہاں رہ کر ملکی باشندوں کی تہذیبی جنگ لڑی جس میں وہ پوری طرح کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن پنجاب یونیورسٹی کی تاسیس کے ساتھ اس کے مقاصد میں اس تہذیبی شق کو داخل کرانے میں ضرور ان کا حصہ ہے جس کی رو سے مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کو باثروت بنانے کی ذمے داری اس یونیورسٹی نے قبول کی ۔ ڈاکٹر لائٹنر جب تک یہاں رہے اپنی پرجوش طبیعت اور حریت فکر کی وجہ سے انگریز حاکموں کے لیے (خواہ وہ رتبے میں ان سے اعلیٰ تھے یا فروتر) ایک ہوّا بنے رہے ۔ وہ سخت ضابطہ پسند منتظم تھے اور اپنے ماتحتوں اور طلبہ سے اس امر میں کوئی رو رعایت نہیں کرتے تھے، لیکن اس دبدبے کے ساتھ ہی وہ بہت رحم دل بھی تھے، خصوصاً طلبہ کے لیے وہ شفقت کا پیکر تھے اور ان کے گھر کے دروازے شب و روز ان کے لیے کھلے رہتے تھے ۔ ہیبت و شفقت کا یہ ملا جلا پیکر بیس سال سے زائد عرصے تک پنجاب کے لوگوں کی تعلیمی، تحقیقی اور تہذیبی خدمت کرتا رہا۔

ڈاکٹر لائٹنر کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) *Dardistan*، حصہ ۱، ۲، ۳؛ (۲) *The Languages and Races of Dardistan*، لنڈن ۱۸۷۶ء و لاہور ۱۸۷۷ء؛ (۳) *Bashgeli Kafirs and their Languages*، ۱۸۸۰ء؛ (۴) *Dardistan in 1866, 1886 and 1888*؛ (۵) *The Hunza and Nagyr Handbook*، ووکنگ ۱۸۹۳ء؛ (۶) *Discovery of Graeco Budhistic sculptures at Takht Bhai*؛ (۷) *Appendix to "Changars" and Linguistic Fragments*، ۱۸۸۲ء؛ (۸) *Introduction to a Philosophical Grammar of Arabic*؛ (۹) *The Theory and practice of Education*؛ (۱۰) *The Races of Turkey*، ۱۸۷۱ء؛ (۱۱) *The Simla Dialect*؛ (۱۲) عربی صرف و نحو (اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں)؛ (۱۳) سنین اسلام، حصہ اوّل ۱۸۷۱ء؛ حصہ دوم ۱۸۷۶ء۔

مآخذ: (۱) H. L. O. Garret : *A History of the Government College, Lahore*، ۱۹۱۴ء؛ (۲) J. F. Bruce : *A History of the University of the Punjab*، ۱۹۳۲ء؛ (۳) *Annual Reports of the Oriental College, Lahore*، بابت ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۶ء؛ (۴) *Calendar Punjab University College*، ۱۸۷۳ - ۱۸۷۵ء؛ (۵) *A Dictionary of Indian Biography*، ۱۹۰۶ء؛ (۶) *Webster's Biographical Dictionary*؛ (۷) *Universal Renouncing Dictionary of Biography*، لنڈن ۱۹۱۸ء؛ (۸) *The Annual Register 1899*؛ (۹) دستور العمل، پنجاب یونیورسٹی کالج، ۱۸۷۳ - ۱۸۷۵ء؛ (۱۰) تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور؛ (۱۱) سیّد عبداللہ : تعلیمی خطبات۔

(غلام حسین ذوالفقار)

لِباس : (ع)؛ [لَبِسَ لُبْساً کپڑا پہننا، ⊗ اللِّباس، پوشاک، پہننے کے کپڑے؛ جمع : لُبُس و

اَلْبِسَۃٌ (المنجد، نیز لسان العرب بذیل مادۃ)] ۔ لباس تمدنی زندگی کی اہم‌ترین ضرورت ہے ۔ اس کی بنیادی غرض جسم کے قابل ستر حصوں کی پردہ پوشی ہے، [لیکن جسم کو موسمی اثرات (سردی گرمی وغیرہ) سے محفوظ رکھنا بھی ایک مقصد ہے۔ اسی طرح لباس کو شان و شوکت اور تجمل کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا جاتا ہے]۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے نزدیک ستر پوشی کی بالعموم کوئی اہمیت نہ تھی ۔ وہ اپنا ستر دوسروں کے سامنے کھول دیتے تھے؛ سر عام ننگے ہو کر کھا لیتے تھے ۔ اور بہت سے لوگ حج کے موقع پر کعبے کے گرد برہنہ طواف بھی کرتے تھے ۔ دنیا کی بعض قومیں برہنگی کو ایک مذہبی رسم کا درجہ دیتی رہی ہیں .

اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے لباس کے متعلق احکام نازل فرمائے : یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیْرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (۷ [الاعراف] : ۲۶)، یعنی اے آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا، جو کہ تمہارے قابلِ ستر بدن کو چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقوٰی کا لباس یہ اس سے بڑھ کر ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں ۔ [تقوٰی کا معنوی لباس اس ظاہری لباس سے بھی بڑھ کر ضروری ہے اور یہ لباس کا پیدا کرنا ، جس سے ستر جسم اور زینت دونوں مقاصد حاصل ہوتے ہیں، اللہ کے فضل و کرم کی نشانیوں میں سے ہے؛ انسان کے لیے لباس صرف ستر پوشی اور ظاہری زیب و زینت ہی کا سامان نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اس روح کا دل سے بھی قائل ہو جو ظاہری ستر پوشی اور پردہ پوشی کے ساتھ ساتھ شرم و حیا اور انسانی و اخلاقی اقدار کے دلی احترام کی ضامن ہو ۔ ان باطنی آداب اور مصالح کو دل سے ماننا ضروری ہے. جو ستر اور پردے کے احکام میں بسلسلۂ لباس آئے ہیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ظاہری ستر پوشی کوئی شے نہیں ۔ آج کل کچھ لوگ دل کے پردے کا ذکر کرتے ہیں اور باور کراتے ہیں کہ ظاہری پردہ کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ یہ خیال غلط ہے]۔ بہرحال لباس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی نشانیوں میں سے ایک ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے عبدالماجد دریا بادی : تفسیر ماجدی ، ص ۳۲۸، مطبوعۂ لاہور) ۔ لباس وہی ہے جو برہنگی کو رفع کرے اور اس کے علاوہ وقار میں بھی اضافہ کرے ۔ قرآن مجید میں لباس کا ذکر مجازی معنوں میں بھی آیا ہے: فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (۱۶ [النحل] : ۱۱۲)، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کی حرکات کے سبب سے) بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔ دوسری جگہ رات کو لباس [ساتر] بتایا گیا ہے : وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا (۲۵ [الفرقان] : ۴۷)، یعنی اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردے کی چیز اور نیند کو آرام کی چیز بنایا اور دن کو زندگی کی حرکت کا وقت بنایا ۔ تیسری جگہ مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے : ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ (۲ [البقرۃ] : ۱۸۷)، میاں بیوی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے وہ ان کے حق میں اوڑھنا، بچھونا ہیں اور یہ ان کے حق میں ۔ اس آیت کے مطابق معاشرے میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیے اور ایک دوسرے کی زینت بڑھانے والا .

اسلام میں کوئی خاص لباس مقرر نہیں، مگر یہ ضروری ہے کہ جو لباس بھی ہو وہ صاف ستھرا اور ساتر بدن ہو [یعنی ایسا لباس کہ جس کے

پہننے سے جسم کی بناوٹیں ظاہر نہ ہونے پائیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ جسم کے بے ڈھنگے حصے جو ذوق جمال و تناسب کے لیے ناگوار ہیں ان سے نگاہیں محفوظ رہیں اور دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ جنسی اشتعال کا سامان جس سے قرآن مجید نے دور رہنے کی تلقین کی ہے، پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ حیا اور پردے کے تصورات اسی پر مبنی ہیں [رک بہ حجاب]۔ اس کے علاوہ اس سے وقار انسانی کا تحفظ بھی مطلوب ہے۔ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ لباس پہننے والے کی حیثیت سے فرو تر نہ ہو، اور نہ ایسا ہو کہ اس سے اظہار فخر و تکبر ہوتا ہو۔ مردوں کے لیے ریشمی اور پرتکلف لباسوں کو دو وجہ سے اچھا نہیں سمجھا گیا کہ انسان اپنے عظیم اخلاقی نصب العین کے پیش نظر سخت کوشی اور دوامی جد و جہد پر مجبور سمجھا گیا ہے؛ اس لیے تکلف، تزئین اور آرائش کی زندگی کو جد و جہد کی سپرٹ کے منافی خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، اسلام کی مساواتی روح کے پیش نظر، لباس کا وہ معیار پسندیدہ سمجھا گیا ہے جو ایک عام آدمی کے لیے بھی سہل الحصول ہو۔ سخت کوشی کی زندگی کی اس حکمت کے تحت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی تھی کہ ''در آفتاب بنشینید کہ آفتاب حمام عرب است و خشن پوشید'' اور صوفیہ نے کرباس و پلاس کو اختیار کیا]۔ البتہ ریشمی اور نرم و نفیس لباس عورتوں کے لیے پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ غرض اسلام نے اگرچہ کسی خاص لباس کی قید نہیں لگائی، لیکن لباس کے لیے بعض خاصی آداب و شرائط ضرور عائد کی ہیں۔ یہ شرائط اسلام کی اخلاقیات انفرادیہ و اجتماعیہ کے تابع ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید و سنت میں ہے۔ بعض لباس ایسے ہیں جنھیں فواحش میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ ہیں جو لباس کی اصل روح سراسر ڈھانپنا (سراسر محیط ہو جانا جیسا کہ آیات مذکورہ بالا سے واضح ہے) اور وقار انسانی کے منافی اوضاع پر مبنی ہوتے ہیں، لہٰذا عریانی اور نیم برہنگی کے قریب قریب لباس بھی ممنوع ہیں۔ اس کی تائید سورۃ النور کی آیات حجاب سے ہوتی ہے [رک بہ حجاب]۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جن کے کپڑوں سے برہنگی ظاہر ہوتی ہو (مسلم کتاب اللباس، نیز البخاری کتاب اللباس).

ایک مسلمان دنیا بھر کے لباس (موسم و آب و ہوا اور رسم و رواج کے تحت) استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ ان میں آداب و شرائط مذکورۂ بالا کا لحاظ رکھا گیا ہو.

اس سلسلے میں شعار قومی کے طور پر، مسلمانوں کو یہ بھی حکم ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے اتباع سے بچیں اور اپنی انفرادیت کو دوسری باتوں کے علاوہ لباسوں میں بھی قائم رکھیں۔ یہ دراصل قومی تشخص کے تحفظ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آج کل بعض لوگ مغربی بین الاقوامیت کی آڑ میں مغرب کے بعض لباسوں کی ترویج کے قائل ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی اپنی ایک خاص بین الاقوامیت بھی ہے اس کا اتباع مغرب کی بین الاقوامیت کے اتباع سے مقدم اور مستحسن ہے۔ کسی بھی ایسی تہذیب کا اتباع جو اس اسلامی تشخص کی نفی کرتی ہو، اسلامی تعلیمات کے مطابق پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فقہا نے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کے تحت دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے کی مخالفت کی ہے اور اسی کے تحت بعض ملکوں میں مسلم اور غیر مسلم لباسوں میں فرق بھی نظر آتا ہے.

احادیث سے پتا چلتا ہے کہ عہد رسالت میں عرب میں عام طور پر سراویل، ازار، عمامہ، عبا، جلباب، قمیص اور خمور (جمع: خِمار = اوڑھنیاں) وغیرہ

مستعمل تھیں، یمن کی چادریں اور صوف کے جبے بھی پہنے جاتے تھے۔ عہد جاھلیۃ میں اھل ثروت عرب حریر (ریشم) کا بنا ہوا لباس بھی پہنا کرتے تھے؛ (بخاری، کتاب اللباس؛ سنن ابی داؤد کتاب اللباس؛ مسند احمد بن حنبل)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے لباس کے متعلق مذکور ہے کہ آپؐ کا عام لباس چادر، قمیص اور تہمد تھا، عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا اور عمامے کے نیچے سر سے لگی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آپؐ کو یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں جن کو عربی میں حِبَرہ کہتے تھے، لیکن آپؐ نے بعض اوقات شامی عبا بھی استعمال کی ہے۔ آپؐ کو سفید رنگ کے کپڑے بہت مرغوب تھے (البخاری: الصحیح، باب اللباس؛ ابو داؤد: السنن، کتاب اللباس؛ احمد بن حنبل: مسند ۱: ۲۴۷، مطبوعۂ قاھرہ) ۔ صحابۂ کرام بھی جو آنحضرتؐ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے اتباع کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے یہی لباس پہنا کرتے تھے۔ بعد میں عام مسلمانوں نے بھی بالعموم اس کی پیروی کی۔

عہد بنو امیّہ میں جب اسلامی فتوحات کی وجہ سے فارغ البالی اور مرفہ الحالی کا دور دورہ ہوا تو لباس کی تراش خراش پر بھی اس کا اثر پڑا اور ریشم کے کپڑوں کا رواج عام ہونے لگا۔ بعض اکابر مثلاً محمد ابن الحنفیہ، مُطَرَّف نقش و نگار والی ریشم کی چادر اوڑھتے تھے (ابن قتیبہ: عیون الاخبار، ۱: ۲۹۸، قاھرہ ۱۹۲۵ء) ۔ شوقین مزاج لوگ گھوڑے کی سواری کے وقت غَلَالَہ (شَلْوکَہ) اور تنگ مُہری کے پاجامے پہننے لگے، البتہ گھر میں ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے جاتے تھے۔ اس زمانے میں تنگ قبا کا بھی رواج ہو چلا تھا۔ صحرا نشین بدوی اور عام دیہاتی سفید رنگ کے جبّے اور دھاری دار اور زرد کوفیہ پہنتے تھے۔ یہاں تک کہ فقیہ اور کاتب (دفتروں کے بڑے عہدے دار) بڑے بڑے سفید اور نیلے عمامے سر پر پہننے لگے۔ عام لوگ سرخ رنگ کے نوکدار جوتے استعمال کرتے تھے۔ حکمران طبقہ معطر چادریں (مُلاوۃ مطیّبۃ) بھی پہنا کرتا تھا) A Short History of the Saracens : Ameer Ali ص ۲۰۳، لنڈن ۱۹۶۱ء؛ الاغانی، ۱ ۲۴، قاھرہ ۱۲۸۵ھ، بحوالۂ شفیق جبری : دراسۃ الاغانی، ص ۲۳۶، دمشق ۱۹۵۱ء)۔

کتب تاریخ میں پیشہ ورانہ الگ لباسوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی طرح الگ عسکری لباس کا بھی۔ (اس کے لیے رک بہ علم (حربیات))۔

بنو عباس کے زمانے میں عوام سوتے کپڑے کی چادر، قمیص اور تہمد پہنا کرتے تھے۔ کمر کے گرد کمر بند یا پٹکہ ہوتا تھا اور شانوں پر ردا (چادر) ڈال لی جاتی تھی۔ مفلوک الحال لوگ برکان (سیاہ رنگ کا کمبل) استعمال کرتے تھے (ابن قتیبہ: عیون الاخبار، ۱: ۲۹۹، قاھرہ ۱۹۲۵ء) ۔ شوقین لوگ عمدہ اور نرم کتان (دَبِیقی و جَنَابی) کی بنی ہوئی ڈھیلی ڈھالی اور خوش رنگ قمیص، پتلی بنیانیں، نیشا پوری جُبّے، یمن کی بنی ہوئی سوتی چادریں، سون، تَوَّمس اور سَلُول کی منقش چادریں پہنا کرتے تھے۔ ایرانی ملبوسات کا بھی رواج تھا۔ شرفا زعفرانی رنگ کو ناپسند کرتے تھے۔ مردوں کو سفید رنگ کے کپڑے مرغوب تھے۔ لطف و نشاط کی مجلسوں اور بے تکلف صحبتوں میں رنگے ہوئے کرتوں، عنبر میں رنگی ہوئی قمیصوں اور رنگین چادروں اور زعفرانی ازار کے استعمال میں مضائقہ نہ تھا۔ اونچے گھرانے کی خواتین دخانی کپڑے، شلوکے، رشیدی، خراسانی اور طبری چادریں، نیشاپوری دوپٹے، سفید ڈھیلی شلواریں اور سیاہ رنگ کی اوڑھنیاں زیب تن کیا کرتی تھیں۔ ان کو سفید، زرد، سیاہ اور سبز

رنگ کے کپڑے ناپسند تھے ۔ سہاگن عورتیں رنگین لباس استعمال کرتی تھیں ۔ سرخ زرد، سبز، سیاہ گلابی اور سرخ رنگ کے رنگے ہوئے کپڑے ادنیٰ درجے کی نبطی عورتیں اور گانے والیاں استعمال کرتی تھیں ۔ اگر ان رنگوں میں دوسرے رنگ کی آمیزش ہوتی یا صندل اور مشک سے ان رنگوں کو مٹا دیا جاتا تو یہ کپڑے مرغوب خاطر بن جاتے تھے ۔ ان کے علاوہ مختلف اقسام کے ریشم کے رنگا رنگ کپڑے بھی استعمال ہوتے تھے ۔ ازار بند (تکّہ) کا رواج نہ تھا (الوشّا : کتاب الموشّی، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶، لائیڈن ۱۸۸۶ء) ۔ ارباب نشاط اور لونڈیاں گلابی رنگ کا پاجامہ، گلابی رنگ کی قمیض اور گلابی رنگ کا دوپٹا اوڑھے رہتی تھیں جو ان پر بہت سجتا تھا ۔ مشہور مغنی اسحٰق موصلی سرخ قبا، سرخ موزے پہنا کرتا تھا ۔ سر پر زرد رنگ کے ریشم کی پٹی ہوتی تھی جو سرخ رنگ کے ریشمی فیتے سے بندھی ہوتی تھی ۔ ہارون الرشید کھلے جبے، منقش عمامے اور منقش تہمد پہنا کرتا تھا (الاغانی، ۵ : ۲۹، قاہرہ ۱۲۸۵ھ) ۔ کپڑا تیار کرنے کی کھڈیاں خراسان، مصر، کوفے اور سوس میں تھیں ۔ سوس میں جو ریشمی کپڑا بنتا تھا، وہ سوسی کہلاتا تھا (الاغانی، ۵ : ۶۰، قاہرہ ۱۲۸۵ھ، بحوالۂ شفیق جبری : دراسۃ الاغانی، ص ۱۱۴، دمشق ۱۹۵۱ء)۔

اشراف ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، غلالۃ (شلوکہ)، قفطان، قبا اور عبا یا جبّہ پہنا کرتے تھے ۔ سر پر عمامہ اور اس پر طیلسان ہوتا ۔ بعض اوقات طیلسان کندھوں پر پڑا رہتا ۔ اشراف ٹوپی (قلنسوہ [رک بآں] سر پر رکھتے تھے جس کے نیچے ہلکی ریشمی ٹوپی ہوتی تھی ۔ خلفا ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے تھے ۔ امرا اور اہل ثروت موزے (جرابین) بھی پہنا کرتے تھے جو ریشم اور پشم کے ہوتے تھے ۔ چرمی موزوں کا بھی رواج تھا ۔ عباسی خلفا کے عہد میں سرکاری لباس سیاہ تھا ۔ دربار میں آنے کے لیے سیاہ لباس ضروری تھا ۔ امیر گھرانوں کی خواتین کے سروں پر ایک تاج نما ٹوپی ہوتی تھی جس میں ہیرے، موتی اور جواہرات جڑے ہوتے تھے ۔ ٹوپی کے زیریں حصے کا گھیرا سنہری ہوتا جو جواہرات سے مزین ہوتا ۔ یہ ٹوپی ہارون الرشید کی ہمشیرہ علیہ نے رائج کی تھی ۔ Ameer Ali : *A Short History of the Saracens*، ص ۳۵۳، ۳۵۴، لنڈن ۱۹۶۱ء)۔

اندلس میں عرب اپنا لباس اپنے ساتھ مشرق سے لائے تھے، لیکن وہ عمدگی، صفائی اور پاکیزگی میں اپنے مشرقی ہم مذہبوں سے بازی لے گئے تھے ۔ عورتوں میں عمدہ لباس کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا ۔ ان کے ملبوسات عمدہ اور باریک ململ اور ریشم کے ہوتے تھے، جڑاؤ زیورات کا استعمال عام تھا ۔ سپاہ میں بڑی بڑی پگڑیوں کا استعمال متروک ہو گیا تھا ۔ اندلس کے مشرقی اضلاع بلنسیہ اور مرسیہ وغیرہ میں قضاۃ اور فقہا عماموں کے بجائے قلنسوہ (ٹوپی) پہنا کرتے تھے ۔ اندلس کے مغربی اضلاع قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ میں عمامے کا رواج تھا اور قاضی اور فقیہ چھوٹے چھوٹے عمامے پہنا کرتے تھے ۔ متأخر صدیوں میں اہل اندلس نے اپنے فرنگی ہمسایوں کی تقلید شروع کر دی تھی ۔ اور فرنگیوں جیسا لباس پہننا شروع کر دیا تھا (Ameer Ali : *A Short History of the Saracens*، ص ۵۷۱ تا ۵۷۲، لنڈن ۱۹۶۱ء) اور یہیں سے ان کی انفرادیت اور الگ تشخص کے احساس کا زوال شروع ہوا۔

مصر ہمیشہ سے دنیائے عرب کا علمی، تمدنی اور ثقافتی مرکز رہا ہے ۔ یہاں کے رسم و رواج اور کپڑوں کی وضع قطع کی تقلید شام، حجاز اور المغرب کے بیشتر ممالک میں کی جاتی رہی ہے ۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک عوام کا

لباس سادہ رہا ہے ۔ وہ تنگ پاجامہ، نیلی ململ یا موٹے سوت کی لمبی قمیص یا بڑا سا جُبّہ پہنا کرتے تھے ۔ یہ جبہ گلے سے لے کر سینے تک کھلا رہتا تھا ۔ اونی جبہ زَابُوط کہلاتا تھا اور سردیوں میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ جبے کے اوپر بعض لوگ سفید یا سرخ اون کی پیٹی باندھ لیا کرتے تھے جبکہ گھریلو ملازمین سرخ اون یا چمڑے کی چوڑی پیٹی سے، جس میں روپے پیسے رکھنے کے لیے جیب سی ہوتی تھی ۔ نمایاں نظر آتے تھے ۔ ان کے سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، اس پر طربوش (ترکی ٹوپی) اور طربوش کے گرد زرد اونی شال یا ململ کا ٹکڑا لپٹا ہوتا ۔ غربا صرف نیلی یا خاکی قمیص پر اکتفا کرتے جو کھلی آستینوں کی ہوتی ۔ سردیوں میں عام لوگ عبایہ پہنتے تھے ۔ یہ سوتی کپڑے کا ہوتا تھا جس پر سفید یا نیلی یا خاکی رنگ کی چوڑی دھاریاں ہوتی تھیں ۔ سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کا وسیع و عریض اونی جبہ بھی استعمال ہوتا تھا جو دِفّیہ کہلاتا تھا ۔

متوسط اور بالائی طبقہ تنگ پاجامہ پہنتا تھا جو گھٹنوں کے نیچے ٹخنوں تک رہتا اور اسے تکہ یا ازار بند سے باندھا جاتا جس کے دونوں سرے ریشمی ہوتے تھے ۔ اس کے علاوہ کھلی آستینوں کی سوتی یا ریشمی قمیص ہوتی تھی ۔ سردیوں میں اس کے اوپر صدیری پہن لی جاتی تھی جو بغیر آستینوں کی ہوتی تھی ۔ یا قُفطان ہوتی جس کی آستینیں ہاتھ کی انگلیوں سے بھی آگے نکلی ہوتی تھیں، کمر پر شال یا ململ کا پٹکا ہوتا اور سب سے اوپر لمبا سا کوٹ یا جبہ ہوتا تھا ۔

مصر میں مختلف قسم کے عمامے بھی پہنے جاتے تھے ۔ عام مسلمان گہرے زیتونی رنگ کے عمامے استعمال کرتے تھے جبکہ قبطی عیسائی اور یہودی سیاہ یا نیلگوں ململ کے عماموں میں نظر آتے تھے ۔ شریف (ج اَشراف = سید زادے) سبز رنگ کا عمامہ پہنتے تھے ۔ علما اور ادبا ایک چوڑا سا عمامہ سر پر باندھتے تھے جو مقلہ کہلاتا تھا ۔

متوسط اور بالائی طبقے کی عورتوں کا لباس خوشنما ہوتا تھا ۔ وہ زیادہ تر سیاہ کریب کی قمیص استعمال کرتی تھیں ۔ پاجامہ (شَنْتیان) سفید ململ یا چھینٹ کا ہوتا اور اس کو تکّہ یا ازار بند سے باندھا جاتا ۔ قمیص کے اوپر قُفطان سے ملتی جلتی ایک واسکٹ سی پہنی جاتی جس کی آستینیں لمبی ہوتیں اور سینے سے لے کر کمر تک بٹن لگے ہوتے تھے ۔ سینہ بند (brassiere) کا بھی رواج تھا جو عَنْتَری کہلاتا تھا ۔ شال یا کاڑھے ہوئے رومال سے کمر باندھ لی جاتی ۔ سر پر طاقیہ اور طربوش ہوتی اور اس کے گرد چھینٹ یا ململ یا کریب کا رومال لپٹا ہوتا ۔ اس کے علاوہ امیر عورتیں سر پر ململ یا رنگ دار کریب کے کپڑے کا بڑا سا ٹکڑا (دوپٹا) رکھا کرتیں جس کے دونوں سرے سنہری یا سونے کے تاروں کے ہوتے ۔ یہ طرحہ کہلاتا تھا اور زمین کو چھوتا رہتا تھا ۔ گھر سے باہر نکلتے وقت برقع پہنا جاتا جو پاؤں تک ہوتا اور اس میں صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں ۔ اس پر تین گز لمبا ایک قسم کا جبہ ڈال لیا جاتا تھا جو حِبرہ کہلاتا تھا ۔ زرد یا سرخ رنگ کے مراکشی چمڑے کی اونچی ایڑیوں اور سونے کے کام والے زنانے جوتوں کا بھی رواج تھا ۔ بعض پر موتی بھی لگے ہوتے تھے (Edward William Lane : *The Manners and Customs of the Modern Egyptians*، بار پنجم، ص ۳۰ تا ۴۸ مطبوعۂ لنڈن) ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مصر کے شہروں میں کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی پہننے کا رواج ہو گیا تھا، لیکن عام لوگ شہروں اور قصبات میں نیلگوں لمبا کرتا ہی پہنتے ہیں جسکا چاک کھلا رہتا ہے، خواص قُفطان اور عبا پہنتے ہیں، جس میں گردن

کھلی رہتی ہے۔

مکّۂ معظمہ میں انیسویں صدی کے آخر تک جبہ اور عنتری پہنے جاتے تھے (Snouck Hurgronje : *Mecca in the Latter Part of the 19 century*، ص ۳۵، لائیڈن ۱۹۷۰ء)۔

ترکیہ میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک واسکٹ کا استعمال عام تھا۔ اس کے اوپر عبا پہنی جاتی تھی۔ علما، مدرسین اور متوسط طبقے کے افراد پتلون نما پاجامہ پہنتے تھے۔ ان پاجاموں کے اوپر گھیر ہوتا تھا اور پتلون کی طرح بٹن ہوتے تھے۔ ترکی ٹوپی مسلمانوں کے علاوہ عیسائی اور یہودی بھی استعمال کرتے تھے۔ ترکی ٹوپی کے اوپر سفید رنگ کی چھوٹی سی دستار ہوتی تھی، جسے عربی میں لَفّہ کہتے تھے اور یہ اہل علم کی خاص علامت سمجھی جاتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عورتیں گھروں میں یورپی لباس پہننے لگی تھیں، البتہ باہر نکلتے وقت ڈھیلا ڈھالا ریشمی گاؤن Gown پہن لیتی تھیں جو گردن سے پاؤں تک ہوتا تھا اور اوپر سے نیچے تک بٹن لگے ہوتے تھے۔ سر پر قصابہ ہوتا تھا اور چہرہ ایک رومال سے ڈھکا ہوتا تھا اور دونوں آنکھیں کھلی رہتی تھیں (شبلی نعمانی: سفر نامۂ روم و مصر و شام، ص ۷۳، ۷۴، ۱۹۴، لاہور ۱۹۶۱ء)۔ مصطفیٰ کمال پاشا (اتا ترک) نے تنسیخ خلافت کے بعد قدیم وضع کے لباس کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ اب ترکی ٹوپی کی جگہ یورپی ہیٹ نے لے لی اور عورتیں بھی عام طور پر انگریزی لباس پہننے لگیں۔

مسلمان ایران میں وارد ہوے تو وہ کرتا، تہمد اور عبا پہنتے تھے۔ بغداد کے عباسی دربار کے زیر اثر ایران میں بھی پاجامہ، قبا اور عمامے کا رواج ہوا۔ متأخر صدیوں میں یہاں جامہ، زیر جامہ قبا، شلوار اور پیشواز اور دستار استعمال ہونے لگی۔ مابعد کی صدیوں میں کلاہ اور طاقیہ زیب سر بنی۔ علما اور قضاۃ دراعہ (جبہ) پہننے لگے۔ امرا اور رؤسا کے ہاں اطلس، کمخواب اور دیبقی کے کپڑے پہنے جاتے تھے۔ سردیوں میں قاقم اور سمور زیب تن کیے جاتے۔ قلندر لنگوٹے پر اکتفا کرتے تھے۔ ارباب تصوف پشمینے کی چادر اور دلق (گودڑی) میں گزر بسر کر لیتے تھے۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ زربفت، مخمل، گلبدن اور سنہری مقیش سے مزین ملبوسات تیار ہونے لگے۔ ان کپڑوں کے کارخانے زیادہ تر کاشان اور اصفہان میں تھے۔ متوسط اور اونچے طبقے کی خواتین مقنع (برقعہ) پہنتی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ریشمی کپڑے تھے جو اسکندری، انطاکی، جہرمی، حلی، خسروی، روسی، رومی باف، شاہی، طوسی، قبرسی، کلی، مرشدی، ناری، زرینہ، سمینہ، ابریشمینہ وغیرہ کہلاتے تھے۔ شدید سردی میں مختلف اقسام کی پوستینیں پہنی جاتی تھیں جو اوک، آس، الطائی، برناس، دلہ، خز، سمور، سنجاب، سیاہ برہ، صدر، شکم، قاقم، قرساق، قندس، کاسو، کول، کیش اور وشق کہلاتی تھیں (نظام الدین محمود: دیوان البسہ، قسطنطینیہ، ۳، ۱۳ھ)۔ ایران میں قاجاری دور سے انگریزی لباس رائج ہوا۔ رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں پہلوی کیپ (ٹوپی) کا آغاز ہوا۔ اب ایران کے اکثر شہروں میں لوگ انگریزی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ برقع اور نقاب متروک ہو گئے ہیں، البتہ علما اور دینی طلبہ اب بھی عبا، قبا، پاجامہ اور عمامہ پہنتے ہیں۔ بعض شہروں میں عورتیں باہر نکلتے وقت چادر نماز اوڑھ لیتی ہیں جو سر سے لے کر ٹخنوں تک ہوتی ہے لیکن آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔

مسلمان برصغیر میں وارد ہوے تو ہندو عوام نیم عریانی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ بے سلی ہوئی چادروں، ساریوں اور دھوتیوں سے بدن ڈھانپتے تھے۔ عوام اور فقرا صرف دھوتی یا

لنگوٹی پر اکتفا کرتے تھے۔ [illegible]ا میں جو عرب ہندوستان میں وارد ہوے، [illegible] کرتے، تہمد اور عبائیں پہنتے تھے، لیکن ایرا[illegible] توران سے آنے والے زیرین لباس پہنتے تھے، جسے ہم مشرقی پاجامہ کہتے ہیں۔ ہلکی شلواروں کا بھی رواج تھا۔ مختلف زمانوں میں ان کپڑوں کی وضع قطع اور تراش خراش میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ امرا درباروں میں تاتاری اور مخمل کی زر دوزی قبا پہنتے تھے جس پر سفید پٹی ہوتی تھی۔ سردیوں میں حسب حیثیت گرم کپڑے، کمبل یا شالیں اوڑھی جاتیں۔ مغلوں سے پہلے کے سلاطین اور ان کے درباری تورانی اور خراسانی لباس ہمراہ لائے، چنانچہ یہی ان کا ملبوس رہا۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں درباری لباس میں ایرانی ذوق کے مطابق کچھ تبدیلی ہوئی۔ عبدالحلیم شرر کے بیان کے مطابق دہلی میں دربار مغلیہ کا آخری لباس یہ تھا: سر پر پگڑی، بدن میں نیم جامہ (کہنیوں تک آدھی آستینوں کا شلوکہ جس میں سینے پر گھنڈیاں لگائی جاتی تھیں)، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا اور کمر میں جامے کے اوپر پٹکا۔ عام لوگ کرتا اور پاجامہ یا تہمد پہنتے تھے۔ ایران سے آنے والوں کی قبا دیکھ کر بالابر ایجاد ہوا جس میں گول گریبان بالکل کھلا رہتا۔ اسی بالابر نے ترقی کر کے دہلی میں انگرکھے کی شکل اختیار کی، جس میں سینے پر چولی قبا سے لی گئی اور ایک گول اور لمبوترا گریبان بڑھا دیا گیا۔ یہ انگرکھا سارے ہندوستان میں پھیل گیا (عبدالحلیم شرر: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، یعنی قدیم لکھنؤ، ص ۳۰۷ تا ۳۰۹، کراچی ۱۹۵۶ء)۔ لکھنؤ میں نیمے کے عوض شلوکا ایجاد ہوا، جس میں آگے کی طرف بٹن لگائے جاتے تھے پھر لکھنؤ کے آخری عہد میں اچکن ایجاد ہوئی اور آناً فاناً سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور یہی اچکن حیدرآباد (دکن) پہنچ کر تھوڑی سی ترمیم کے بعد شروانی بن گئی۔ شلوکے کے بجائے ڈھیلا اونچا کرتا اختیار کیا گیا اور انگریزی دور میں قمیص نے رواج پایا جس میں کف اور کالر ہوتے ہیں۔ سردیوں میں روئی دار دگلا اور روئی دار صدری اور کشمیری چادریں پہنی، اوڑھی جاتی تھیں۔ اب اونی سویٹر کا رواج ہے۔

ابتدائی دور کے مسلمان امرا، وزرا اور سلاطین کے عمامے بڑے بڑے ہوتے تھے، لیکن مغلیہ عہد میں پگڑیاں روز بروز چھوٹی ہونے لگیں، پگڑی کے نیچے باریک کپڑے کی ٹوپی ہوتی تھی۔ پگڑی کے بجائے کمرخی، چوگوشیہ، پنج گوشیہ اور جاڑوں کی ضرورت کی وجہ سے نہایت نفیس اور کامدار ٹوپیاں ایجاد ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے زمانے سے قبل دو پلڑی کا رواج ہوا جو عام لباس کا لازمہ بن گیا۔ انگریزوں کے عہد میں سر سید احمد خان کے زیر اثر ترکی ٹوپی نے قبول عام حاصل کیا اور سارے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لباس کا جزو بن گئی۔ بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں پنجاب اور سرحد میں پشاوری، مشہدی اور یزدی لنگیوں (پگڑیوں) کا رواج تھا۔ تحریک پاکستان میں جناح کیپ، اچکن، قمیص اور شلوار کے ساتھ قومی نشان بن گئی۔ ایک طبقے میں رامپوری وضع کی ٹوپی بھی پہنی جاتی ہے۔ علماے دین اور صوفیہ ابھی تک لمبے کرتے، پاجامے، اچکن یا عبا اور عمامے میں نظر آتے ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں سے پہلے دھوتی کا رواج تھا، (بلکہ چرمی جوتوں کا رواج بھی نہ تھا؛ دیکھیے Vadia: *India on the Eve of Muslim Conquest*)۔ مسلمان فاتح پاجامے اپنے ساتھ لائے۔ بعض عابد و زاہد

سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کی پیروی میں تہمد بھی باندھتے تھے ۔ مسلمانوں کا پہلا اور اصلی پاجامہ تنگ سہری کا اٹنگا پاجامہ تھا جو شرعی پاجامہ کہلاتا تھا ۔ چند روز بعد سہری کسی قدر لمبی اور نیچی ہوگئی ۔ دہلی کے آخری عہد تک کابل و قندھار میں دو قسموں کے پاجامے مروج تھے ۔ کابل والوں کا پاجامہ نیچے سہری کے پاس سے تنگ اور اوپر گھیر کے پاس سے بہت ڈھیلا ہوتا اور ایک ایک پاجامے پر تھان بھر کپڑا لگ جاتا ہے ۔ اہل قندھار ایسا پاجامہ پہنتے ہیں کہ اوپر کا گھیر چھوٹا اور پائنچے بڑے گھیر کے ہوتے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے لکھنؤ میں گھٹنے کا رواج عام ہوا ۔

عورتوں کا عام لباس : برصغیر پاک و ہند میں غیر مسلم عورتوں کا قدیم لباس ایک بے سلی چادر ہوتی تھی جو آدھی کمر سے لپیٹ کر باندھ لی جاتی اور آدھی کندھے یا سر پر اوڑھ لی جاتی ۔ سینے کا لباس شمالی ہند میں انگیا اور جنوبی ہند میں چولی کہلاتا تھا اور اب بھی یہی نام معروف ہے ۔ مسلمان سلے ہوئے کپڑے اور کرتا، پاجامہ ساتھ لائے ۔ مسلمانوں کی عورتیں ایران اور ترکستان سے ڈھیلے پائنچوں کے پاجامے پہنے ہوئے یہاں آئیں ۔ کچھ عرصے بعد وہ پاجامے تنگ سہری کے ہو گئے ۔ یہ پاجامے کتان، اطلس، گلبدن اور سوسی کے ہوتے تھے ۔ زنانہ لباس میں نورجہاں نے نہایت عمدہ جدّتیں اور اختراعیں کیں ۔ مغل شہزادیاں نیمہ اور پیشواز پہنتی تھیں ۔ ان کے علاوہ مخمل، زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہروی، طاس، گجراتی، مقیش، دارائی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، اطلس ختائی، خز، مطبق کے ریشمی کپڑے بھی پہنے جاتے تھے (ابوالفضل : آئین اکبری، بحوالۂ عبدالمجید سالک : مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۴۵۹ تا ۴۶۱، بار دوم، مطبوعۂ لاہور) ۔ ڈھاکے کی ململ کے بنے ہوئے کپڑے نفاست اور عمدگی میں بے مثال تھے ۔

لکھنؤ میں مسلمان بیگمات تنگ سہری کا کھنچا ہوا پاجامہ، سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی انگیا اور کرتی پہنتیں ۔ ۱۸۵۷ء کے قریب کے زمانے میں آدھی آستینوں کے تنگ شلوکوں کا رواج ہو گیا اور انگریزوں کے عہد سے قبل بھی اس کے عوض ڈھیلے کرتے پہنے جانے لگے ۔ سردیوں میں شالیں اوڑھی جاتی تھیں ۔

پنجاب بالخصوص مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی معاشرت اہل دہلی سے متأثر رہی ہے ۔ عام مسلمان عورتیں کرتی یا کرتا، دوپٹا اور گھاگھرا (لنہگا) پہنا کرتی تھیں ۔ بالائی طبقے کی خواتین چوڑی دار پاجامہ، لمبا کرتا اور دوپٹا استعمال کرتی تھیں ۔ گرمیوں میں بالائی لباس نفیس ململ، چکن، تن زیب اور آب رواں کا ہوتا جب کہ سردیوں میں مخمل، بانات اور پشمینے کی مختلف اقسام کے کپڑے اور کشمیری چادریں مرغوب خاطر تھیں ۔ چوڑی دار پاجامے کتان، اطلس، گلبدن اور سوسی کے ہوتے تھے، لیکن اب زیادہ تر لٹھے یا رنگدار ریشم کی شلواروں کا رواج ہے ۔ بعض گھرانوں میں لنہگے، ساڑھیاں اور غرارے بھی پہنے جاتے تھے ۔ مغربی پنجاب کے مختلف اضلاع مثلاً جھنگ اور سرگودھا وغیرہ میں عورتیں تہمد بھی باندھتی ہیں ۔ سرحد اور بلوچستان میں عورتیں ڈھیلے ڈھالے لمبے کرتے، چوڑے گھیرے کی شلواریں، چادریں یا بڑے عرض کے دوپٹے پہنتی اوڑھتی ہیں ۔ کرتوں پر شلوکہ یا صدری ہوتی ہے جس پر ریشم یا کلابتوں کا کام ہوتا ہے ۔

مسلمان عورتیں برقع بھی اوڑھتی ہیں جو علی العموم سفید کپڑے کا ہوتا تھا ۔ بعد میں سیاہ کریب کا ترکی برقع رواج پا گیا، مگر اب انگریزی تمدن کے

اثرات کے تحت اس کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے ۔ دیہات میں ابھی تک چادر یا موٹا دوپٹا اوڑھنے کا التزام ہے اور بعض خاندانوں میں برقع بھی استعمال ہوتا ہے ۔

لباس میں آخری اور اہم چیز جوتا ہے ۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں جوتے کا رواج نہ تھا ۔ جوتے کے بجائے یہاں لکڑی کی کھڑاویں استعمال کی جاتی تھیں ۔ مسلمان اپنے ساتھ چمڑے کے جوتے لائے ۔ سلاطین دہلی اور ان کے امرا و وزرا اونچی ایڑی کی کفش نما جوتیاں پہنتے تھے ۔ دہلی کے آخری عہد میں چڑھواں جوتا ایجاد ہوا ۔ اس کے بعد سلیم شاہی جوتا نکلا جس پر کلابتوں کا کام بننے لگا ۔ لکھنؤ میں لال نری کے سبک اور نفیس جوتے بنائے جاتے تھے ۔ بعد میں یہ جوتے کلابتونی مخمل اور بانات کے بننے لگے ۔ ان کی آرائش میں اور ترقی ہوئی تو سلمہ ستارے کے کام کے جوتے بننے شروع ہوے ۔ سستے داموں کے جوتوں پر جھوٹا سلمہ بھی لگا دیا جاتا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک گھیتلا جوتا مروج تھا جو امرا اور اونچے طبقے کے شریف گھرانوں میں پہنا جاتا تھا ۔ اس کی وضع قطع میں مختلف اوقات میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ پنجاب میں زیادہ تر نری کے دیسی جوتے کا رواج رہا ہے ۔ مغربی پنجاب اور صوبۂ سرحد میں چپل پہنی جاتی ہے ۔ اعلیٰ اور قیمتی چپل پر زردوزی کا کام بنایا جاتا ہے ۔ بعض مقامات پر جوتوں کا بھی رواج ہے ۔ تلے دار پشاوری جوتا ملک بھر میں مشہور ہے ۔ انگریزی دور سے پاکستان میں انگریزی وضع کے سلیپروں، پمپ شوز اور بوٹوں کا رواج چلا آیا ہے ۔

مآخذ: (۱) Ameer Ali: *A Short History of the Saracens*، لنڈن ۱۹۶۱ء؛ (۲) Snouck Hurgronje: *Mecca in the Latter part of the 19th century*، لائیڈن، ۱۹۷۰ء؛ (۳) Edward William Lane: *The manners and customs of the Modern Egy...*، ص ۳۰ تا ۵۰، بار پنجم، مطبوعۂ لنڈن؛ (۴) البخاری: الجامع الصحیح، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۵) ابو داؤد: سنن، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۶) احمد بن حنبل: مسند، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۷) ابن قتیبہ: عیون الاخبار، ۱: ۶۹۶ تا ۲۰۰، قاہرہ ۱۹۲۵ء؛ (۸) الاغانی، طبع شنقیطی، قاہرہ ۱۲۸۵ھ؛ (۹) الوشا: کتاب الموشی، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶ لائیڈن ۱۸۸۸ء؛ (۱۰) شفیق جبری: دراسۃ الاغانی، دمشق ۱۹۵۱ء؛ (۱۱) نظام الدین محمود قاری: دیوان البسہ، قسطنطنیہ، ۱۳۰۳ھ؛ (۱۲) شبلی نعمانی: سفر نامۂ روم و مصر و شام، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۳) عبد الحلیم شرر: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (قدیم لکھنؤ)، ۲۰۶ تا ۲۹۳، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۱۴) عبد المجید سالک: مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۵۹ تا ۳۶۱، بار دوم، مطبوعۂ لاہور [نذیر حسین رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

لُبّے: Labbai یا Lubbay؛ تامل میں الہے؛ (کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ ''عربی'' کی مسخ شدہ شکل ہے) ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے کا نام جو جُنکہ بھی کہلاتے ہیں (سنسکرت: یَوَن yavana بہ معنی ''یونانی مغربی'') ۔ انہیں اُن عرب مہاجرین کی اولاد خیال کیا جاتا ہے جنھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کر لیں، لیکن اب ان میں اور اصل باشندوں میں لباس، حجامت اور داڑھیوں کی تراش کی خاص وضع کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں پایا جاتا ۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں زیادہ تر جنوبی ہند کے مشرقی ساحل پر آباد ہیں ۔ ان میں سے بیشتر شافعی المذہب سنی ہیں اور ان کا مرکزی مقام ناگور ہے جہاں ان کے سرپرست ولی شاہ الحمید عبدالقادر (م ۱۶۰۰ء) مدفون ہیں جو عوام میں ''قادر ولی''

یا ''میزان شاہ'' کے نام سے مشہور ہیں (دیکھیے Gazetteer of the Tanjore District ص ۲۴۳)۔ قرآن مجید کے ترجمے تامل زبان میں بھی موجود ہیں اور ان کا رسم الخط عربی ہوتا ہے۔ لبّے عموماً محنتی اور باہمت لوگ ہیں خصوصاً ماہی گیری اور تجارت کے پیشوں میں۔

مآخذ: (۱) E. Thurston: *Castes and Tribes of Southern India*، مدراس ۱۹۰۹ء، ۴: ۱۹۸ ببعد؛ (۲) قادر حسین خان: *South Indian Musulmans*، مدراس ۱۹۱۰ء، ص ۲۹ ببعد؛ (۳) *Manual of the Administration of the Madras Presidency*، مدراس ۱۸۹۳ء، ۳: ۴۳۷۔

(T. W. Arnold)

* لَبَّیک: رک بہ تلبیہ۔

* لَبْلَہ: [= نِبْلَہ]؛ اندلس کے جنوب مغربی حصے میں اشبیلیہ سے ۴۵ میل مغرب کی جانب دریائے ٹنٹو Tinto کے دائیں کنارے پر [صوبۂ ولبہ کے] ایک چھوٹے سے شہر کا نام ہے [. . . . تفصیل کے لیے دیکھیے ڈوزی لائیڈن، بار اوّل بذیل مادّہ]۔

مآخذ: (۱) الادریسی: *Description de l'Afrique et l'Espagne* طبع Dozy و ڈخویہ، ترجمہ ص ۱۷۴، ۱۷۸، ۲۰۹، ۲۱۵؛ (۲) یاقوت: معجم البلدان، طبع وسٹنفلڈ، ۲: ۳۳۲ اور ۴: ۳۴۶؛ (۳) E. Fagnan: *Extraits inédits relatifs au Maghreb*، پیرس ۱۹۲۴ء، اشاریہ؛ (۴) ابن القوطیّہ: فتح اندلس، طبع J. Ribera، میڈرڈ ۱۹۲۶ء، اشاریہ؛ (۵) ابن عذاری: البیان المغرب، ج ۲ طبع Dozy و ترجمہ Fagnan اشاریہ، ج ۳، طبع Levi Provençal، اشاریہ؛ (۶) ابن ابی زرع: روض القرطاس، طبع Tornberg، ص ۱۳۷؛ (۷) ابن خلدون: العبر (*Histoire des Berbères*)، ۲: ۱۹۲؛ (۸) Dozy: *Histoire des Musulmans d'Espagne*، بار دوم، لائیڈن ۱۹۳۲ء، اشاریہ؛ (۹) E. Lévi Provençal: *Documents inédits d'histoire almohade*، پیرس ۱۹۲۸ء، ص ۲۱۳؛ (۱۰) Codera: *Decadenciay Desaparicion de los Almoravides en España*، سرقسطہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۴۱ و ۵۶؛ [(۱۱) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۲۷ء، ص ۳۲۳ تا ۳۲۴]۔

(E. Lévi Provençal)

* لُبْنان: Lebanon؛ ایک سامی لفظ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ''دودھ کی مانند سفید''۔ اس سے مراد وہ برف پوش چوٹیاں ہیں، جو سال بھر برف کی وجہ سے سفید نظر آتی ہیں۔ مغربی سلسلۂ کوہ اصل لبنان ہے جب کہ مشرقی سلسلۂ کوہ کو لبنان مقابل کہتے تھے۔ دونوں سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان جو وادی لبنان ہے وہ البقاع کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ کوہ ہرمن Herman حضرت حسّانؓ بن ثابت کے زمانے سے جبل الثلج کے نام سے مشہور ہے۔ زمانۂ حال کے مصنفین اسے جبل الشیخ لکھتے ہیں۔ عوام میں جبل کا اطلاق مبہم طور پر قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک اس سلسلۂ (کوہ) پر ہوتا رہا ہے جو بحیرۂ روم کے متوازی نہر العاصی (Orontes) کے دہانے سے لے کر الجلیل (Galilee) تک شام میں سے گزرتا ہوا چلا گیا ہے۔ اسی سے لفظ اہل الجَبَل یا جبلیون یعنی ''پہاڑی لوگ'' نکلا ہے جو مسلمان مؤرخین نصیریوں، متوالیوں اور دروز وغیرہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ کعبہ پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے تعمیر ہوا تھا۔ ان میں ایک کوہستان لبنان بھی تھا (ابن الفقیہ: کتاب البلدان، ص ۱۹، ۲۰، لائیڈن ۱۸۷۵ء)۔ اس روایت سے شاید اس کی توجیہ ہو سکے کہ عرب جغرافیہ دان لبنان کو اس طویل فاصلِ آب (ridge arête) کا تسلسل سمجھتے ہیں جو الحجاز کو نجد، شام اور آناطولی سے جدا کرتا ہے اور بحیرۂ اسود تک چلا گیا ہے۔ لبنان

کی جنوبی سرحد کو بالعموم لیطانی (موجودہ قاسمیہ) کی زیریں وادی سے منطبق کر دیا جاتا ہے ۔ موجودہ اصطلاح، جو مقامی روایت کے مطابق ہے، لبنان کی جائے وقوع اس دریا اور نہر الکبیر (قدیم Eleutherus) کے درمیان قرار دیتی ہے ۔ [موجودہ لبنان کے شمال اور مشرق میں شام، مغرب میں بحیرۂ روم اور جنوب میں اسرائیل ہے] ۔ یہی وہ خطّہ ہے جو ہمارے تاریخی جائزے کا موضوع ہوگا ۔ لبنان مقابل (Anti-Lebanon) کی پس ماندہ اور منتشر آبادی ہمیشہ مشرقی شام کے شہروں کے حلقے میں مرتکز رہی ہے، بحالیکہ لبنان، جس کے شہروں کا رخ سمندر کی جانب ہے اور جس کے دونوں پہلوؤں پر سمندر کے بخارات سے پیدا شدہ بھاری بارشیں ہوا کرتی ہیں اور انہیں کا پانی یہاں سے دریاؤں کی شکل میں نکل کر شام کے باقی حصے کو سیراب کرتا ہے، معاشی اور سیاسی طور پر قدیم علاقۂ فینیقیا (Phoenicia) کے وسطی حصوں کا دست نگر ہے ۔

لبنان کا ذکر زمانۂ قبل اسلام کے شعرا کے ہاں بہت کم ملتا ہے ۔ مثال کے طور پر نابغۃ الذبیانی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس کے سرپرست ملوک غسّان (والحیرہ) تھے، لیکن ان کے جانشین مسلمان شعرا لبنان کے نام سے زیادہ آشنا ہوتے چلے جاتے ہیں، مثلاً ابو دُہبل الجُمحی، نابغۃ الشّیبانی اور عبدالرحمن بن حسّان کیونکہ یہ شعرا اموی خلفا کے دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے ۔ لبنان کا ملک جنگلوں سے پٹا پڑا ہے، اور اس کی پیداوار اوسط درجے کی ہے ۔ اس کے اندر پہنچنا مشکل ہے کیونکہ بیچ بیچ میں گہری ندیاں اور تیز رفتار دریا واقع ہیں ۔ یہ عربوں کی فتوحات کے وقت سے چند چھوٹی چھوٹی قوموں کی جائے پناہ رہا ہے؛ [ماروني، دروزی، شیعہ اور مسیحی راہب لبنان کی خلوت گاہوں میں سکون کے جویاں بن کر آتے رہے ہیں] ۔

وہ نیم آزادی، جس سے یہ خطہ کبھی محروم نہیں رہا، ہمیشہ اس کے انفرادی خطوط پر ارتقا کے لیے سازگار رہی ہے اور اسلام سے منحرف فرقوں مثلاً متوالی، دروز اور نصیری [رک بآں] ، نیز عیسائی فرقوں، ملکی (Malkites)، یعقوبی (Jacobites) اور ماروني (Maronites) کے لیے پرورش گاہ بنی رہی ہے ۔ ان عیسائی فرقوں کا عرب مصنفین نے لبنان کے تذکرے میں نام لے کر کہیں ذکر نہیں کیا ۔ ذاتی استقلال کا جو درجہ ان گروہوں نے، جو ابتدا میں مذہبی تھے، لیکن انجام کار خالص قومی بن گئے، حاصل کیا، اسے سامنے رکھ کر شام کے اندر عربوں کے نفوذ اور مسلم اقتدار کے اتار چڑھاؤ کے اسباب کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔

ہر ایک گروہ اور اکثر اوقات ہر ایک ضلع اپنے اپنے مقامی حکمران خاندانوں کے زیر فرمان زندگی بسر کرتا جن کی بنیاد دمشق، بغداد یا قاہرہ کے بادشاہوں کے ہاتھوں رکھی ہوئی مانی جاتی تھی ۔ وہیں سے انہیں باقاعدہ پروانۂ فرمانروائی عطا کیا جاتا تھا اور اس کے عوض ان پر کچھ فرائض عائد ہوتے تھے اور کچھ فوجی خدمات انجام دینا پڑتی تھیں بشرطیکہ اقتدار بالا میں اتنی قوت ہو کہ انہیں اس پر مجبور کر سکے ۔ لبنان کے ان عملاً خود مختار جاگیرداروں نے ان تمام اضطراب خیز ہنگاموں کے دوران میں جو مشرق میں رونما ہوتے رہے اور جن میں یکے بعد دیگرے خلفا سلجوقی سلاطین، ایوبیوں، صلیبی جنگ جویوں، مملوکوں اور ترکی پاشاؤں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، بہت مستعدی اور کامیابی سے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی حکمت عملی اختیار کی ۔ بنو عباس لبنان کی جنگی اہمیت کا پورے طور پر اندازہ نہ کر سکے، اس لیے انھوں نے اس پر قبضہ کرنے کا کبھی خیال ہی

نہیں کیا، کیونکہ یہ ایک نسبۃً ویران سا علاقہ تھا اور اس وقت بھی چند ساحلی اضلاع کو چھوڑ کر کچھ یونہیں سا آباد تھا ۔ ان سے زیادہ دور اندیش اور پیش بین صلیبی محارب تھے جنھوں نے ''جبل'' کی سرحد پر بھاری بھاری سنگین قلعے بنا لیے جیسے حصن الاکراد [رک بآں] اور شقیف ارنون ۔ خلفا کی اس غفلت سے جراجمہ [رک بآں] کو لبنان میں داخل ہونے کی جرأت ہوئی ۔ شمالی لبنان کے بالائی علاقوں میں مارونیوں Maronites کا قدم جما لینا اور آناطولی حملہ آوروں کا حملہ لازماً ایک وقت ہوا ہوگا اور اس حملے نے اس مارونی عیسائی جماعت کی تنظیم میں ضرور مساعدت کی ہوگی جس کی قسمت میں ''جبل'' کے علاقے میں ایک زبردست کردار ادا کرنا لکھا تھا ۔ نویں صدی کے اواخر میں عرب کے قبیلۂ تنوخ نے حلب کے علاقے سے آ کر اپنے لیے جنوبی لبنان میں ان لوگوں کے درمیان جو شیعی تعلیم سے متأثر ہو چکے تھے اور ان پر کسی قدر عربی رنگ چڑھ چکا تھا اپنی ایک امارت قائم کر لی جو امارت ''امراءالغرب'' کہلائی ۔ اس امارت کے نشو و نما میں گیارھویں صدی کے دوران ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی اور وہ یہ تھی کہ صلیبی محاربوں کی صیدا اور بیروت میں ریاستیں قائم ہو گئیں ۔ جبیل (Giblet) اور بطرون (Batron) (بترون) کی جاگیریں اور طرابلس (Tripoli) کا ضلع یہ سب اپنی گزر اوقات کے لیے شمالی لبنان کے عیسائیوں کے دست نگر تھے۔

جب صلیبی محارب بیروت سے نکال دیے گئے تو ممالیک مصر نے بیروت کی حفاظت تنوخیوں کے سپرد کر دی ۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں ممالیک کے خلاف کچھ بغاوتیں ہوئیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسطی لبنان کے متولی اور دروز باغیوں کا پورا پورا استیصال ہو گیا ۔ ان کے استیصال سے مارونیوں کے لیے نہر ابراہیم (Adonis) کے جنوبی علاقوں پر قبضہ جما لینے کے لیے سہولتیں پیدا ہو گئیں ۔ سولھویں صدی کے شروع میں تنوخی عثمانلی ترکوں سے مل گئے جو شام کو فتح کرنے میں مصروف تھے ۔ اندرونی پھوٹ سے کمزور ہو جانے کے باعث تنوخیوں کو تھوڑے ہی دن میں بنو معن کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی جن کا سب سے زیادہ مشہور نمائندہ فخرالدین [رک بآں] تھا ۔ ۱۶۹۶ء میں جب بنو معن کا آخری سردار وفات پا گیا تو ان کے سیاسی وارث ان کے قرابت‌دار بنو شہاب قرار پائے جو ابتداءً وادی التیم سے جو ہرمن (Herman) کی مغربی ڈھلانوں پر واقع ہے، آئے تھے۔

فخرالدین کے زوال سے لبنان میں ترکی سازشوں کا دروازہ کھل گیا ۔ ترکوں کو بنو شہاب کے اقتدار کی بیخ کنی میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ وہ دروزی جاگیرداروں کی نافرمانی اور دست درازی ہی کے مقابلے میں ہمیشہ غلطاں پیچاں رہے ۔ زرعی مفاد کے پیش نظر بنو معن نے شمالی عیسائیوں کی جنوبی لبنان میں نقل مکانی کر کے آ بسنے میں ہمت افزائی کی تھی ۔ اس حکمت عملی پر بنو شہاب نے، جن کے روابط مارونیوں سے اچھے تھے، اور بھی زیادہ زور دیا ۔ مارونی امیروں میں سب سے زیادہ مشہور بشیر [رک بآں] تھا، جو پیدائش کے اعتبار سے عیسائی تھا (سال ولادت ۱۷۶۷ء) ۔ فخرالدین معنی کے طریق کار کو اختیار کر کے اس نے نصف صدی اس دھن میں صرف کر دی کہ لبنان کو ایک عظیم الشان ریاست بنائے ۔ ۱۸۴۰ء میں وہ معزول ہو گیا اور جلا وطنی کی حالت میں مر گیا ۔ لبنان میں بلا واسطہ ترکی حکومت (۱۸۴۰ تا ۱۸۶۰ء) کی سیادت کے بعد مارونیوں اور دروزیوں میں خونریز فسادات ہوے اور امن و امان

بحال کرنے کے لیے فرانسیسی فوجیں لبنان میں داخل ہو گئیں ۔ اس کے بعد دستوری ماہرین کی ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی گئی کہ لبنان کے لیے یورپ کے زیر نگرانی ایک خود مختار حکومت کا دستور بغور و فکر تیار کرے ۔ اس جماعت کا صدر رومن کیتھولک فرقے کا ایک عیسائی حاکم اعلیٰ تھا جسے یورپ کی ان دول نے پانچ سال کے لیے مقرر کیا تھا جن کے ہاتھ میں تمام انتظامی قوت مرتکز تھی ۔ اس اقتدار کے توازن کے طور پر ایک انتظامی مجلس مقرر کی گئی جس کا انتخاب اس طریقے سے کیا گیا کہ اس میں مختلف فرقوں کے نمائندے شامل ہو گئے ۔ اس ''دستور حکومت (Règlement-Organique) کے تحت موجودہ لبنان صورت پذیر ہوا اور اس کی پچاس سالہ خوش حالی اور امن و امان جو اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوے تھے، اسی دستور کے بدولت اسے ملے ۔

پہلی جنگ عظیم نے ہر چیز کو درہم برہم کر دیا ۔ ترکی فوجوں نے ''جبل'' پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک ترکی حاکم مقرر کر دیا گیا ۔ قحط اور بیماری نے آبادی کے بڑے حصے کو ختم کر دیا ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو سان ریمو San Remo کی کانفرنس میں فرانس کو شام اور لبنان پر حکومت کرنے کا حق (mandate) عطا کر دیا گیا ۔ اسی سال پہلی ستمبر کو بیروت میں فرانسیسی جمہوریہ کے ہائی کمشنر جنرل گورو Gouraud نے باضابطہ طور پر حکومت لبنان کلان (Etat du Grand Liban) کے قیام کا اعلان کیا اور بیروت اس کا دارالسلطنت قرار پایا ۔ اس ''خود مختار لبنان'' کے علاوہ اس نئی ریاست میں طرابلس، صیدا اور صور (Tyre) کے اضلاع بھی شامل کر دیے گئے ۔ یہ ریاست شمال میں نہر الکبیر سے شروع ہو کر فلسطین کی حدود تک پھیلی ہوئی ہے اور مشرق کی طرف لبنان مقابل Anti-Lebanon کے پہاڑی سلسلے سے گھری ہوئی ہے ۔ لبنان کلان (Grand Liban) کی حکومت شام کی مختلف ریاستوں (Confédération Syrienne) سے الگ ہے، اگرچہ اسے اس سے معاہدے کرنے کا حق حاصل ہے ۔ اس کا انتظام ایک فرانسیسی افسر کے سپرد ہے تاوقتیکہ کوئی ملکی حاکم اعلیٰ (گورنر) مقرر ہو ۔ تیس اعضا پر مشتمل ایک نمائندہ مجلس جو بذریعۂ رائے شماری منتخب ہوتی ہے، میزانیہ اور رفاہ عام کے معاملات کی جانچ پڑتال کرتی ہے ۔

گزشتہ مردم شماری (۱۹۲۱ تا ۱۹۲۲ء) کے مطابق لبنان کی آبادی ۶۲۹۰۰۰ تھی ۔ عیسائیوں کی تعداد ۳۳۰۰۰۰ تھی جس میں تمام مختلف فرقے شامل ہیں ۔ ان میں سے ۲۰۰۰۰۰ (دو لاکھ) ماروئی عیسائی تھے ۔ مسلمان ۲۷۵۰۰۰ ہیں (ان میں ۱۲۵۰۰۰ سنی تھے اور ۱۰۵۰۰۰ متولی یا شیعہ، ۴۳۰۰۰ دروز وغیرہ)، ۳۵۰۰ یہودی، ۲۰۰۰۰ غیر ملکی تھے ۔

[فرانس کی ۲۰ سالہ انتدابی حکومت کے خاتمے پر ۲۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو لبنان کی آزادی کا اعلان کیا گیا اور ۱۹۴۶ء میں غیر ملکی فوجیں ہٹا لی گئیں ۔ نئی آزاد ریاست، الجمہوریۃ اللبنانیہ کے نام سے موسوم ہوئی ۔ ۱۹۵۸ء میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی کو فرو کرنے کے لیے لبنان کے صدر شمعون نے امریکہ سے مدد مانگی، چنانچہ امریکہ نے اپنی بری اور بحری افواج بھیج کر ملک میں امن و امان قائم کیا ۔ ۱۹۶۹ء میں لبنانی فوجوں اور فلسطینی چھاپا ماروں میں چند جھڑپیں ہوئیں جن کا خاتمہ قاہرہ میں طے شدہ ایک معاہدے سے ہوا (نومبر ۱۹۶۹ء)، لیکن اب بھی کبھی کبھی فریقین میں اختلافات رونما ہوتے رہتے ہیں ۔ جمہوریۂ لبنانیہ کا رقبہ تقریباً ۴۰۰۰ مربع کیلومیٹر یا ۳۴۰۰ مربع میل ہے اور آبادی

۱۹۷۱ء میں ساڑھے اٹھائیس لاکھ تھی ۔ لبنان کے باشندے محنتی اور جفاکش ہیں۔ چونکہ سر زمین لبنان کوہستانی ہے، اس لیے بڑھتی ہوئی آبادی کی کفالت نہیں کر سکتی ۔ لاکھوں لبنانی نقلِ وطن کر کے مصر، ریاست متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور اپنے عزیزوں کے گزارے کے لیے رقمیں بھیجتے ہیں ۔ بڑے شہر اور ان کی آبادی حسب ذیل تھی: بیروت، سات لاکھ؛ طرابلس، پونے دو لاکھ؛ زھلہ چالیس ہزار؛ صیدا پچیس ہزار اور صور چودہ ہزار۔ سرکاری زبان عربی ہے، لیکن فرانسیسی اور انگریزی بھی عام طور پر رائج ہیں ۔ ایک طے شدہ اصول کے مطابق آبادی کی مخلوط نوعیت کے پیش نظر جمہوریۂ لبنان کا صدر کوئی مارونی عیسائی ہوتا ہے، وزیر اعظم سنی مسلمان اور ایوان نمائندگان (Chamber) کا اسپیکر شیعی مسلمان اور دیگر عہدیدار پانچ سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں .

ایک عرصے سے مسلمانوں کے مسلسل مطالبے کے باوجود آج تک نئی مردم شماری نہیں ہو سکی۔ مسلمانوں کا دعوٰی ہے کہ وہ اکثریت میں ہیں، اس لیے وہ اقتدار میں زیادہ شرکت کے متمنی ہیں ۔ مارونی عیسائی حکومت، تجارت، صنعت، تعلیم اور صحافت پر چھائے ہوے ہیں ۔ انہیں اہلِ یورپ کی تائید بھی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے ۔ ۱۹۷۵ - ۱۹۷۶ء کے خوفناک فسادات میں انہیں امریکہ اور یورپ سے ہر قسم کی امداد ملتی رہی ہے ۔ مزید برآں اسرائیل کی ہمدردی بھی ان کے شامل حال ہے اور وہ ہر ممکن طریقے سے جنوبی لبنان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ملک میں چار یونیورسٹیاں ہیں، جن میں امریکی یونیورسٹی اور سینٹ جوزف یونیورسٹی سب سے نمایاں ہیں ۔ متعدد ابتدائی اور ثانوی اور تعلیم نسواں کی درس گاہیں موجود ہیں ۔ لبنان کے مطابع دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ عربوں کو یورپ کے جدید علوم و فنون سے متعارف کرانے میں بیروت کے عیسائی فضلا کا بھی حصہ ہے ۔ عرب ممالک میں عرب قومیت کی تحریک بھی عیسائی دانشوروں کی ذہنی اپج کی پیداوار ہے ۔ لبنان ایک بہت خوبصورت ملک ہے ۔ نصف سے زیادہ علاقہ تین ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے، لہٰذا آب و ہوا بہت خوشگوار اور ایک حد تک معتدل ہے؛ پھل بہت عمدہ اور بکثرت ہوتے ہیں ۔ اس کی خاص چیزیں جبل لبنان اور غابۃ الأرز (دیار کا جنگل) ہیں جن کا ذکر یہاں کے مشہور مصنف جبران خلیل جبران [رک بآں] کی تحریروں میں اکثر آتا ہے ۔ اس جنگل کے بعض درخت سیکڑوں سال پرانے ہیں ۔ ملک میں تین ریلوے لائنیں ہیں اور سڑکیں بالعموم بہت اچھی حالت میں ہیں ۔ گزشتہ دس بارہ سال میں صنعت و حرفت میں خاصی ترقی ہوئی ہے اور تیل صاف کرنے کے ایک سے زیادہ کارخانے قائم ہو گئے ہیں .]

مآخذ: (۱) نہایت تفصیل کے ساتھ H. Lammens کی کتاب *La Syrie, précis historique*، بیروت ۱۹۲۱ء، ج ۲؛ (۲) صالح بن یحییٰ: تاریخ بیروت، طبع شیخو (امراء الغرب پر ایک اہم مقالہ)؛ (۳) یاقوت: معجم، ۱: ۳۷۱، ۵۱۶، ۶۷۵؛ ۲: ۱۱۰، ۱۵۵، ۲۷۶، ۳۷۳، ۵۴۰، ۵۸۸، ۸۲۹، ۸۸۵؛ ۳: ۱۷۰، ۳۵۳، ۳۹۹، ۶۳۷؛ ۴: ۳۱، ۲۶۱، ۳۳۷، ۳۶۴، ۵۴۰؛ (۴) الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع D.H. Muller، ص ۱۲۶؛ (۵) طنوس الشدیاق: کتاب اخبار الاعیان فی جبل لبنان؛ (۶) H. Lammens: *Frère Gryphon et le Liban au 15 emc siècle*, Revu *de l' Orient chrétien*، ۱۸۹۹ء؛ (۷) وہی مصنف: *Les Noisairis dans le Liban*، ۱۹۰۲ء؛ (۸) وہی مصنف: *La description du Liban, d' après Idrisi*، *MFBO*، ۱: ۲۳۲ تا ۲۵۰؛

(۹) وهی مصنف: *'Topographie franque du Liban; notes et essais d' identification* M.F.O.B. ۱: ۲۵۰ تا ۲۷۱؛ (۱۰) وهی مصنف: تشریح الابصار فی ما یحتوی لبنان من الآثار، ج ۲؛ (۱۱) Ristelhueber: *Les traditions françaises au Liban*؛ (۱۲) المحبی: خلاصة الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر، ج ۴؛ (۱۳) امیر حیدر شهاب: تاریخ؛ (۱۴) Wüstenfeld: *Fachreddin der Druzenfürst*؛ (۱۵) d'Arvieux: *Mémories*، ج ۲؛ (۱۶) Rabbath-Tournebize: *Documents inédits pour servir à' l' histoire du christianisme en Orient*؛ (۱۷) von Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf*، ۱: ۱۰۳ ببعد؛ (۱۸) Jouplain (تجسیم کا فرضی نام): *La question du Liban* - فہرست ماخذ، بیشتر سترھویں صدی سے؛ (۱۹) P. Masson: *Eléments d' une bibliographie du Congrès français de la Syrie*، ۱۹۱۹ء؛ (۲۰) V. Cuinet: *Syrie, Liban et Palestine*، خلاف واقعہ چیزوں یا غلطیوں سے پُر ہے؛ [(۲۱) P.K. Hitti: *Lebanon in History*، لنڈن ۱۹۰۷ء؛ (۲۲) Peter Mansfield: *The Arabs*، لنڈن ۱۹۷۶؛ (۲۳) *Statesman's Year-Book 1975-76*.]

(H. LAMMENS [و ادارہ])

لَبِید بن رَبِیعة: ابو عقیل؛ زمانۂ جاہلیت کا ایک عرب شاعر جو ظہور اسلام کے بعد تک زندہ تھا۔ وہ کِلاب کی شاخ، بنو جعفر سے تھا اور کلاب بنو عامر میں سے تھے؛ اس لیے وہ ہوازن کی شاخ تھے اور قیس عَیلان کے قبائلی گروہوں میں شامل تھے۔ ابن سعد (طبقات، ۶: ۲۱) کے بیان کے مطابق لبید کا انتقال ۴۰ھ/ ۶۶۰-۶۶۱ء میں ہوا۔ بعض دوسرے مصنف، مثلاً ابن حجر (۳: ۶۵۷) جن کا بیان Nöldeke کے خیال میں تسلیم کر لینا چاہیے، لبید کا انتقال ۴۱ھ بتاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جو ۴۲ ہجری کو اس کی تاریخ وفات ٹھیراتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت لمبی عمر پائی تھی (السجستانی: کتاب المعمرین، طبع گولڈ تسیہر Goldziher، باب ۶۱) - درحقیقت وہ اپنی عمر دراز کے متعلق اپنے قصیدوں میں کئی اشارے کرتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش محض تخمیناً متعین کی جا سکتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ۶۰۰ء سے قبل ہی وہ اپنی قادر الکلامی کے باعث اپنے قبیلے میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ عین جوانی ہی کے زمانے میں وہ غالباً اپنے قبیلے کے اس وفد میں شریک تھا جو الحیرہ کے بادشاہ ابو قابوس نعمان [بن المنذر] (حدود ۵۸۰ تا ۶۰۲ء) کے دربار میں حاضر ہوا تھا اور جب نعمان کے ندیم ابو ربیع بن زیاد العبسی نے اسے بنو عامر کے خلاف بھڑکایا، (لبید کی ماں قبیلۂ عبس سے تھی) تو لبید ایک ہجویہ رجز (دیوان، قصیدہ ۳۳) کے ذریعے بادشاہ کے سامنے اس کی ہنسی اڑانے میں اس قدر کامیاب ہوا کہ بادشاہ نے دوبارہ بنو عامر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ بادشاہ کے جواب میں سے ایک بیت جو اس نے اپنے درباری کے اس مراسلے کا لکھا تھا جس میں اس نے اپنے آپ کو لبید کی ہجو کے خلاف بچانے کی کوشش کی تھی مثل بن گیا ہے:

[قَدْ قِیلَ ذٰلِکَ اِنْ حَقًّا وَ اِنْ کَذِبًا
فَمَا اعْتِذَارُکَ مِنْ شَیْءٍ اِذَا قِیلَا]

(یعنی وہ بات تو کہی جا چکی ہے، سچ تھی یا جھوٹ۔ جو کچھ کہا جا چکا اس پر تمہارا اعتذار بے معنی ہے؛ المفضل: الفاخر، ۱: ۴۱ ببعد، العسکری: امثال، برهامش المیدانی، ۲: ۱۱۷ س ۷ تا ۱۸؛ المیدانی، ۲: ۳۳؛ کتاب الاغانی (بار اوّل)، ۱۵: ۹۴ ببعد، ۹۱ ببعد، (بار دوم) ۱۶: ۲۲ ببعد، ۲۱ ببعد)؛ [العمدة (القاهره ۱۹۰۷ء)، ۱: ۲۶،

بعد]، عبدالقادر: خزانة الادب، ۲: ۹۷ و ۴: ۱۷۱ بعد) ۔ اپنے بعد کے قصیدوں میں لبید اس بات پر بھی فخر کرتا ہے کہ اس نے اپنی فصیح بیانی سے اپنے قبیلے کی امداد کی ۔ نامور شاعر بن جانے کی حالت میں بھی وہ اپنے قبیلے کا وفادار رہا اور اس کے ہم عصر الاعشٰی نے آوارہ گرد مُغنّی کا جو پیشہ اختیار کر رکھا تھا اس سے اسے سخت نفرت تھی، لیکن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی بعثت نے اسے اس کے معمولی دائرۂ عمل سے باہر نکال لیا ۔ ہمیں اس کے حلقۂ اسلام میں شامل ہونے کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے ۔ [ایک عام روایت کے مطابق وہ قبولِ اسلام کے بعد ۶۰ سال تک زندہ رہا، لیکن اس نے اس عرصے میں سوا ایک بیت کے اور کوئی شعر نہیں کہا] ۔ سنہ ۸ ہجری کے جمادی الآخرہ جیسے ابتدائی زمانے میں قبیلۂ عامر بن صَعْصَعہ کے سرداروں عامر بن طفیل اور اَرْبَد بن قیس (لبید کے سوتیلے بھائی) نے نئے نظامِ حکومت سے اپنے قبیلے کی وابستگی کے سلسلے میں بغیر کسی نتیجے پر پہنچنے کے مدینۂ منوّرہ میں گفت و شنید کی (Caetani : *Annali*، ۲: ۹۰) ۔ ان دونوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے بہت جلد بعد وہ بے وقت ہلاک ہو گئے ۔ عامر طاعون سے مرا اور اَرْبَد بجلی گرنے سے ۔ اَرْبَد والے واقعے کی تصدیق بظاہر اس مرثیے سے ہوتی ہے جو لبید نے اَرْبَد کی موت پر لکھا (دیوان، قصیدہ ۵) ۔ اس کے برعکس یہ الزام کہ اَرْبَد نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو قتل کرنے کی کوشش کی، بالکل ناقابلِ تسلیم ہے؛ کیونکہ اس حالت میں لبید اربد کے لیے اتنے مرثیے نہ کہتا اور اگر کہتا بھی تو اس کے دیوان میں وہ ہرگز شامل نہ کیے جاتے ۔ ۹ ہجری میں اس قبیلے نے پھر ایک وفد مدینۂ منوّرہ بھیجا جس میں لبید بھی شریک تھا اور ایک معاہدہ سرانجام پایا ۔ کہتے ہیں کہ اسی موقع پر لبید نے اسلام قبول کیا ۔ بعد میں وہ کوفے چلا گیا اور وہیں وفات پائی ۔ اس کے اہل و عیال میں سے صرف ایک لڑکی کا ذکر ملتا ہے جس نے اس کی قابلیت ورثے میں پائی (الاغانی، ۱۴: ۹۸؛ المیدانی: ۲: ۳۹ س ۱۳، الغُزولی: مطالع البدور، ۱: ۵۲ سطر ۷ ببعد) ۔ [ایک قصیدے میں وہ اپنی دو بیٹیوں کا ذکر کرتا ہے (دیوان، طبع براکلمان، ص ۱ تا ۹؛ نیز دیکھیے ابن سعد ۵: ۲۱)] .

لَبید کے قصیدوں کی عربوں کے نزدیک بڑی قدر و منزلت تھی ۔ اس کے معلقہ کی بنا پر نابغہ اسے عربوں یا کم از کم اس کے قبیلے ہوازن کا سب سے بڑا شاعر بتاتا تھا [(اَشْعَرُالعرب، اَشْعَرُ ہوازن، دیکھیے الاغانی، ۱۴: ۱۰۱)] ۔ وہ امرؤ القیس اور طرفہ کے بعد اپنے آپ کو درجۂ سوم کا حق دار سمجھتا تھا ۔ الجُمَحی (طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۲۹ ببعد [الاغانی ۱۴: ۹۷]) اسے نابغۃ الجعدی ابو ذُؤیب اور الشَّمّاخ کے ساتھ جاہلی شعرا کے تیسرے طبقے میں جگہ دیتا ہے ۔ ہجا، مرثیہ اور قصیدہ تینوں اصناف میں لبید کو یکساں دسترس حاصل تھی ۔ اس کا ایک قصیدہ معلقات کے مجموعے میں شامل کر لیا گیا اور Nöldeke کے خیال میں یہ قصیدہ بدوی شاعری کے بہترین نمونوں میں سے ہے (*Fünf Mo'allaqāt* ۲: ۵۱)۔ لَبید جنگلی جانوروں کے روایتی مناظر، مثلاً گورخروں اور نیل گائے کا شکاری کے آگے آگے بھاگنے اور اس کے کتوں سے گتھم گتھا ہونے، کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے نسیب کی جانب محض اس لیے توجہ کی کہ وہ ایک روایتی چیز تھی ۔ وہ عورت کی محبت کے موضوع کی طرف اتنی توجہ مبذول نہیں کرتا جتنی کہ اَطْلال (شکستہ آثار) کے بیان کی طرف کرتا ہے، جنھیں وہ ہنرورانہ

خوشنویسی کے نمونوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اپنے علاقے کے مقامات کی یاد تازہ کرنے کا بھی بڑا شائق ہے جہاں کے نخلستان اور آب پاشی کے وسائل اسے دلکش منظر کشی پر برابر آمادہ کرتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے سلسلے میں وسط عرب سے لیکر خلیج فارس کے ساحل تک سفر کی پوری روداد بیان کرتا ہے (فان کریمر : مقالۂ مذکورہ، ص ۱۲)؛ تاہم ابو ذُؤَیب کی طرح جو تقریباً اس کا ہم عصر تھا اور محبوبہ کے ذکر کی طرف رجوع کرنے کا شائق تھا، لبید بھی اپنے معلقہ (بیت ۵۵) میں دوبارہ اپنی محبوبہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس طرح نسیب کو قصیدے کے بنیادی حصے سے ملا کر ایک جان کر دیتا ہے، لیکن اس کے لیے یہ عمل محض ایک نئے وصفی قطعے کی طرف گریز کا ایک طریقہ ہے ۔ البتہ جو بات اس کے کلام کو دیگر شعرائے جاہلیت کے کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ ایک طرح کا مذہبی تأثر ہے جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی بعثت سے پہلے بھی اس کے معاصرین کے ہاں بالکل عنقا نہ تھا، مثلاً جن مواقع پر زہیر اپنی طویل زندگی سے حاصل کردہ عملی حکمت کو سادہ مگر زوردار الفاظ میں پیش کرتا ہے، وہاں لبید ہمیشہ ایک مذہبی موضوع چھیڑ دیتا ہے ۔ اس نے یقیناً عیسائیت کا کبھی دعوٰی نہیں کیا اور نہ ہم اسے حُنَفاء کا نمائندہ ہی تسلیم کر سکتے ہیں جیسا کہ فان کریمر کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کے ہاں ہمیں اللہ کے پاسبان اخلاق ہونے کا عقیدہ بالخصوص ملتا ہے جو عرب میں عام طور پر مروج تھا ۔ اس کے دیوان کے بہت سے اشعار بظاہر قرآن مجید کے فیض کا نتیجہ ہیں ۔ یہ کہنا کہ اس نے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد شعر نہیں لکھے، درست معلوم نہیں ہوتا (ابن سعد، ۶ : ۲۱، س ۴، اس بیان کا بعد میں بھی اعادہ کیا گیا ہے؛ مثلاً الغَزَّولی : مطالع، ۱ : ۵۲ ببعد) ۔ اس کی تردید کے لیے محض یہ واقعہ کافی ہے کہ اس کے دیوان کے قصائد عدد ۲۱ و ۵۳ اس کی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے لکھے گئے تھے (کتاب الاغانی ۱۶ : ۱۰۱)۔ بہشت کا بیان (دیوان، قصیدہ ۳، بیت ۴) اور اسی طرح وہ تصور جو اس سے پہلے بیان ہوا ہے یعنی یہ کہ انسانی اعمال ایک دفتر میں درج ہوتے ہیں ، قرآن مجید سے مأخوذ ہیں ۔ اسلام کے زیر اثر قصیدہ شمارہ ۳۹ و ۴۱ میں جس کا گیارھواں شعر جیسا کہ ابن قُتَیبہ : (کتاب الشعر، ص ۱۵۳ س ۵) پہلے بیان کر چکا ہے، لبید کے قبول اسلام کے بعد لکھا گیا ہوگا، بشرطیکہ وہ الحاقی نہ ہو ۔ وہ نسیب کی جگہ پند و موعظت سے کام لیتا ہے ۔ اس طرح وہ انسانی زندگی کی ناپائداری پر شاعرانہ نصیحت گری کی ایک نئی فنی شکل تخلیق کرتا ہے ۔ ممکن ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ وہ عیسائی دعوت سے بھی متأثر ہوا ہو ۔ جب وہ پند و نصیحت کے ساتھ قصیدہ ۴۱ میں کسی عورت پر الزام کا رد کرتا ہے تو اس ضمن میں وہ محض قدیم تر مثالوں کی پیروی کرتا ہے، جیسے کہ طرفہ کے معلقہ میں بیت ۵۶ ببعد اور ۶۳ تا ۶۵ میں کیا گیا ہے (دیکھیے Caskel: *Das Schicksal*، ص ۹)، مگر طرفہ کے ہاں یہ چیز قصیدے میں محض ایک استطرادی قطعے کی حیثیت رکھتی ہے .

الفہرست (ص ۱۵۸) کے بیان کے مطابق کئی بڑے بڑے عرب ماہرین لغت مثلاً السُّکّری، ابو عامر الشَّیبانی، الاَصْمعی، الطُّوسی اور ابن السِّکّیت نے لبید کا دیوان مرتّب کیا تھا ۔ ان میں سے صرف الطُّوسی کے مرتّب کردہ دیوان کا نصف حصہ مع شرح ۵۸۹ھ کے اس مخطوطے میں محفوظ ہے جسے الخالدی نے طبع کیا ہے (دیکھیے نیچے)۔ باقی تمام مخطوطے، مثلاً لائیڈن اور سٹرس برگ کے مخطوطے،

بہت بعد کے ہیں اور اسی طرح قاہرہ کا وہ مخطوطہ جس میں دیوان ابو ذُؤَیب طبع J. Hell بھی شامل ہے ابھی تک طبع نہیں ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن سعد: کتاب الطبقات ۶: ۲۰ تا ۲۱؛ (۲) ابن قُتَیبہ: کتاب الشّعر و الشّعراء، ۱۳۸ تا ۱۵۶؛ (۳) ابوالفرج الاصفہانی: کتاب الاغانی، بار دوم، ۱۴: ۹۰ تا ۹۸؛ (۴) دیوان لبید العامری، روایة الطوسی، الطبعة الاولٰی، بحسب النسخ الموجودة عند طابعه الشیخ یوسف ضیاء الدّین الخالدی المقدسی (ویانا)، الجوائب ۱۲۹۷ھ؛ (۵) اے فان کریمر: *Über die Gedichte des Labyd*، در *SB.Ak Wien*، جلد ۹۸، عدد ۲، ص ۵۵۵ تا ۶۰۳؛ (۶) دیوان لبید مع ترجمہ و تعلیقات از *Dr. A. Huber*، طبع C. Brockelmann، لائیڈن ۱۸۹۱ء؛ (۷) اشعار لبید مع ترجمہ و تعلیقات از *Dr. A. Huber* طبع کارل براکلمان، لائیڈن ۱۸۹۱ء؛ (۸) *Die Mo'allaqa Labids übersetzt und erklärt* از Th. Noldeke در *SB.Ak Wien*، [خمس معلقات] *Fünf-Mo'allaqat*، *Ph. Hist.*، جلد ۱۴۲، عدد ۵، ۱۹۰۰ء؛ [(۹) براکلمان تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۱: ۱۴۵ تا ۱۴۷، قاہرہ ۱۹۰۹ء؛ (۱۰) R. A. Nicholson: *A Literary history of the Arabs*، ص ۱۱۹ تا ۱۲۱].

(C. BROCKELMANN)

* لپانٹو: یونانی شہر ناپکٹاس Naupactos کے نام کی اطالوی صورت ۔ ترک اسے Ine Bakhtî کہتے ہیں۔ اس لفظ کے ترکی تلفظ کی نقل اس طرح کی گئی ہے ۔ مثلاً Leunclavius: *Annales Turcici*، ص ۳۵) لیکن von Hammer: *G.O.R.*، ۳: ۳۱۸) اس کا تلفظ Aina Bakhtî نقل کرتا ہے اور اس کا ترجمہ "Spiegelglück" کرتا ہے ۔ یونانی صورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ترک اس کا تلفظ ابتداءً Ine Bakhtî کرتے تھے ۔ یہ شہر قدیم Locris میں واقع ہے اور اس آبنائے کے شمال میں ہے جو بحیرۂ Ionia سے خلیج کارنتھ کو جو قرون وسطٰی سے خلیج لپانٹو کے نام سے مشہور ہے جاتی ہے۔

[. . . تفصیل کے لیے دیکھیے ووؔ لائیڈن، بار اول، بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) Von Hammer: *G.O.R.* ۲: ۱۰۰، ۳۱۸ ببعد، ۳: ۵۹۲ ببعد ۔ لپانٹو کی جنگ کا حال سولھویں صدی کے مؤرخوں نے بیان کیا ہے؛ (۲) پچوی: تاریخ، قسطنطینیہ ۱۲۸۳ھ، ص ۴۹۵ ببعد؛ (۳) سِلاہکی: تاریخ، قسطنطینیہ ۱۲۸۱ھ، ص ۱۰۱ ببعد؛ (۴) حاجی خلیفہ: تحفة الکبار، قسطنطینیہ ۱۰۴۱ھ، ورق ۴۲ ببعد ۔ بعد کے تذکروں میں جودت پاشا: تاریخ، ۱: ۱۱۹ قسطنطینیہ ۱۳۰۲ھ اور صفوت بے کے شائع کردہ مسودات در *T.O.E.M.*، عدد ۹ (اگست ۱۹۱۱ء) نہایت وسیع یورپی مآخذ کی فہرست کا جائزہ جو *G.O.R.* ۳: ۷۸۷، میں دی گئی ہے، دیکھیے نیز Awram Galanti کا مقالہ در *T.O.E.M.*، عدد، ۷۸، جنوری ۱۹۲۴ء۔

(J. H. KRAMERS و [تلخیص از ادارہ])

* لِثام: (ع)؛ (اس کا تلفّظ بعض اوقات لِفام بھی کیا جاتا ہے) بمعنی نقاب؛ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس سے بدو اپنے چہرے کا زیرین حصہ، منہ اور بعض اوقات ناک بھی ڈھانپ لیا کرتے تھے (دیکھیے شرح مقامات الحریری، طبع de Sacy، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۳۷۴، س ۲) ۔ [لثام منہ ڈھانکنے اور لفام ناک ڈھانکنے کے معنوں میں مستعمل ہے (لسان، بذیل مادّہ] ۔ اس سے چہرے کے اعضائے تنفس گرمی، سردی اور گرد و غبار سے محفوظ رہتے تھے (دیکھیے دیوان ذوالرّمہ، قصیدہ، ۵، ۴۳، ۳۹، ۲۴ اور ۴۷، ۱۶؛ شرح دیوان المتنبّی، ص ۳۶۴، س ۲۷ و شرح مقامات الحریری، ص ۳۷۴، س ۲) ۔ لثام سے چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا، اس لیے یہ قتل کا بدلہ لینے والے کے خلاف ایک قسم کے بچاؤ کا کام

دیتا تھا (Goldziher در Z.D.M.G.، ۴۱ : ۱۰۱) - بعض اوقات وہ اشخاص بھی بھیس بدلنے کے لیے لثام پہن لیا کرتے تھے، جو اس کے استعمال کے عادی نہ ہوتے تھے - الف لیلہ (طبع Macnaghten، ۱ : ۸۷۸) میں ایک شہزادی کا ذکر ملتا ہے جو مردوں کا بھیس بدل لیتی تھی اور دوسرے مقام پر ایک شہزادے کا تذکرہ ہے جو عورتوں کا لباس پہن لیتا تھا - باب تفعّل میں التثام سے تلثّم آتا ہے، جس کے معنی لثام پہننا ہیں (دیکھیے الاغانی، ۸ : ۱۰۲، س ۲۰؛ ۲۱ : ۵۵، س ۱۹؛ الاغانی، طبع Kosegarten، ص ۱۲۱، س ۱۳؛ Wright : *Opuscula arabica*، ص ۱۱۱، س ۲، الحریری : مقامات، بار دوم، ۲ : ۳۳۳، س ۲)، جبکہ باب افتعال میں التثام کے معنی لثام کے طور پر کسی چیز کے پہننے کے ہیں اور یہ عام طور پر مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے - تلثیمہ عام طور پر عورت کے نقاب کو کہتے ہیں (Cherbonneau، در J.A. ۱۸۵۹ء، ۱ : ۶۳)، لیکن فاطمیین کے عہد میں تلثیمۃ البیاض ایک خاص قسم کے سرکاری عہدے داروں کا لباس ہوتا تھا جسے ان کا قاضی القضاۃ عمامے اور طیلسان کے ساتھ پہنا کرتا تھا (de Sacy : *Chrest*، ۲ : ۹۲) - شہروں کے رہنے والے عام طور پر لثام نہیں پہنا کرتے تھے .

دینی اعتبار سے لثام کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے - دوسرے کپڑوں کے ساتھ محرم کے لیے اس کا استعمال بھی ممنوع ہے (البخاری، ۱ : ۳۹۰).

شمالی افریقہ میں لثام پہننے کا رواج زیادہ تر صنہاجہ قبائل [رک بآں] میں تھا جو مُلَثَّمُون یا اولاد المُتَلَثِّمہ کہلاتے ہیں - مرابطون کا قبیلہ لمتونہ لثام پہننے کا عادی تھا، اس لیے لثام کو کچھ سیاسی اہمیت بھی حاصل ہو گئی - لثام پہننے کی رسم (زیر نقاب، دیکھیے البکری، ص ۱۷۰) افریقہ کے دوسرے مقامات، مثلاً کانم میں پائی جاتی تھی (المقریزی، ۱ : ۱۹۳، س ۳۳ ببعد) اور ابھی تک طوارق کے ہاں موجود ہے - المغرب کے یہ باشندے لثام سمیت دنیائے اسلام کے مشرقی ممالک میں جہاں اس کا رواج نہ تھا، جاتے تھے، جبکہ ان کی عورتیں کھلے منہ سفر کیا کرتی تھیں - متاخّر زمانے کی ایک خود ساختہ حکایت سے اس عجیب و غریب رسم کی اس طرح توجیہ کی جاتی ہے کہ ایک گاؤں پر حملے کے وقت عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور مرد کم تھے - مردوں نے نقاب پہن لیے اور عورتوں نے ہتھیار باندھ لیے تاکہ دشمن کو ان کی صحیح تعداد کا پتا نہ چل سکے (Goldziher، در Z. D. M. G.، ۴۱ : ۱۰۱) - ایک دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ اموی سلطنت کے انقراض کے بعد دو سو اموی (جان بچانے کے لیے) عورتوں کا بھیس بدل کر افریقہ چلے گئے، اور لثام پہننے والے ان کے اخلاف ہیں (Wüstenfeld : *Der Tod des Husejn*، ص ۸) - البکری کے بیان کے مطابق (متن، ص ۱۷۰، ترجمہ، ص ۳۲۱) وہ کبھی لثام نہیں اتارتے تھے - اگر کوئی میدان جنگ میں ڈھیر ہو جاتا اور اس کا لثام ضائع ہو جاتا تو جب تک اسے لثام دوبارہ نہ پہنایا جاتا اس کے دوست بھی اسے پہچان نہیں سکتے تھے - لثام نہ پہننے والے "مگس منہ" کہلاتے تھے - موحدین، بالخصوص ابن تومرت، مرابطون کے لثام پہننے کی مخالفت کرتے تھے - وہ بتکرار اصرار کیا کرتے تھے کہ مردوں کو عورتوں کا لباس پہننے کی ممانعت آئی ہے، لیکن وہ اس رسم کو نابود کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے (Goldziher، در Z.D.M.، ۴۱ : ۱۰۲) - مُلَثَّم کی اصطلاح والی دوسری عبارتوں کے ساتھ عبداللطیف (طبع de Sacy، ۴۱۳،

حاشیه مع دیگر حواله جات) کی عبارت میں بھی ملتی ہے - Fleischer (*Kleine Schriften*، ۲ : ۲۴۳) نے اس طرح کی بہت سی عبارتوں پر بحث کی ہے، نیز دیکھیے Marquart : *Die Beninsammlung*، اشاریہ، بذیل مادۂ *Litāmträger* .

لثام اور اس کے دوسرے اشتقاقات کا مجازی معنوں میں استعمال شعرا کے ہاں کثرت سے ہوا ہے - ''محبوبہ کے زیر لثام ہونٹوں کے چومنے'' (Dozy : *Vetements*، ص ۴۰۰، دیکھیے ماتحت لِثَامَیْن = چہرہ، در المتنبی : دیوان، ص ۴۶۴، س ۲۷) سے لثم = چومنا (دیکھیے عمر بن ربیعہ : دیوان، طبع Schwarz، ص ۶، شعر ۲۰۷)؛ ابن الفارض : دیوان، مارسیلز ۱۸۵۳ء، ص ۱۲۵، س ۵ نیچے سے) اور تلاثم = ''ایک دوسرے کو چومنا'' کے الفاظ نکلے ہیں : مَلْثَم، چومنے کی جگہ کہلاتی ہے (فرزدق، در Dozy : *Supplément*) - لڑکی کو اس کے بالوں سے بنا ہوا لثام دیا جاتا تھا (الف لیلہ، طبع Breslau، ۲ : ۵۲، س ۲) - اونٹ کے منہ پر جھاگ کا ڈھیر لثام کہلاتا تھا (ذوالرمہ : دیوان، ص ۱۷۶، س ۱۷) - بھیڑیے کو اَحَمُّ اللثام = سیاہ رنگ کا چھینکا کہتے تھے (اَلطِّرِمَّاح : دیوان، ص ۴، س ۳۵) - اس کے لیے لَمْ یَتَلَثَّم (الحماسۃ، ۱ : ۷۶۲، س ۱۷) کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے - شراب کی صراحی کے منہ پر پڑا ہوا کپڑا (صافی) لثام کہلاتا ہے (مَلْثُوم، در المفضلیات، طبع Lyall، قصیدہ ۱۲۵، شعر ۷)؛ نیز شراب کی صراحیوں کے بارے میں دیکھیے دیوان الاخطل، طبع صَلْحانی، ص ۸۵، س ۲؛ و دیوان علقمہ، طبع Socin، ۲ : ۴۳) - سورج گرد و غبار کے بادلوں سے ڈھک جاتا ہے تو کہا جاتا ہے اس نے لثام پہن لیا ہے (اَلْتَثَمَ، در دیوان المتنبی، ص ۶۰۱، س ۱۵) - طلوع صبح کے لیے کَشَفَ الصبحُ اللثام (صبح نے اپنا نقاب اتار لیا) کا محاورہ مستعمل ہے (ابن عربشاہ، طبع Golius، ص ۶۴، س ۳ نیچے سے؛ نیز دیکھیے شرح مقامات الحریری، ص ۲۴۰، س ۱۰) - بہت سی کتابوں کے نام کشف اللثام سے شروع ہوتے ہیں (دیکھیے براکلمان، *G.A.L.*، ۲ : ۶۵۹) - دیواروں سے لثام ہٹانے کا مطلب ان کو ننگا کرنا ہے (عماد الدین، طبع Landberg، ص ۶۵، س ۱۲) - اپنی اصلیت سے لثام اتارنے کے معنی، حقیقت کے اقرار کے ہیں (الحریری : مقامات، بار دوم، ۲ : ۴۲۶، س ۳) - کہا جاتا ہے کہ حضرت اسرافیل[۴] کے چار پروں میں سے ایک پر نقاب پڑا ہوا ہے (اَلْتَثَمَ) جس کی پہنائی آسمان سے لے کر زمین کے ساتویں طبقے تک ہے (قزوینی، طبع *Wüstenfeld*، ۱ : ۵۶ نیچے؛ پوشیدہ اواز کو مَلْثَم کہتے ہیں دیوان طرفہ، طبع Ahlwardt، قصیدہ عدد ۵، ۲۶، طبع بیروت ص ۱۰، ۱۸۸۶) - اس کا ایک اور مجازی استعمال دیوان ابن الفارض (در de Sacy : *Chrest.*، ۳ : ۵۵، بیت عدد ۵۵) میں ملتا ہے .

مآخذ : مندرجۂ بالا اقتباسات کے لیے مقالہ نگار پروفیسر A. Fisher اور F. Krenkow کا ممنونِ احسان ہے - ان کے علاوہ ملاحظہ ہو : (۱) Dozy : *Vêtements*، ۳۹۹ ببعد؛ (۲) وہی مصنف : *Supplément*، ۲ : ۵۱۶؛ مسلمان عورتوں کے نقابوں اور برقعوں کے لیے دیکھیے (۳) Snouck Hurgnornge : *Twee populaire dwalingen verbetered*, *Verspr. Geschr.*، ۱ : ۲۹۵ ببعد؛ لسان العرب، بذیل مادّہ) .

(W. Björkman)

لَحِج : جنوبی عرب کی ایک سلطنت جس کا صدر مقام بھی اسی نام کا ہے، عدن کے شمال مغرب میں واقع ہے - اس کے شمال میں حوشبی، مشرق میں فَضْلی، جنوب میں عَقْربی اور مغرب میں صُبیحی علاقے واقع ہیں - صدر مقام جو لَحِج یا اَلْحَوْطَہ کے نام سے مشہور ہے، سمندر کی سطح سے

۳۵۰۰ فٹ کی بلندی پر وادی تُبن کی دو شاخوں یعنی وادی صغیر اور وادی کبیر کے درمیان ایک زرخیز نخلستان میں واقع ہے جس کا وجود ان نہروں پر منحصر ہے جو آب پاشی کے لیے پہاڑی ندی نالوں اور بہت اچھے پانی کے کنووں سے پانی حاصل کرتی ہیں۔

[.... تفصیل کے لیے دیکھیے EI² لائیڈن، بار اول، بذیل مادّہ].

مآخذ: المقدسی در *B. G. A*، ۳ : ۷۰ و ۸۵؛ (۲) یاقوت : معجم، طبع Wustenfeld، ۱ : ۵۴۸؛ ۳ : ۲۴۴ و ۶۳۸؛ ۴ : ۳۵۲، ۳۴۳ و ۷۵۱؛ (۳) مراصد الاطلاع، طبع T. G. J. Juynboll، ۳ : ۹؛ (۴) البکری : معجم، طبع Wüstenfeld، ۱ : ۲۰۲؛ ۲ : ۳۳۹؛ (۵) الهمدانی : صفة جزیرة العرب، طبع D. H. Müller، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء، ص ۵۲ ببعد؛ (۶) امین الریحانی : ملوک العرب؛ (۷) عظیم الدین احمد : *Die auf südarabien bezüglichen Angaben Našwāns im Šamsal-uhum*، سلسلۂ یادگارگب، ۲۴ : ۹۴؛ (۸) A. Sprenger : *Die Post und Reiserouten des Orients*، در *Abh. f. d. Kunde. d. Morgenlandes*، ۳ / ۳ : ص ۱۰۹ و ۱۴۱ و ۱۴۵ و ۱۵۲؛ (۹) بدر الاسلام محمد بن اسمٰعیل بن محمد الکبسی : اللطائف السنیّة فی اخبار الممالک الیمنیه، Cod. Glasser، ص ۴، ۶ تا ۸، ۱۲، ۱۴، ۱۹؛ (۱۰) S.W. Redhouse : *The Pearl-strings, a history of the Rasuly Dynasty of Yamen*، لائیڈن ۱۹۰۶ء، سلسلۂ یادگارگب، ۳ / ۱ : ۲، ترجمہ، ۱ : ۱۳۰ و ۱۳۷ ببعد، ۲۳۸، ۲۷۰، ۲۸۳ و لائیڈن ۱۹۰۷ء، ۲ : ۱۲ و ۱۹ ببعد، ۲۹، ۳۰، ۷۷، ۲۴۲؛ (۱۱) C. Niebuhr : *Beschreibung von Arbien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۵۵؛ (۱۲) J. R. Wellsted : *Travels in Arabia*، لنڈن ۱۸۳۸ء، ص ۳۰۵ تا ۳۱۱؛ (۱۳) H. F. Jacob : *Kings of Arabia*، لنڈن ۱۹۲۳ء، مواضع کثیرہ؛ (۱۴) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۸ / ۱ : ۷۰۳ و ۷۰۵ تا ۷۰۷؛ (۱۵) Noel Desvergers : *Arabie, l'Univers, histoire et description de tous les peuples Asie*، پیرس ۱۸۴۷ء، ۵ : ۲۱ (سلطانِ عدن کے محل کی تصویر بھی دی گئی ہے)؛ (۱۶) R. L. Playfair : *History of Arabia Felix or Yemen*، بمبئی ۱۸۵۹ء، ص ۱۷۸؛ (۱۷) G. Weil : *Geschichte der Cholifen*، Stuttgart، ۱۸۶۲ء، ۵ : ۳۹۸؛ (۱۸) H. v. Maltzen : *Reise nach Südar bien*، Brunswick، ۱۸۷۳ء، ص ۳۲۴ تا ۳۴۹؛ (۱۹) R. Manzoni : *El Yemen, tfc anni nell' Arabia felice. Escursioni fatte dal settembre 1877 al Marzo 1880*، روم ۱۸۸۴ء، ص ۱۴ تا ۱۶، ۲۲، ۲۷۰ ببعد، (مع تصویر قلعۂ لَحج بالمقابل ص ۲۲)؛ (۲۰) E. Glaser : *Tagebuch*، ۱۸۸۷ء، جلد ۲، ورق ۳ و ۴ و ۵؛ (۲۱) O. Baumann : *Besuch Von Lahadj in Südarabien Globus*، ۱۸۹۵ء، ۶۷ : ۱ تا ۶ (تین تصاویر سمیت)؛ (۲۲) M. Hartmann : *Die Mekkabahn*، برلن ۱۹۰۸ء، ص ۲۳ ببعد؛ (۲۳) F. Stulhmann : *Der Kampf um Arabien zwischen der Türkei und England*، Brunswiek، *Hamburgische Forschungen* ۱۹۱۶ء، ۱ : ۶۴، ۷۲، ۱۱۱ ببعد، ۱۲۲، ۱۳۲ تا ۱۳۰، ۱۷ تا ۱۹؛ (۲۴) *Handbooks Prepared under the Direction of the Historical section of the Foreign Office No. 61 Arabia*، (وہ کتابچے جو وزارت امور خارجہ کے شعبۂ تاریخ کی زیر ہدایت طبع ہوئے، شمارہ ۶۱، موسومہ بہ عرب) لنڈن ۱۹۲۰ء، ص ۷۱، ۷۵، ۸۸ ببعد؛ (۲۵) *The Statesman's Yearbook*، ۱۹۲۱ء مکمل، لنڈن ۱۹۲۱ء، ص ۹۶ و ۱۹۲۷ء مکمل، لنڈن ۱۹۲۷ء،

ص ۹۰؛ (۲۶) D. G. Hogarth : *Arabia*، آکسفرڈ ۱۹۲۲ء، ص ۱۲۷؛ (۲۷) علاقۂ لحج کے نقشے، در G.S. Stevens : *Report on the country around Aden*، در *J.R.G.S.*، ۱۸۷۳ء، عدد ۴۳، مقابل ص ۲۹۰؛ (۲۸) G.U. Yule : *A Rock-cut Himyaritic Inscription on Jabal Jehaf, in the Aden Hinterland*، در *Proc. Soc. of Biblical Archaeology*، ۱۹۰۵ء، ۲۷: ۱۵۳ تا ۱۵۵؛ (۲۹) نقشہ جس سے عدن کے محروسہ کی نئی حد ظاہر ہوتی ہے، در *Geogr. Journal*، ۱۹۰۶ء، ۲۸: ۶۳۲.

(ADOLF GROHMANN [و تلخیص از ادارہ])

لِحْیان: ایک عرب قبیلہ جو بنو هُذَیل کی شاخ ہے ۔ اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے : لحیان بن هذیل بن مُدْرِکہ بن الیاس [بن مُضَر بن نزار بن مَعَد]؛ چونکہ وہ بنو هذیل کے دوسرے قبائل کی طرح ایسے علاقے میں آباد تھے جو مکے کے شمال مشرق میں واقع ہے، لہٰذا ان کی تاریخ اسلام سے قبل یا ما بعد دوسرے هُذَلی قبائل سے الگ نہیں ہے ۔ ان سے علٰحدہ ان کا ذکر شاذ و نادر ہی آتا ہے ۔ مثال کے طور پر تَأَبَّطَ شَرًّا کے ساتھ ان کی جھڑپوں کا ذکر دیوان الحماسة (ص ۳۰) میں آیا ہے ۔ یہ لڑائیاں یاقوت کی معجم البلدان (۲: ۲۷۲؛ ۴: ۱۰۴، طبع وسٹنفلڈ) میں مذکور ہیں، (نیز دیکھیے حماسة البحتری، ص ۸۰ تا ۸۱؛ ابن الجرّاح، طبع H.H. Bräu، عدد ۸۶ ۔ S.B. Ak. Wien ۱۹۲۷ء، ص ۳۱) ۔ یاقوت نے خُزاعہ کے ساتھ ان کے ایک معرکے کا بھی حال لکھا ہے (معجم البلدان، ۲: ۶۱۴) ۔ بنو هذیل کے مشہور شعرا میں مالک بن خالد الخُناعی، المُتَنَخِّل الخناعی وغیرہ شامل ہیں ۔ اشاعت اسلام کے زمانے میں وہ بنو هذیل کے دیگر قبائل کی طرح سیاسی طور پر قریش کے زیر اثر تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے مخالف تھے ۔ اس مخالفت سے بر افروختہ ہو کر حضرت عبداللہ بن اُنَیس رضؓ نے ان کے سردار خالد بن سفیان بن نُبَیح الهذلی کو قتل کر دیا ۔ [ماہ صفر ۴ھ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے چند صحابہ کرام رضؓ کو الرجیع کے لوگوں سے (جو لحیانی تھے) صدقات وصول کرنے اور ان کو دین سکھانے کی غرض سے بھیجا، مگر انھوں نے غداری اور بدعہدی کرکے مسلمان محصّلوں اور مبلّغوں کو شہید کر دیا جن میں حضرت مَرْثَد، حضرت عاصم بن ثابت اور خُبَیب بن عَدِی بھی شامل تھے ۔ ان شہدا کا بدلہ لینے کے لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے ۵ھ اور بقول دیگراں ۶ھ میں بنو لحیان پر چڑھائی کر دی ۔ بنو لحیان نے آپ صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی آمد کا سنا تو ڈر کر بھاگے اور پہاڑوں میں جا پناہ لی (البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۳۴۸، ۳۷۵؛ ابن حزم : جوامع السیرة، ص ۲۰۰)].

ابن الکلبی (کتاب الاصنام، ص ۵۷؛ نیز دیکھیے یاقوت : معجم، ۳ : ۱۸۱ س ۱۱۶) نے لکھا ہے کہ وہ بنو هذیل کے بت سُواع کی خدمت (سدانة) کیا کرتے تھے (دیکھیے Wellhausen : *Reste Arab. Heidentums*، بار دوم، ص ۱۸ تا ۱۹) ۔ شمالی حجاز میں بعض کھنڈروں کے جو دیواری نقوش اور کتبات برآمد ہوے ہیں، ان سے نہ صرف ان قرائن کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی آمد سے صدیوں پیشتر وہاں ایک لحیانی ریاست بھی قائم تھی ۔ ان کتبات اور نقوش کا اس وقت پتا چلا جب ان کی غیر مکمل نقلیں Doughty و Huber نے شائع کیں اور بعد ازاں ان کی کثیر تعداد (۹۰۰) کو Euting نے جمع کر لیا اور J. Halevy کی ابتدائی تحقیقات کے بعد D.H. Müller نے ان کو حل کیا ۔ یہ کتبات اب کثیر تعداد میں دستیاب ہیں اور Jaussen و

Savignac جیسے ذی علم پادریوں کی تصانیف اور انکشافات کی بدولت اچھی طرح روشناس ہونے لگے ہیں ۔ ان کا محل وقوع العُلاء نامی ایک گاؤں کا نواح ہے، (یہ ان کھنڈروں میں پائے جاتے ہیں جو الخَرِیبہ کہلاتے ہیں اور العلاء کے مشرق میں پہاڑوں پر بھی بڑی تعداد میں کتبات پائے جاتے ہیں)، جو الحِجر [رک بآں] کے نبطی مرکز مدائن صالح [رک بآں] سے زیادہ دور نہیں ہے ۔ یہاں بھی تھوڑے سے نقوش دستیاب ہیں ۔ ان میں اور معینی نقوش میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے (جو العلاء کے مشرق میں بکثرت ملتے ہیں ۔ مابعد کے دور کے لحیانی نقوش اور معینی نقوش میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے، D. H. Müller نے غلطی سے ان کا زمانہ اور بھی متأخر قرار دیا ہے) ۔ ان کی زبان شمالی حجاز کے ثمودی اور الصّفائی [نسبت بہ الصفا] نقوش سے ملتی جلتی ہے ۔ بعض خصوصیات کے اعتبار سے یہ قدیم عربی سے مختلف بھی ہے (بالخصوص اسم میں ال کے بجائے ھا اور مَنْفعِل وزن کے بدلے نَفْعَل کا استعمال) ۔

ان نقوش سے پتا چلتا ہے کہ العلاء (جس کا قدیم نام ددن (DDN) کی صورت میں لکھا جاتا ہے، بائبل کا دیدان ہے) لحیانی سلطنت کا دارالحکومت تھا ۔ اس سلطنت کو ایک عرصے تک بڑی اہمیت حاصل رہی ۔ العلاء دیدان آزادی سے پہلے معینیوں کی نو آبادی تھا اور اس شاہراہ کی ایک منزل تھی، جہاں سے یمن اور ہندوستان کا مال تجارت بحیرۂ روم کی بندرگاہوں تک پہنچتا تھا ۔ معینی سلطنت کے زوال کے بعد (بقول ہارٹمن ۲۳۰ اور ۲۰۰ قبل از مسیح) نبطیوں نے تجارتی کاروبار میں معینیوں کی جگہ لے لی اور الحِجر میں آباد ہو گئے، لیکن لحیانیوں نے جو معینی تہذیب و ثقافت اختیار کر چکے تھے اور خود مختار سلطنت کے مالک تھے، نبطیوں کی یلغار میں حائل ہو گئے ۔ دونوں سلطنتوں کی سرحدیں غالباً الحجر اور العُلاء کے درمیان تھیں ۔ گمان غالب یہ ہے کہ لحیانی ثمود [رک بآں] کے ذیلی قبائل تھے جن کا ذکر سرگون آشوری کی داستان تاریخ میں آتا ہے ۔ پلینی سے پہلے ان کا کہیں بھی تذکرہ نہیں ملتا ۔ وہ انھیں Lechieni کے نام سے یاد کرتا ہے (*Hist. Nat.*، ۶ : ۳۳، س ۳) ۔ بطرا کی سلطنت کے زوال (۱۰۶ء) کے بعد ان کی طاقت میں یقیناً اضافہ ہو گیا ہو گا ۔ الحجر بھی ان کے مقبوضات میں شامل تھا جسے نبطی خالی کر چکے تھے ۔

بنو لحیان کب اور کس طرح چھٹی صدی عیسوی میں بنو ھذیل کی شاخ بن گئے اور اپنے اصلی مقام کو چھوڑ کر جنوب کی طرف جا کر آباد ہو گئے ۔ ان سوالات کا جواب مصادر کے فقدان کے سبب وثوق سے نہیں دیا جا سکتا ۔ اسلامی روایات میں ان کا ذکر نہیں آتا ۔ وہ انھیں ثمود اور الحجر کے نبطیوں سے ملتبس کر دیتے ہیں ۔ لحیانی سلطنت کی یاد صرف ایک روایت سے تازہ ہوتی ہے، کہ بنو لحیان ''جُرْھُم کے پس ماندگان میں سے تھے''، جو بعد ازاں بنو ھذیل کا جزو بن گئے (الطبری، طبع de Goeje، ۱ : ۷۴۹، س ۱۱ تا ۱۲ [رک بہ جُرھم] بہ تتبع ابن الکلبی؛ تاج العروس، ۱۰ : ۳۲۴، س ۱ تا ۲ بہ تتبع الہمدانی، در الاِکلیل، لیکن یہ عبارت صفۃ جزیرۃ العرب میں پائی نہیں جاتی) ۔ ثمودی نقوش و کتبات (جنھیں ابتدائی عربی کہا جاتا رہا ہے) لحیانی رسم الخط کی ترقی یافتہ صورت میں ہیں جس کا آخری درجہ الصّفائی کتبات ہیں، لیکن ہم ان اقوام کے تاریخی روابط سے بالکل نا آشنا ہیں جنھوں نے ان جیسے رسم الخط اختیار کیے تھے ۔

دیدان العُلاء کے کھنڈروں کا اچھی طرح کھوج نہیں لگایا جا سکا، لیکن پھر بھی ان سے لحیانیوں کی اعلیٰ تہذیب و تمدن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ مقابر

کے علاوہ، جو ابھروان تصویروں اور نقوش سے مزیّن ہیں، Jaussen اور Savignac نے ایک خانقاہ کا بھی پتا چلایا ہے جس کے درمیان میں گول سا حوض بنا ہوا ہے ۔ اس کو بڑے بڑے مجسموں سے آراستہ کیا گیا ہے جن کے کئی اہم ٹکڑے دستیاب ہوے ہیں ۔ خانقاہ کے ایک کتبے سے وَدّ بت کے اَفکل کا پتا چلتا ہے ۔ یہ اصطلاح جو رسوم قربانی کی خدمات کا دوسرا نام ہے، مسلم روایات میں بھی پائی جاتی ہے (الاغانی ۲۱ : ۱۸۶؛ ابن درید : کتاب الاشتقاق، ص ۱۹۷ س ۷) ۔ جن دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے تھے، ان میں اللہ کے ساتھ اللّات، وَدّ، یَغُوث اور ذوغابہ شامل تھے ۔ مؤخرالذکر کی بابت وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ آرامی اصل کے دیوتاؤں، مثلاً بلسمن، جو آسمان کا دیوتا تھا، اور صَلْم وغیرہ کی عبادت کی جاتی تھی ۔ ان جیسے ناموں اور آرامی اصطلاحات سے (جن میں نَفْش، قبر کے معنوں میں آیا ہے)، نبطیون کے اثرات کا صاف پتا چلتا ہے، جنھوں نے معینیوں سے مل کر لحیانی تہذیب کی تشکیل کی ۔ ان میں یہودی اثرات کی موجودگی، جس کی شناخت کا Müller و Glaser کو زعم تھا، مشتبہ ہے ۔

مآخذ : (۱) Wüstenfeld : *Genealogische Tabellen M. 8. Register*، ص ۲۷۰)؛ (۲) ابن قتیبہ : کتاب المعارف، طبع Wüstenfeld، ص ۳۱؛ (۳) ابن درید : کتاب الاشتقاق، طبع Wüstenfeld، ص ۱۰۹؛ (۴) ابن الکلبی : جمہرۃ الانساب، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، ورق ۳۸؛ (۵) ابن ہشام : السیرۃ، طبع Wüstenfeld، ص ۶۳۸ تا ۶۴۲، ۹۸۱ تا ۹۸۳؛ (۶) الواقدی : کتاب المغازی، مترجمۂ Wellhausen، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰، ۲۲۴؛ (۷) الطبری : تاریخ الرسل و الملوک، طبع de Goeje، ۱ : ۱۴۳۱ تا ۱۴۳۷؛ (۸) Caetani : *Annali dell' Islām*، ۱ : ۵۷۷ تا ۵۷۸، ۵۸۱ تا ۵۸۲ (بذیل سال ۴ و ۳ قبل از ہجرت، ۳ تا ۴ و ۷ھ)؛ (۹) D. H. Müller : *Epigraphische Denkmäler aus Arabien*، در *Denkschriften Ak. Wien*، ج ۳۷ (۱۸۸۹ء)؛ (۱۰) E. Glaser : *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ص ۹۸ تا ۱۲۷؛ (۱۱) Jaussen و Savignac : *Mission archéologique en Arabie*، پیرس ۱۹۰۹ء، ۱ : ۲۶۳ تا ۲۷۱، پیرس ۱۹۱۴ء، ۲ : viii تا xiv، ص ۲۷ تا ۷۷، ۳۶۱ تا ۵۳۴؛ (۱۲) M. Lidzbarski : *Ephemeris für Semit. Epigraphik*، ۲ : ۲۳ تا ۴۸، ۳۴۵ تا ۳۶۱، ۳ : ۲۱۴ تا ۲۱۷

[(۱۳) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ، بالخصوص مآخذ؛ (۱۴) ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب، بمدد اشاریہ].

(G. Levi Della Vida)

لُحَیَّة : بحیرۂ احمر کے ساحلِ عرب پر خلیج جازان کے جنوبی سرے پر ایک بندرگاہ ۔ یہ چھوٹا سا شہر جو اب غیر اہم ہے ایسے مقام پر واقع ہے جو کسی وقت ایک جزیرہ تھا، لیکن نسبۃً جدید تغیرات ارضیہ کی وجہ سے بری علاقے سے مل گیا ہے ۔ مد کی حالت میں بری علاقے سے جدا ہو جاتا ہے اور بحالت جزر خشک بندرگاہ بن جاتا ہے ۔

[تفصیل کے لیے دیکھیے EI² لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ].

مآخذ : *Decada secunda da Aisa de Joao de Barros*، لزبن ۱۶۲۸ء، کتاب ۸، باب ۲؛ (۲) C. Niebuhr : *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۱۰، ۲۲۸؛ (۳) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، ۸/۱ (برلن ۱۸۴۶ء)، ص ۸۸۲ تا ۸۸۷؛ (۴) A. Sprenger : *Die alte Geographie Arabiens*، برن ۱۸۷۵ء، ص ۴۴ ببعد، ۲۵۲؛ (۵) R. Manzoni : *El Yemen, tre anni nell' Arabia felice.*

'Escursioni fatte dal Settembre 1877 al Marzo 1880
روما ۱۸۸۴ء، ص ۱۷۹؛ (۶) E. Glaser : Skizze
der Geschichte und Geographie Arabiens' : ۲
برلن ۱۸۸۹ء، ص ۳۳، ۳۸، ۴۳، ۵۵، ۱۳۸، ۱۵۲،
۲۳۸؛ (۷) H. Burchardt : Reiseskizzen aus dem
Yemen (Zeitscher. d. Ges. f. Erdkunde zu Berlin
۱۹۰۲ء)، ص ۵۹۳ ببعد؛ (۸) W. Schmidt :
'Das südwestliche Arabien (Angewandte Geographie
طبع H. Grothe، سلسلہ ۴، ۸ Hept، فرینکفرٹ
a/M ۱۹۱۳ء)، ص ۲۰؛ (۹) G. W. Bury :
'Arabia Infelix or the Turko in Yamen، لنڈن ۱۹۱۰ء،
ص ۲۶، ۱۱۹؛ (۱۰) F. Stuhlmann : Der
Kampf um Arabien zwischen der Türkei und
England (Hamburgische Forschungen Brunswick
Hand books ۱، ۱۹۱۶ء)، ص ۶۹؛ (۱۱)
prepared under the Direction of the Historical
'Section of the Foreign Office No. 61, Arabia
لنڈن ۱۹۲۰ء، ص ۴۴ ببعد، ۵۳، ۶۱، ۶۳؛ (۱۲)
Südarabien als Wirtschoftsgebiet : A. Grohmann
'Osten und Orient I. Reihe, Forschungen) جلد ۴،
وی انا ۱۹۲۲ء) ص ۲۴۸؛ (۱۳) The Statesman's
Year Book 1926، لنڈن ۱۹۲۶ء، ص ۶۴۴، ۶۴۷.

(ADOLF GROHMANN [و تلخیص از ادارہ])

* **لَخْم (بنو)** : عراق کے لخمی قبیلے کے سوا جس کا قدیم عربی شاعری میں بار بار ذکر آتا ہے، اس قبیلے کی دور جاہلیت کی تاریخ اچھی طرح معلوم نہیں ہے ۔ [بنو لخم کا نسب یوں ہے :- بنو لخم بن عدی بن الحارث بن مُرّۃ بن اُدَد بن زید بن یَشْجُب بن عَریب بن زید بن کَہْلان بن سَبَا ۔ عدی بن الحارث کے چار بیٹے تھے : (۱) الحارث، اسکی اولاد بنو عَامِلَۃ کہلائی؛ (۲) عَمرو بن عدی، اس کی اولاد بنو جُذام کہلائی؛ (۳) مالک بن عدی؛ یہ بنو لخم کہلائے اور (۴) عُفَیر، اس کی اولاد بنو کِندہ کہلائی] ۔ لخم کی خاص بات یہ ہے کہ یمنی اور معدّی دونوں عراق کے بااقتدار لخمی شاہی خاندان کے اخلاف ہونے کے دعویدار ہیں ۔ جہاں تک جُذام اور عاملہ سے لخم کی قرابت کا تعلق ہے، یہ ضرور ان حقائق کے مطابق ہے جو اس صدی میں جس میں اسلام کا ظہور ہوا، خاصی حد تک تسلیم کیے جا چکے تھے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ تینوں قبیلے اشتراک مقاصد و اغراض کی بنا پر ایک دوسرے سے وابستہ تھے، اور یہ بات ان کے نسلی رشتے کی ضامن ہے ۔

ان تینوں قبیلوں میں بنو لخم بلا شبہہ ممتاز ترین ہی نہیں بلکہ قدیم ترین بھی تھا ۔ اساطیر کی رو سے اس کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے جا ملتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی انہیں کنویں میں پھینک گئے تو انہیں جس شخص نے کنویں سے نکالا وہ ایک لخمی ہی تھا ۔ ہجرت نبوی سے کچھ ہی پہلے بنو لخم کا زور ٹوٹ گیا تھا، لیکن عاملہ [رَکّ بآں] اور خاص طور پر جذام کی اہمیت جنھوں نے بنو امیّہ کے تحت کارہائے نمایاں انجام دیے، بڑھ گئی تھی ۔ ہجرت نبوی سے دو صدی قبل لخمیوں کے بیشتر افراد جزیرہ نمائے عرب کے شمالی علاقوں مثلاً شام و فلسطین اور عراق میں آباد ہوگئے تھے جہاں انھوں نے الحیرہ [رَکّ بآں و مادّۂ جذیمہ] میں لخمی خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی جو غسانیوں سے ہمیشہ برسر پیکار رہتی تھی ۔ شام میں ہمیں لخمی انہیں خطّوں میں آباد ملتے ہیں جن میں جذام آباد ہیں ۔ جذام کی طرح انھوں نے بھی عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہی الحیرہ کے لخمیوں کا بھی سرکاری مذہب بن گیا تھا ۔

ظہور اسلام کے وقت قبیلۂ جذام شام کے لخمیوں کو جو ان کے رشتے دار تھے، عملاً اپنے میں جذب کر چکا تھا اور یہ عمل پر امن طریقے اور باہمی سمجھوتے سے مکمل ہوا۔ پہلی صدی ہجری میں ان دونوں قبیلوں کو عموماً ایک ہی گروہ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا تھا، حتّٰی کہ اگر کسی ''سردار لخم'' کا ذکر سن کر ہم یہ سوچنے لگیں کہ یہ سردار قبیلۂ جذام کا بھی حاکم تھا تو یہ کسی حد تک درست ہوگا۔ جُذامی کے مقابلے میں نسبت لخمی شاذ و نادر ہی استعمال ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو جن جنگوں کا سامنا ہوا اُن میں فتح شام کے وقت یرموک، بعد ازاں صِفّین کے معرکوں اور پھر حجاز کے مقدس شہروں پر یزید اول کے عہد کی جنگوں میں یہ دونوں قبیلے مشترک سرداروں کے ماتحت اور مشترک جھنڈوں تلے لڑے تھے۔ لفظ ''لخمی'' اب عملاً ایک اعزازی لقب سے کچھ ہی زیادہ اہمیت کا حامل رہ گیا تھا۔ حقیقت میں لخم کا جُذام سے علٰحدہ کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ دریائے فُرات کے مغربی علاقوں میں جب لخم کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد جُذام ہی ہوتا ہے، کیونکہ تذکرہ نویس بالعموم لخم سے جذام ہی مراد لیا کرتے ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن دُرید: کتاب الاشتقاق، ص ۲۲۰ تا ۲۲۷؛ (۲) ابن عبد ربّہ: العقد الفرید، ۲: ۸۰؛ (۳) الھمدانی: صفة جزیرة العرب، ص ۱۲۹، س ۹ وغیرہ، ۱۳۰، ۱۳۱، ۲۰۵، ۲۰۶؛ (۴) الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما، ۱: ۲۲۹، ۲۶۴؛ (۵) وہی مصنّف: کتاب البلدان، طبع de Goeje، ص ۳۲۹، ۳۴۳، ۳۴۴، (۶) البلاذُری: فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۵۹، ۱۳۶؛ (۷) المسعودی: مُروج الذّہب، مطبوعۂ پیرس، ۴: ۳۵۳، ۵: ۱۹۲؛ (۸) الکندی: وُلاۃ و قضاۃ مصر، طبع Rhuvon Guest، ص ۴۵، ۱۵۱، ۱۶۲؛ (۹) *Die Dynastie der Lahmiden in al-Ḥira*: G. Rothstein، ص ۱۴ وغیرہ؛ (۱۰) *Essai sur l'histoire des Arabes*: Caussin de Perceval، ۱: ۳۲۶، ۳۴۹، ۲: ۲۳۲، ۳: ۲۱۲، ۳۵۲، ۴۲۲؛ (۱۱) *Le califat de Yazid Ier*: H. Lammens [خلافت یزید اول]، ص ۲۷۲ تا ۲۷۴، *MFOB*، ج ۵: بار دوم، ص ۵۹۱ وغیرہ؛ [(۱۲) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ مع مآخذ].

(H. LAMMENS [و ادارہ])

لُدّ: فلسطین میں یافا کے جنوب مشرق میں ایک شہر۔ عہد نامۂ عتیق (صرف اخیر کی کتابوں یعنی عزرا، ۲: ۳۳؛ نحمیا ۷: ۳۷، ۱۱: ۳۵؛ اول تواریخ ۸: ۱۲) میں [بنو لود اور] لود شہر کے نام سے اور یونانی عہد میں اس کا لِدّۃ- Lydda کے نام سے ذکر آیا ہے۔ یونانی نام Diospolis کی وجہ سے جو اسے رومی عہد میں دے دیا گیا تھا، اس کا قدیم نام لُدّہ (Lydda) متروک نہیں ہوا، اس کے قائم رہنے میں عہد جدید اعمال، الرُّسل، ۹: ۳۲ نے مدد دی۔ عیسوی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں یہ ایک اہم مقام اور ایک بڑی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ اس میں بہت قدیم زمانے سے ربیّوں کا ایک مدرسہ تھا اور یہ ایک اسقف کا مستقر تھا۔ خاص طور سے یہ سینٹ جارج کی مزعومہ قبر کے لیے مشہور تھا، جس کے اوپر ایک کلیسا بنا دیا گیا تھا۔ فلسطین کے دیگر شہروں کے ساتھ اسے بھی حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے فتح کیا اور کچھ عرصے بعد یہ سلیمان بن عبدالملک کا عارضی دارالحکومت ہوا جسے اس کے بھائی خلیفہ ولید (۷۰۵ تا ۷۱۵ء) نے فلسطین کا عامل مقرر کر دیا تھا، یہاں تک کہ اس نے رملہ کو از سر نو تعمیر کیا اور اس کے بعد سے لدّہ کا زوال شروع ہوا۔ دسویں صدی میں المُقدّسی سینٹ جارج کے شاندار کلیسا کا ذکر کرتا ہے، نیز

مسلمانوں میں مشہور ایک کہانی بیان کرتا ہے، جو اس قاتل "ثُعبان" کی کہانی سے تعلق رکھتی ہے اور جس کی رو سے حضرت مسیح ایک روز کلیسا کے دروازے پر دجال (Anti-Christ) کو قتل کریں گے۔ فاطمی خلیفہ الحاکم (۹۹۶ تا ۱۰۳۰ء) کے زمانے میں اس کلیسا کو سخت گزند پہنچا۔ مگر اس کے بعد اس کی دوبارہ مرمت اور حسب ضرورت تعمیر کرائی گئی۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں اس پر پھر سخت زد پڑی اور صورت حالات یہ ہوئی کہ یہ ایک شاندار قبر کا منظر پیش کرتا تھا۔ عیسائیوں کا دور حکومت شروع ہوا تو لِدّہ کو پھر اسقف کی پایگاہ بنا دیا گیا۔ انہوں نے پرانے گرے پڑے گرجے کے بالکل ہی قریب ایک نیا گرجا تعمیر کرایا مگر وہ بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آخر سنہ ۱۲۷۱ء میں مغلوں کے ہاتھوں یہ شہر پورے طور پر تباہ و برباد ہو گیا، اسے پرانی عظمت پھر کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ دورِ حاضر میں یونانیوں نے کلیسا کو ازسر نو تعمیر کرایا ہے۔

مآخذ: (۱) P. Thomson : *Loca Sancta*، ص ۵۶؛ (۲) البلاذری، طبع de Goeje، ص ۱۳۸، ۱۴۳؛ (۳) الطبری: *Annales*، ۱ : ۲۴۰۶ ببعد؛ (۴) ابن الأثیر: الکامل، طبع Tornberg، ۲ : ۳۸۸، ۳۹۰؛ ۱۲ : ۴۷، ۵۸۷؛ (۵) *B G A*، طبع de Goeje : ۲ : ۱۵۹، ۱۷۶؛ ۶ : ۷۹؛ ۷ : ۳۲۸؛ (۶) یاقوت: معجم، Wüstenfeld، ۲ : ۸۱۸؛ ۴ : ۳۵۴؛ (۷) Robinson : *Palästina*، ۲ : ۲۶۳ ببعد؛ (۸) *Palestine Exploration Fund Memoirs*، ۲ : ۲۵۲، ۲۶۷؛ (۹) Guérin : *Judee*، ۱ : ۳۲۲ ببعد، (۱۰) C. Mauss : *Revue archeologique*، سلسلہ ۳، ۱۹ : ۲۲۳ ببعد.

(F. BUHL)

لُدھیانہ : ایک ضلع اور شہر کا نام جو بھارت کی مملکت میں صوبۂ پنجاب کی قسمت جالندھر میں واقع ہے۔ اس علاقے میں زمین کو زرخیز بنانے والا مادّہ موجود ہے۔ یہ میدانی علاقہ ہے جس کے شمال میں دریائے ستلج ہے۔ اس دریا کا پرانا راستہ اس میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس کا کل رقبہ ۱۴۵۵ مربع میل ہے۔ آبپاشی کے خاص وسائل میں نہر سرہند اور اس کی متعدد شاخیں شامل ہیں۔ اس کی قدیم تاریخ واضح نہیں۔ سنیت (Sunet) نامی ایک مقام سے قدیم زمانے کے سکے دستیاب ہوئے ہیں جو اس مقام سے مخصوص ہیں۔ اس علاقے کو سکھوں کے زمانے میں بڑی اہمیت حاصل تھی [اور اب بھی یہ سکھوں کا ایک بڑا مرکز ہے]۔ ۱۸۰۹ء میں لدھیانے میں سرحدی چھاونی قائم کی گئی اور سکھوں کی پہلی جنگ (۱۸۴۶ء) کے بعد اس علاقے کو اپنی موجودہ حدود کے مطابق ایک مکمل ضلع کی صورت حاصل ہو گئی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ضلع کی آبادی ۸۰۸۱۰۵ تھی۔ [۱۹۶۶ء میں مشرقی پنجاب کی تنظیم کے مطابق اس کا کچھ حصہ ہماچل پردیش اور ہریانے کے نئے صوبوں میں شامل کر دیا گیا، لیکن لدھیانہ بدستور اس پنجابی صوبے میں شامل ہے جس میں اس کے علاوہ امرتسر، گورداسپور، کپورتھلہ، جالندھر، فیروز پور، بھٹنڈہ اور پٹیالہ وغیرہ بھی شامل ہیں)۔

لدھیانے کا شہر ۳۰ درجے ۵۶ ثانیے شمال اور ۷۵ درجے ۵۲ ثانیے مشرق میں "دہلی - پشاور" کی بڑی شاہراہ Grand Trunk Road پر واقع ہے۔ اس کے بانی لودھی پٹھان تھے اور شہر کی وجہِ تسمیہ بھی یہی ہے۔ پہلی افغان جنگ کے بعد شاہ شجاع کے جلا وطن خاندان کے ارکان یہیں آکر آباد ہوئے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے

مطابق لدھیانہ شہر کی آبادی ۷۹۰، ۱۵۳ تھی [اور ۱۹۶۱ء میں ۲۴۴.۳۲]۔ لدھیانہ ایک بارونق تجارتی مرکز ہے۔ یہ شہر سر پر باندھنے کی لنگیوں اور شالوں کے کارخانوں کے لیے مشہور ہے۔ میزیں، کرسیاں اور دوسرا چوبی سامان بھی یہاں بنتا ہے۔ اون اور ریشم کی رنگائی کا کام بھی ہوتا ہے۔ یہاں جرابوں اور بنیانوں کے کارخانے اور دوسری قسم کی فیکٹریاں بھی ہیں۔

[تقسیم برصغیر سے پہلے لدھیانہ کپڑے کے کاروبار کا بڑا مرکز تھا، لیکن تقسیم کے بعد اس کی اہمیت میں نمایاں کمی ہو گئی، کیونکہ یہاں کے بہت سے تاجر اور بیوپاری دہلی اور سہارن پور چلے گئے۔ یہ شہر خاصہ بڑا تعلیمی مرکز ہے اور یہاں ایک گورنمنٹ ڈگری کالج موجود ہے]۔

مآخذ: پنجاب ڈسٹرکٹ گزیٹیر، لدھیانہ ۱۹۰۷ء۔

(R. B WHITEHEAD)

لُر: (فارسی میں Lor) ۔ ایک ایرانی قوم، جو جنوب مغربی ایران کے پہاڑی علاقے میں آباد ہے کُردوں کی طرح لُروں کی چار شاخوں (مَمَاسَنی، کُوہ گیلوئی، بختیاری اور لر خاص) کو باہم مربوط کرنے والی اہم چیز زبان ہی ہے۔ لُر بولیوں کی مخصوص صفات اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس علاقے پر جو ایرانی رنگ چڑھا ہے، وہ فارس کے علاقے سے آیا ہے نہ کہ میڈیا کے علاقے سے۔ ان قدیم لوگوں کے بارے میں جو معدوم ہو چکے ہیں یا ایرانی بن چکے ہیں یا لرستان کے مختلف حصوں میں جذب ہو چکے ہیں دیکھیے مادّۂ لرستان۔

نام: مقامی روایت (تاریخ گزیدہ) لُروں کے نام کو لُر مقام سے منسوب کرتی ہے، جو مان رُو کی گھاٹی میں واقع ہے۔ اس روایت کی بنیاد شاید اس مقام الُور al-lor کی یاد پر ہو، جس کا ذکر قدیم عرب جغرافیہ دانوں (اِصْطَخری، ص ۹۰ وغیرہ کے ہاں) پایا جاتا ہے اور یہ نام اب بھی صحرائی لُر میں جو دزفُول کے شمال میں ہے، باقی ہے اور بھی کئی ایک مقامات کے نام ہیں، جو لُر سے ملتے جلتے ہیں یعنی علاقۂ جُندیشابور کا ضلع لِیر، (Schwarz: *Persien*، ص ۶۶۶؛ دیکھیے کُوہ گیلوئی قبیلہ: لِیراوی) جس کا لُور کے ساتھ وہی تعلق ہو سکتا ہے جو لُری بولی کے لفظ پیل کو فارسی کے پول بمعنی "رقم" کے ساتھ ہے۔ لُردگان (یاقوت: لُردجان، موجودہ لُردگان) جو اصطخری کے قول کے مطابق سَردَن (کوہ گیلو اور بختیاریوں کے علاقے کے درمیان) کے علاقے کا صدر مقام تھا اور پھر لُرت Lurt یا Lort سے صیمرہ کے قریب ایک مقام؛ صرف مسعودی اپنی کُرد قبائل کی فہرست میں لُریہ قبیلے کا ذکر کرتا ہے جس سے اُلُر کے ضلع کے لُر مراد ہو سکتے ہیں۔ تیرھویں صدی میں یاقوت اس کُرد قبیلے کے لیے جو خوزستان اور اصفہان کے مابین پہاڑیوں میں آباد ہیں، لُور اور لُر کے نام استعمال کرتا ہے اور اس علاقے کو بلاد اللر یا لُرستان کہتا ہے۔

ان واقعات سے اس جغرافیائی اصطلاح کے (جو شاید ایرانی دور سے پہلے کی ہے) ایک نسلی نام بننے تک ارتقائی مراحل کا پتا چلتا ہے، لیکن اگر ہم لُر کے نام کے لیے ایرانی اشتقاق دریافت کرنا چاہیں تو اس کا تعلق لُہْر اسپ کے پہلے حصے کے ساتھ (جو von Bode پہلے ہی تجویز کر چکا ہے) فوراً سامنے آ جاتا ہے۔ Justi: *Iranisches Namenbuch* کے مطابق لُہْر کی اصل روذرہ ہے جس کے معنی ہیں "سرخ"۔ رُور مذکورۂ یاقوت، جو جگہ کا نام ہے، وہ شاید اس کی درمیانی کڑی بن سکے۔ تاریخ گزیدہ ایک مشہور عام اشتقاق بتاتی ہے، وہ یہ کہ لُر، لِر ہے جس کے معنی لُری میں سرسبز پہاڑی کے ہیں۔

[. . . . . تفصیل کے لیے دیکھیے ZDMG لائیڈن، بار اول، بذیل مادّہ]۔

مآخذ: مماسنیوں کے لیے (دیکھیے مادّہ شُوْل) اور کُوہ گیلُو کے لیے دیکھیے بالخصوص حسن قَسّائی: فارس نامۂ ناصری، جس پر مبنی ہیں Demorgny: *Les tribus du Fars, R.M.M.*، ۱۹۱۳ء، ۲۲، اور B. Miller: *Kočewiye plemena Farsa, Wost-Sbornik* سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۱۶ء، ۲: ۲۱۳ تا ۲۱۸ - نیز دیکھیے: فہارس Baring، Bode، Layard، Sheil وغیرہ (جن کا خلاصہ کرزن کی پرشیا *Persia*، ۲: ۳۱۷ پر دے دیا گیا ہے)، نیز O. Mann کی کتاب *Die Mundarten d. Lur-Stämme*، کی فہرست ص ۱۵ تا ۲۱ - بختیاریوں کے لیے ملاحظہ ہو: (۱) Rawlinson: *A March from Zohāb*، ص ۱۰۲ تا ۱۰۶، (دیکھیے Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۲۱۰ تا ۲۱۵)؛ (۲) Layard: *Descrip. of Khuzistan*: (۳) اور بالخصوص *Early Adventures*؛ (۴) Curzon: *Persia*، ۲: ۲۸۶ تا ۲۸۸ - لروں کے متعلق ملاحظہ ہوں (۵) رالنسن کی فہرستیں (Ritter: *Erdkunde*، ۴: ۲۱۵ تا ۲۱۹)؛ (۶) Bode؛ (۷) Layard؛ (۸) Houtum-Schindler؛ (۹) Čirikow، O. Mann (۱۰)، کتاب مذکور، ص ۲۳ اور خصوصاً مقالات؛ (۱۱) Rabino: *R.M.M.*، ۱۹۱۶ء اور (۱۲) Edmonds: *Geogr. Journ*، ۱۹۲۲ء.

لُری زبان: بیسویں صدی کے آغاز تک لروں کی بولیوں سے متعلق ہمارا علم صرف Rich کے مرتبہ ۸۸ الفاظ، Layard کے درج کردہ چار بختیاری اشعار اور Houtum-Schindler کے جمع کردہ تقریباً تیس الفاظ تک محدود تھا - *Grundriss d. Iran. Phil.*، ۱/۲ (۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۱ء، ص ۲۴۹) کے زمانے تک کی تحقیق یہی بتاتی رہی کہ لُری کا کردی زبان سے بہت ہی گہرا تعلق ہے بلکہ اسے کردی کی ایک مقامی بولی بھی قرار دیا جا سکتا ہے - ژکووسکی Žukowski کا مجموعہ (جس کا مواد ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۶ء تک کی مدت میں جمع کیا گیا) مصنّف کی وفات (۴ جنوری ۱۹۱۸ء) کے ایک روز بعد آخری صورت میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا - لہٰذا اس اہم حقیقت کو ثابت کرنے کا سہرا کہ کُردی اور لُری دو مختلف زبانیں ہیں ("eine tiefgehende Scheidung" O. Mann ("des Kurdischen vom Luri کے سر ہے - اس فاضل نے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ کُردون کی بعض شاخیں لُرستان میں آباد ہیں (دیکھیے مادّہ لک) اصلی لُروں کی بولیاں بلا شک و شبہہ (فارسی اور فارس کی بولیوں کی طرح) جنوبی مغربی ایرانی بولیوں کے زمرے میں ہیں اور (کُردی زبان اور مرکزی بولیوں کی طرح) شمال مغربی زمرے سے متعلق نہیں ہیں.

لُری بولیاں جن میں کردی بولی کی سی کوئی درشتی موجود نہیں ہے (دیکھیے کرد) دو قسموں میں بٹ جاتی ہیں - پہلی قسم میں لرکلان کی بولیاں ہیں: مماسنی، کُوہ گیلُو اور بختیاری (مؤخر الذکر بولی کی چند ایک اپنی خصوصیات ہیں، لیکن غیر اہم ہیں) - دوسری قسم میں لُرِ خُرد کی تمام بولیاں شامل ہیں، یعنی فیلی لُروں کی بولیاں - حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے زمرے کی بولیاں بھی بمقابلہ جدید فارسی کے بہت ہی کم مخصوص صفات کی حامل ہیں - صوتیات کے اعتبار سے کسی لفظ کے آخر میں ـــ مْ am - اوم om - یا اُم um بن جاتا ہے (می کُنِم mikunām ای کُنوم ikunom؛ آدِم ādām، آذوم ādhom)؛ اُو d، ای l میں بدل جاتا ہے: پول pūl، پیل pīl؛ دو حروف علت یا حرکات کے مابین dh (ی y) کی آواز دیتا ہے: می دِهم/ای دُم؛ خت Kht- اور - فت ft - کا مرکب - hdh - هذ اور هت ht- (ت t) کی آواز دیتا ہے: دُخْتِر dukhtār - دُهْذِر duhdhār رِفت rāft رِهت rāht؛ ابتدائی خ h-kh بن جاتی ہے: خانه هونه وغیرہ - مخصوص طور پر بختیاریوں کے ہاں دو

حروف علت یا حرکات کے مابین میم آئے تو واو میں بدل جاتا ہے جووِ جامہ (djämä djuwä) اور گاہ بگاہ شین، سین میں بدل جاتا ہے ۔ اِی سا=اِشان ۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان بعض صوتی خصوصیات کو مدت ہوئی حمد اللہ مستوفی (تاریخ گزیدہ، ۵۳۶، ۵۳۷) نے سمجھ لیا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ لُری میں (اگرچہ اس میں عربی الفاظ کی کثرت ہے) عربی کی خاص اصوات نہیں ہیں ۔ مثلاً خ، ش، غ، ف، اور ق ۔ تعریف: علامت جمع گِیل، پِیل، اِیْل مثلاً آنہا، آن گِیل ängäl؛ علامت مفعول را ra- کے بجائے نے nä اور اِے ä سے بنتا ہے، یونِے گوت yonä got = این را گفت؛ حال بنانے کے لیے فارسی کی می کے بجائے اِی i؛ ضمیر جمع متکلم متصل ہے اِیمو (ن) (n) imū- اِخیریمون (n) ikhärimū = می خیریم mikharim- لُری میں فارسی زبان کی طرح افعال معروف کی ماضی ضمائر متصل فاعلی (معروف) کی مدد سے بنتی ہے، برخلاف کُردی اور اکثر ایرانی بولیوں کے (فارس کی مقامی بولیوں کو شامل کرکے) جن میں ماضی کو مجہول کی شکل دی جاتی ہے ۔

ذخیرۂ الفاظ: ریشہ ہائے حال ماضی میں لُری بولی فارسی کی پیروی کرتی ہے، لیکن اس میں ایسے ریشے اور کلمات بھی موجود ہیں، جو فارسی زبان میں نہیں، اِی وِینُم iwänum، وِیندُم wändum (''پھینکنا'')؛ تِر tär، اِی تِیرم itärom (''سکنا'')، تِیہ tia (''آنکھ'') وغیرہ ۔ دورِ مغول کے متعدد کلمات لُری میں محفوظ ہیں، مثلاً تُوشمال tushmāl (رئیس تیرہ)، مغلی زبان میں یہ کلمہ تِیشے مِل tüshümel ہے ''سرکاری عہدیدار'' ''قیتل'' خان کا محافظ، مشرقی ترکی میں یہ لفظ بمعنی اردو ہے ۔ دیکھیے Budagow، ۲ : ۱۰۲، کُورین Küräń، لشکرگاہ'' ۔ مغلی زبان میں Küren ''خیمہ، تنبو''۔

باقی رہا فیلی Feili گروہ، سو ان کی زبان عام فارسی سے بہت کم مختلف ہے : O. Mann : "*Welter nichts als ein stark aqgeschliffenes Persisch*".

لُرستان میں بیچ بیچ میں کُردوں کی چند مجزّا آبادیاں ہیں، جو کسی قدر اہمیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ شمال میں ایلات لَک ہیں [رک بآں] فیلی میں مَہکی گروہ (کرمان شاہ کی سرحد پر، حُلَیلان کے مقام پر اور مزید جنوب میں) کَلہُروں کی طرح کی جنوبی کردی بولتا ہے ۔ کُردِ شُوہان گروہ (پشتِ کوہ کے جنوب میں) ''کُرمنجی'' کردی بولتا ہے ۔ پشتِ کُوہ کی لسانی کوائف کے لیے ابھی مزید مطالعے کی ضرورت ہے ۔

مآخذ: (۱) Lerch : *Izsledowaniya*، ۳ : ۱۱ تا ۱۴ (جرمن ترجمہ *Forschungen*، ۲)؛ (۲) O. Mann : *Kurze Skizze d. Lurdialecte, Sitzungsb Berl. Akad.*، ص ۱۱۷۳ تا ۱۱۹۳ء؛ (۳) O. Mann : *Die Mundarten d. Lur-Stämme im Süd-West Persian Kurd-pers Forschungen*، برلن ۱۹۱۰ء، جزء ۲ (مآخذ ایلا کی فہرست، مماسنی، کوہ گیلوئی، بختیاری اور فیلی متون)؛ (۴) D, L. R. Lorimer : *The Phonology of the Bakhtiari*، مطبوعۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۵) ژکووسکی Žukowski، (متوفی ۴ جنوری ۱۹۱۸ء) : *Materiali dl'a izuč pers. narečij* ۳ : بختیاری چارلنگ، اور ہفت لنگ کی بولیاں، پیٹروگراڈ ۱۹۲۲ء (متون ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۶ء تک کی مدت میں جمع کیے گئے ۔ ''بختیاری بہ روسی'' اور ''روسی بہ بختیاری'' فرہنگین)؛ (۶) Hadank در مقدمۂ کتاب O. Mann : *Kurdisch Persische Forschungen* برلن ۱۹۲۶ء، ۱، ۳ Romaskewič کے اس مواد سے جو مماسنی اور کُوہِ گیلوئی سے متعلق ہے دیکھیے *Bull. Acad. de Russie*، ۱۹۱۹ء، ص ۴۵۲ ۔

ادبِ لُری: لُر اقوام بالخصوص بختیاریوں

کے عوامی ادب کا کافی ذخیرہ ہے۔ پریوں کی کہانیاں، رزمیہ قطعے، جن میں اُن کے بہادروں کے کارناموں کی تعریف ہے (جیسے محمد تقی خان چارلنگ اور حاجی ایلخانی ہفت لنگ)، ترانے اور گیت جو شادیوں وغیرہ کے مواقع پر گائے جاتے ہیں (واسینک) اور لوریاں (لالائی) ۔ یہ قطعے اکثر دلکش اور جذبات سے لبریز ہوتے ہیں، دیکھیے O. Mann اور Žukowski کے مجموعے (مؤخر الذکر نے *Journ, Min. Narodn. Prosveshč*، جنوری ۱۸۸۹ء میں فارسی اور بختیاری لوریوں پر ایک مقالہ شائع کرایا تھا؛ D. L. R. Lorimer اور E. O. Lorimer: *Persian Tales*، لنڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۹۷ تا ۳۰۱، *Baktiari Tales* (محض تراجم)۔

ایسے لُری شاعر بھی ہیں جو مروجہ اصناف میں شعر کہتے ہیں: حسین قلی خان ہفت لنگ (۱۸۸۲ء میں مقتول ہوا) نجما مماسنی، دفتری، فائض، ایزدی (متوفی ۱۹۰۰ء)، علی اصغر خان نہاوندی، (دیکھیے O. Mann)۔ شیخ علی اکبر مُعمّم کا تصنیف کردہ معراج نامۂ بختیاری ۱۳۱۴ھ میں تہران میں لیتھو میں چھپا تھا۔ ملا زلف علی کُرّانی کی ایک غزل، Y. Marr نے ۱۹۲۲ء میں *Comptes Rendus de l' Acad. de l' U.R.S.S.*، ص ۵۵ تا ۵۸ شائع کی تھی۔ Y. Marr کے بیان کے مطابق عُمّانِ سامانی کا تالیف کردہ تذکرہ سالار فاتح کے کتابخانے میں موجود ہے۔ اسی قسم کا ایک تذکرہ احمدی بختیاری کا تألیف کردہ بھی ہے۔ [لر کی تاریخ کے لیے دیکھیے ⇐ لائیڈن، بار اوّل بذیل مادّہ].

(V. MINORSKY) [و تلخیص از ادارہ]

* لُرِ بزرگ: اتابکوں کا ایک خانوادہ جسے ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء اور ۸۲۷ھ/۱۴۲۳ء کے مابین مشرقی اور جنوبی لرستان [= لُورستان] میں جس کا دارالسلطنت اِیذَج (= مالمیر) تھا، عروج حاصل ہوا۔

اس خانوادے کا جسے ''الاَتابِکَۃ الفَضْلَوِیَّۃ'' بھی کہتے ہیں، اتابک بانی کہلاتا تھا، شام کا کرد سردار تھا ۔ جس کا نام فضلویہ تھا ۔ اس کے اخلاف (جہاں آرا میں ابو طاہر کے ۹ اَسلاف کا ذکر آیا ہے) شام سے نقل مکانی کر کے آئے اور میا فارقین اور آذربیجان سے ہوتے ہوئے (جہاں انھوں نے گیلان کے امیرا دیباج [؟] سے رشتے داری قائم کر لی) اُشتران کوہ (لرستان) کے شمالی میدانوں میں آ گئے ۔ [⇐ تفصیل کے لیے دیکھیے ⇐ لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) رشید الدین [جامع التواریخ]، طبع Quâtremère؛ (۲) وصاف: تجزیۃ الامصار، مجلد دوم، تاریخ یوسف شاہ و افراسیاب؛ (۳) حمد اللہ مستوفی: تاریخ گزیدہ، مع ضمیمۂ تاریخ مظفری، سلسلۂ یادگار گب ص ۵۳۷ تا ۵۴۷، ۷۲۳، ۷۲۵، ۷۴۵ مبنی بر رشید الدین [جامع التواریخ] و جمال الدین کاشانی: زبدۃ التواریخ؛ (۴) محمد بن علی شبانکاری: مجمع الانساب (در ۷۴۳): ضمیمہ (بہ اعانت رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مقالہ نگار نے مارلے Morley کی فہرست مخطوطات سے استفادہ کیا ہے، شمارہ XV، جس میں لر بزرگ کا ضمیمہ شامل ہے (ورق ۱۴۲ تا ۱۴۵)، [مصنف کے بیانات قدرے خلط ملط ہو گئے ہیں]؛ (۵) ظفر نامہ، ۱: ۴۳۸، ۵۹۹، ۶۱۹، ۸۱۱؛ (۶) میرخواند: روضۃ الصّفا ج ۴؛ (۷) قاضی احمد غفاری: جہان آرا (در ۹۷۲) قلمی نسخہ برٹش میوزیم، اورینٹل، شمارہ ۱۴، اوراق ۱۳۷ تا ۱۴۰ (راقم الحروف کو محمّد خاں قزوینی نے یہ کتاب مرحمت کی)، اس میں سے کچھ مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں؛ (۸) شرف نامہ، ۱: ۲۳ تا ۳۲، جس کی ابتدائی معلومات تاریخ گزیدہ کے متن پر مبنی ہیں؛ (۹) خسرو ابرقوہی: فردوس التواریخ، شرف نامہ کے ترجمے از Charmoy ۲/۱: ص ۳۲۸ تا ۳۳۷ میں لُر بزرگ کے متعلق کچھ بیان درج ہے؛ (۱۰) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۲۸۶

(دیکھیے Charmoy، ترجمۂ مذکور، i/۱، ص ۱۰۰ تا ۱۱۶؛ (۱۱) منجم باشی: ۲: ۵۹۷ تا ۵۹۸؛ (۱۲) d'Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۳: ۲۴، ۲۸، ۲۳۰، ۲۵۹، ۴۰۰، ۴۵۵، ۵۸۹، و ۴: ۵، ۱۲، ۶۲، ۹۴، ۱۱۴، ۱۶۹، ۱۷۰، ۵۸۰؛ (۱۳) Howorth : *History of the Mongols*، ۳: ۱۴۰، ۴۰۷، ۷۵۱ تا ۷۵۴ جو تیمور میرزا سکندر کے پوتے کی گمنام تاریخ کے بیانات بروے کار لایا ہے۔ یہ تاریخ ۸۱۵ھ میں تالیف ہوئی۔ خطّی نسخے موزۂ برطانیہ (اورینٹل، شمارہ ۱۰۶۶) [نیز دیکھیے تاریخ الدّول الاسلامیة و معجم الأسر الحاکمة، ۲: ۳۶۷ تا ۳۶۹] میں موجود ہیں.

(V. MINORSKY [و تلخیص از ادارہ])

لُرستان: [= لُورستان]؛ "لُروں کی سرزمین" ایران کے جنوب مغرب میں ایک علاقہ۔ عہد مغول میں "لُر بزرگ" اور "لُر کوچک" کے دو نام قریب قریب اس تمام علاقے پر حاوی تھے، جہاں لُر قبائل آباد تھے۔ صفوی عہد کے بعد سے لُر بزرگ کی سرزمینوں کو کُوہ گِیلُو اور بختیاری کے ناموں سے پکارا جانے لگا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسنیج حلیفوں نے قدیم شُولستان [رک بآں] پر قبضہ کر لیا اور یوں گویا کوہ گِیلُو اور شیراز کے مابین ایک تیسرا لُر علاقہ پیدا ہو گیا.

مگر یہ سولھویں صدی عیسوی کے بعد کی بات ہے کہ لُر کوچک [رک بآں] لُرستان کے نام سے معروف و مشہور ہے (زیادہ صحت کی رعایت کے لیے اسے لُرستانِ فیلی کہتے تھے)۔ انیسویں صدی میں لُرستان دو حصوں میں بٹ گیا: (۱) پیش کُوہ یعنی ملک کا وہ حصہ جو پہاڑ کی اس جانب (کبیر کوہ کے مشرق میں ہے)؛ (۲) پُشت کُوہ (ملک کا وہ حصہ جو پہاڑ کی دوسری جانب ہے) یعنی کبیر کوہ کے مغرب میں۔ عہد حاضر میں لرستان کے لفظ سے بالعموم پیش کوہ مراد لی جاتی ہے اور پشت کوہ کا مطلب فیلی علاقہ ہے [—تفصیل کے لیے دیکھیے EI² لائیڈن، بار اول، بذیل مادّہ].

مآخذ: مادّے (۱) بختیاری، کارون، کرخہ، خرّم آباد، کُرد، مالمیر، ماسبّزان، شُول؛ (۲) Stocqueler : *Fifteen Months' Pilgrimage through Khuzistan*، لنڈن ۱۸۳۱ء، (دیکھیے Bode، ۱: ۳۲۵)؛ (۳) Aucher Eloy : *Relations de Voyages*، ۱۸۳۰ء، ص ۲۷۰ تا ۲۸۵، ۳۲۹ تا ۳۳۱؛ (۴) Rawlinson : *Notes on a March from Zohab*، در *J. R. G. S.*، ۱۸۳۹ء، ج ۹؛ (۵) Ritter : *Erdkunde*، برلن ۱۸۴۰ء؛ ۹: ۱۴۴ تا ۱۵۸، ۱۹۹ تا ۲۱۹، ۳۲۳ تا ۴۱۱ (بیشتر رالنسن سے)؛ (۶) Layard : *Ancient cities among the Bakhtiari Mountains*، در *J.R.G.S.*، ۱۸۴۲ء، ص ۱۰۲ تا ۱۰۹؛ (۷) Bode : *The country of Mamaseni and Kuhgilu*، در *JRGS*، ۱۸۴۳ء ج ۸، ص ۷۰ تا ۸۵؛ (۸) وہی مصنف: *From Behbehan to Shustar*، مجلۂ مذکور، ۸۶ تا ۱۰۷؛ (۹) وہی مصنف: *Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۹ء، ج ۱، ۲؛ (۱۰) Layard : *A Description of the Province of Khuzistan*، در *J.R.G.S.*، ۱۸۴۶ء، ۱۶: ۱ تا ۱۰۵؛ (۱۱) Loftus : *On the Geology of the Turco-Persian frontier, Quarterly J. Geolog. Soc.*، ۱۸۵۴ء و ۱۸۵۵ء، ۱۰: ۴۶۴ تا ۴۶۷، ۱۱: ۲۴۷ تا ۳۴۴ (بالخصوص ص ۲۶۱ تا ۲۶۵: ڈزفول، خرّم آباد، نقشہ ۹، بہ الوان و تصاویر، ۳ تا ۸)؛ (۱۲) Lady Sheil : *Glimpses of life*، لنڈن ۱۸۵۶ء، ص ۳۹۳ تا ۴۲۲ (قبائل کی فہرست از Col. Sheil)؛ (۱۳) Loftus : *Travels and Researches in Chaldaea and Susiana*، لنڈن ۱۸۵۷ء؛ (۱۴) Comte Rochechouart : *Souvenirs d' un voyage en Perse*، پیرس ۱۸۶۷ء، ص ۹۱؛ (۱۵) Spiegel : *Erânische Alterthümer*، ۱۸۷۱ء، ۱: ۱۰۵ تا ۱۱۳، ۷۵۱ تا ۷۵۸؛

(۱۶) Čirikow : *Putewoi Journal*، ۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۲ء)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ص ۸۵ تا ۸۸، ۱۲۲ تا ۱۳۱، ۱۳۳ تا ۱۴۱ : ڈزفول، مُون گرہ، خُرّم آباد بُروجرد، ص ۲۱۱ تا ۲۴۱ : کرمان شاہ، ھُلیلان، علی گیجان، جایدر، پُل تنگ، قلعۂ رضا، شوش، ص ۲۶۹ تا ۲۸۱ : ڈزفول، جایدار، رُویار، شیروان، عاصم آباد، [آسمانہ]، ھارون آباد، کرند، ص ۳۷۹ تا ۴۲۴ : خانقین، صندلی، حویزہ، شوش، ڈزفول پایی پل، ڈگہ، دہ لران، چنگلہ ـ مندلی، خانقین، ص ۸۸ تا ۱۲۱ : خوزستان و لرستان (Layard کے مطابق)، پیش کوہ ("انگریزی روسی" تحقیق و استکشاف (۱۸۴۹ تا ۱۸۵۲ء) موجودہ تمام نقشوں کی بنیاد ہے)؛ (۱۷) خورشید افندی : سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ از Ghamazow، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء، ص ۸۴ تا ۱۰۹ : فیلی، جسان، بدرہ، مندلی، ص ۳۷۰ تا ۳۸۱، پشت کوہ؛ (۱۸) Houtum Schindler : *Reisen im südwestlichen Persien, Zeitschr. d. Gesell. f. Erdkunde*، ۱۸۷۹ء، ۱۴ : ۳۸ تا ۶۷، ۸۱ تا ۱۲۴ (شُوشتر، مالمیر، دُھلون، اصفہان، فریدن، بُرُبرُود، جاپلق، بُروجرد، خُرّم آباد دو راستے ڈزفول، رام ھرمز، اھوازکو)؛ (۱۹) Rivadaneyra : *Viaje en Persia*، میڈرڈ ۱۸۸۰ء، جلد ۲ (نہاوند، بُروجرد، خُرّم آباد، ڈزفول)؛ (۲۰) Lady A Blunt : *A Pilgrimage to Nejd*، لنڈن ۱۸۸۱ء، ج ۲ : ۱۱۳ تا ۲۲۳ : عمارہ، ڈزفول، بھبہان؛ (۲۱) Stack : *Six Months in Persia*، لنڈن ۱۸۸۲ء، ج ۲، اصفہان، چغاخور، دوک، مُایجن، خونسار؛ (۲۲) H. L. Wells : *Surveying Tours in Southern Persia*، (بھبہان، شیراز)، *Proc. R. G. S.*، ۱۸۸۳ء، ج ۵؛ (۲۳) Col. Bateman Champain : *On the Various Means of Communication between Central Persia and the Sea*، *Proc. R. G. S.*، مارچ ۱۸۸۳ء، اسی روداد میں مقالہ discourse از M. Mackenzie دیکھیے *Communication to the Earl of Derby by Gray Davis and Co.*، لنڈن ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۵ء)؛ (۲۴) Layard : *Early Adventures*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ج ۱، ۲؛ (۲۵) Col. M. S. Bell : *A visit to the Karun River and Kum*، در *Blackwood's Magazine*، اپریل ۱۸۸۹ء، (بُروجرد، ڈزفول)؛ (۲۶) A. Rodler : *Bericht ü. eine geolog. Reise im Westl. Persien*، *S. B. Ak. Wien*، ۹۷ : ۱۸۸۹ء، ۱ : ۲۸ (دیکھیے *Pet. Mitt*، ۱۸۸۹ء، ص ۲۷) : سلطان آباد، جاپلق، شتوران کوہ (۳۵۰۰ میٹر)، چغاخور، چارمحل، فریدن؛ (۲۷) H. Blosse Lynch : *Across Luristan to Ispahan*، در *Proc. R.G.S.*، ستمبر ۱۸۹۰ء؛ (۲۸) W.F. Ainsworth : *The River Karun*، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۲۹) Bishop : *Journey in Persia*، ۱۸۹۱ء (letters، ۱۴ تا ۲۰، اصفہان، شلمزار، کوہ رنگ ماسیر، بادوش، خان آباد، خُرّم آباد، بُروجرد)؛ (۳۰) Curzon : *Persia and the Persian Question*، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۲ : باب ۲۴؛ جنوب مغربی صوبے، ص ۲۶۸ تا ۳۲۰؛ (۳۱) de Morgan : *Miss.*، *scient*؛ *Études Géogr.*، پیرس ۱۸۹۵ء، ص ۲۱۴ تا ۲۴۸ : پشت کوہ : نفیس تصاویر (نقشے)؛ Elam کا نقشہ ۱۸۹۵ء میں الگ طبع ہوا؛ (۳۲) H. A. Sawyer : *The Bakhtiari Mountains and Upper Elam*، در *Geog. Journ.*، ۱۸۹۴ء ص ۴۸۱ تا ۵۰۱ (دیکھیے *Report on a Reconnaissance in the Bakhtiari*: Sawyer *Country*، شملہ ۱۸۹۱ء، ص ۱ تا ۱۰۸)؛ (۳۳) Tumanski : *Ot Kaspiiskago mor' a k Hormuzskomu prolivu*، در *Sbonik materialow po Azii*، ج ۶۵، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۶ء، (بُروجرد، اصفہان)؛ (۳۴) Tomilow : *Otcet o poyezdke po Persii*، تفلس ۱۹۰۲ء، ص ۱۶۰ : ڈزفول، خُرّم آباد، بُروجرد؛ (۳۵) Lady Durand : *An Autumn Tour in Western Persia*، ۱۸۹۹ء) لنڈن ۱۹۰۲ء (اصفہان، اھواز، ڈزفول، خُرّم آباد بُروجرد)؛ (۳۶)

Fcuvrier : *Trois ans à la cour de Perse*، پیرس بلا تاریخ (لُرو جرد کے قریب و جوار میں)؛ (۳۷) Barthold : *Istor. Geogr. Obzor Irana*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۱ تا ۱۲۹ (لرستان)؛ (۳۸) Strauss : *Eine Reise an d. Nordgrenze Luristans*؛ Strauss در *Pet. Mitt.*، ۱۹۰۵ء، ص ۲۶۵ تا ۲۷۱؛ (۳۹) Smirnow : *Izwestia Shtaba Kawkaz. Okruga Luristan* در تِفلِس ۱۹۰۵ء، عدد ۱۱ تا ۱۲، ص ۱ تا ۵۳ (فرانسیسی اور فارسی مواد سے)؛ (۴۰) Herzfeld : *Eine Reise d. Luristan*، در *Pet. Mitt.*، ۱۹۰۷ء، ۵۳ : ۳۹ تا ۶۳، ۷۲ تا ۹۰، (خانقین، صَیمَرہ، اہواز، کوہ گیلو، شیراز)؛ (۴۱) D. L. R. Lorimer : *Report on Pusht-i-Kuh*، ۱۹۰۸ء؛ (۴۲) H. Grothe : *Wanderungen in Persien*، برلن ۱۹۱۰ء (پشت کوہ)؛ (۴۳) d'Allemagne : *Du Khorassan au pays des Backhtiaris (sic)*، پیرس ۱۹۱۱ء ۴ : ۱۳۷ تا ۲۱۶ (اصفہان، جُنگُون)؛ (۴۴) Minorsky : *Materiali po Wostoku* در سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء ۲ : ۲۷۶ تا ۳۲۵ : دُزفُول ـ دُوْرَج، بکسایہ، مندلی؛ (۴۵) Rabino : *Les tribus du Louristan*، در *RMM* ۱۹۱۶ء، ص ۱ تا ۴۶؛ (۴۶) Watelin : *La Perse immobile*، ۱۹۲۱ء (لرستان کی بعض عکسی تصاویر)؛ (۴۷) Edmonds : *Luristan Pish-i-Kuh and Bala-Gariveh*، در *Geogr. Journ* مئی ۱۹۲۲ء، ص ۳۳۵ تا ۳۵۶، جون، ص ۴۳۷ تا ۴۵۳ (مون کرّہ، دُزفول، خرّم آباد، کرمان شاہ)، بہت سی نئی اور دلچسپ معلومات [Edmonds نے برٹن ۱۸۹۷ء، Williams (۱۹۰۸ء) اور A.T. Wilson (۱۹۱۱) کے اکتشافات کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ شائع نہیں ہوے)؛ (۴۸) Maunsell : *The Land of Elam*، در *Geogr. Journ*، مئی ۱۹۲۵ء، ص ۴۳۲ تا ۴۳۷ (پشت کوہ)؛ (۴۹) Cl. Anet : *Feuilles Persanes*، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۲۱۴ تا ۲۵۵ (چہار محل)؛ (۵۰) M. C. Cooper : *Grass*، نیویارک ۱۹۲۵ء (ایک نہایت ہی قابل تعریف مُصوّر کتاب جس سے بختیاری قوم بابا احمدی کی موسمی نقل مکانی کا پتا چلتا ہے : شوشتر، شمبار، زردہ کوہ، چہار محل).

(V. MINORSKY [و تلخیص از ادارہ])

لُرِ کُوچک : اتابکوں کا ایک خاندان جس نے ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء تا ۱۰۰۶ھ / ۱۵۹۷ء شمالی اور مغربی لُرستان میں حکومت کی ـ خرم آباد ان کا دارالحکومت تھا ـ یہ اتابک جنگرُوی (جنگرُدی؟) کے لُر قبیلے کی نسل سے تھے۔ اس خاندان کے افراد پہلے اتابک کے نام کی نسبت سے بنو خورشید بھی کہلائے (یہ ابھی تحقیق طلب ہے کہ اس نام کا تعلق محمد خورشید کے ساتھ ہے جو اتابکان لُرِ بزرگ کے عروج سے پہلے لُرستان کے حکمران کا وزیر تھا) ـ ۷۳۰ھ / [۱۳۲۹ء] کے بعد حکومت کا اقتدار اتابکوں کی ایک اور شاخ کے ہاتھوں میں چلا گیا جنھوں نے یہ دعوٰی کیا کہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں ـ ان کے زمانے میں ''اتابک کے بجاے'' ''ملک'' کا لقب اختیار کیا گیا ـ بنو خورشید کے اسلاف نے حسام الدین (''جو شُوشلی یا شُوھلا'' ترک قبیلے سے تھا) کی ملازمت اختیار کی جس کی حکومت سلاجقہ کے عہد آخر میں ۵۵۰ھ / ۱۱۵۵ء تا ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء لرستان اور خوزستان میں تھی ـ [.... تفصیل کے لیے دیکھیے ZDMG لائیڈن بار اوّل، بذیل مادّہ]؛ [نیز احمد السعید سلیمان : تاریخ الدول الاسلامیہ و معجم الاُسَر الحاکمۃ، ۲ : ۳۷۰ تا ۳۷۲].

مآخذ : (۱) تاریخ گزیدہ، سلسلۂ یادگار گب، ۱/۱۶ : ۵۴۷ تا ۵۵۷، ۷۰۰؛ (۲) ظفر نامہ، ۱ : ۳۰۵، ۳۳۸، ۵۸۷ تا ۵۸۸، ۵۹۳، ۷۸۸، ۸۱۱ و ۲ : ۵۱۵، ۵۵۵؛ (۳) تیمور کے پوتے میرزا سکندر کے گمنام مؤرخ کی تاریخ (جسے Howorth نے استعمال کیا ہے)؛ (۴) قاضی احمد غفاری : جہان آرا، (۵) شرفنامہ، ۱ : ۳۲ تا ۵۵؛ (۶) عالم آرای عباسی، تہران ۱۳۱۴ء

ص ۳۲۰، ۳۴۲، ۳۶۷ تا ۳۷۰؛ (۷) جهان نما؛ (۸) منجم باشی، ۲: ۵۹۸ تا ۶۰۰؛ (۹) d, Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۳: ۲۵۰ تا ۲۶۱؛ ۴: ۱۷۱، (۱۰) Hammer : *Gesch. d. Ilchane*، ۱: ۱۶۱ تا ۱۶۳؛ (۱۱) Howarth : *History of the Mongols*، ۳: ۱۳۰، ۴۰۶، ۷۵۴.

(V. MINORSKY [و تلخیص از اداره])

* **لِزْبُن** : پرتگالی **لِزْبوا** - دریاے تاجه Tagus کے دہانے پر ایک شہر ہے اور پرتگال کا دارالسلطنت ہے - آبادی تقریبًا پندرہ لاکھ ہے - روایات کی بنا پر اس کی تعمیر Ulysses کی طرف منسوب کی جاتی ہے - ابتدا میں اس کا فیسنیقی نام Olisippo تھا - سلطنت روما کے ماتحت اس کا نام Felicitas Julia ہوا اور یہ شہریت کے حقوق رکھنے والا (Municipium) مقام قرار پایا - ۴۰۷ء سے یہ Alans کے ماتحت رہا، ۵۸۵ سے ۷۱۵ء تک visigoths کے زیر عمل تھا اور اس کے بعد مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا.

لِزبن کا نام عربی میں منتقل ہو کر ہمیں دو صورتوں میں نظر آتا ہے لشبونه، اور اُشبونه، حرف تعریف کے ساتھ بھی اور بغیر حرف تعریف بھی (دیکھیے بالخصوص David Lopes : *Os Arabes nas obras de Alexandre Herculano*، لزبن ۱۹۱۱ء، ص ۵۸ تا ۵۹ اور حوالے جو وہاں دیے گئے ہیں) زیادہ عام اسم منسوب اس سے الاُشبونی ہے - اسلامی عہد میں لزبن کوئی بڑا شہر نہ تھا، بایں همه عرب جغرافیہ نویس اس کا اکثر ذکر کرتے ہیں - الادریسی اس کے دمدموں، اس کے قلعے اور اس کے گرم پانی کے چشموں کا ذکر کرتا ہے، جو شہر کے عین وسط میں نکلتے تھے - اس کا بیان ہے کہ یہ شہر قلعۂ المَعْدن (المَدَّہ) کے سامنے تعمیر کیا گیا ہے جسے المعدن اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس کے کنارے پر دریاے تاجه Tagus سونے کی ریت چھوڑ جاتا تھا - وہ مقام لزبن ہی ہے جسے الادریسی اور اس کی تقلید میں بہت سے دیگر مصنفین ایک افسانوی قسمت آزماؤں کا قافله (کامر - محل) روانہ ہونے کی جگہ بتاتے ہیں (بلاشبهه جزائر کنیری canary کی طرف، دیکھیے ۱۹۱، ج ۲: ص ۸۸۰ به ذیل مادّۂ الخالدات).

لزبن بہت پہلے (۷۱۱ء میں) مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور قرطبہ کے اموی خلفا کے ماتحت اقلیم بلاطه کا ایک جزء تھا جیسے کہ شَنْترین Santarem اور شنتره Cintra تھے - عرب وقائع نگار یہاں کی متعدد بغاوتوں کا ذکر کرتے ہیں، جو بہت جلد دبا دی گئیں، مگر اس زمانے میں سب سے بڑی مصیبت جو لِزبن کو اٹھانی پڑی وہ نارمنوں (مجوسیوں) کے ہاتھوں سے تھی - ۲۲۹ھ (= ۸۴۴ء) میں جب انھوں نے الاندلس پر پہلا حمله کیا تو وہ یہیں پہلی مرتبہ جہاز سے اُترے تھے - ابن عِذاری کے بیان کے مطابق ان کا بیڑا ۵۴ جنگی جہازوں اور ۵۴ جہازوں پر جو کمتر درجے کے تھے مشتمل تھا - لِزبن کے والی وهب الله بن حزم نے خلفاے قرطبہ کو خطرے سے آگاہ کیا - پھر ۹۶۶ء تا ۹۷۱ء کے حملوں کے دوران میں الحَکَم ثانی کے عہد حکومت میں نارمن Alcacer do Sal (قصر ابی دانس) پر جہازوں سے اُترے اور لِزبن کے میدانوں میں لوٹ مار شروع کر دی - مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ مجوس اور وہ کتابیں جن کا وہاں حوالہ دیا گیا ہے.

ہسپانیہ میں خلافت بنی امیّہ کے زوال کے بعد لِزبن افطسیون [رک بآں] کی بنا کردہ خود مختار حکومت کا حصّہ بن گیا جس کا صدر مقام Badajoz بطلیوس Batalyows تھا - معلوم ہوتا ہے المرابطون سے تھوڑے عرصے کے لیے اسے

عیسائیوں نے حاصل کرلیا تھا، لیکن ۵۰۴ھ(= ۱۱۱۰ء) میں امیر سیر بن ابی بکر نے اسے پھر واپس لے لیا اور انھیں دنوں میں شنترین Santarem، بطلیوس Badajoz، پرتغال OPorto اور یبورہ Evora بھی فتح کر لیے۔ اس کے تقریباً ۴۰ ہی دن کے بعد ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں پرتگال کے الفانسواول ہنریک Henriques نے اسے آخری مرتبہ فتح کر لیا۔ اس میں اس کے مددگار وہ صلیبی جنگجو تھے، جو Arnold van Aerschot کی سرکردگی میں اس راستے سے فلسطین جا رہے تھے۔

مآخذ: الادریسی: صفة الأندلس، طبع Dozy و de Goeje، متن، ص ۱۸۳، ترجمہ، ص ۲۲۲؛ (۲) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادّۂ اشبونہ اور لشبونہ؛ (۳) ابوالفداء: تقویم البلدان، طبع Renaud و de slane، ص ۱۷۲ تا ۱۷۳؛ (۴) *Extraits inedits relatifs*: E. Fagnan *au Maghreb*، الجزائر ۱۹۲۴ء، اشاریہ؛ (۵) ابن عذاری: البیان المغرب، جلد ۳: طبع Levi Provença، پیرس ۱۹۲۷ء، اشاریہ۔

(E. LEVI-PROVENÇAL)

* لسان الدین: رک بہ ابن الخطیب۔

⊗ لطائف و حقائق: یہ تصوف کی دو اصطلاحات ہیں۔ لطائف لطیفہ کی جمع ہے، لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں نفس میں انبساط پیدا کرنے والا کوئی نکتہ یا لمحہ۔ دستور العلما (مرتبۂ احمد نگری، طبع اول، حیدر آباد دکن، ۳: ۱۷۱) میں ہے کہ لطیفہ معنی دقیق پر مشتمل اشارہ ہوتا ہے، جو فہم میں تو روشن ہو جاتا ہے، مگر عبارت میں ادا نہیں ہو سکتا۔ اب نکتے کی تصریح کرتے ہوئے عبد النبی احمد نگری (کتاب مذکور، ص ۴۱۸) لکھتے ہیں کہ یہ ایک مسئلۂ لطیف ہوتا ہے، جو امعان سے حاصل ہوتا ہے اور نفس پر اس کی تاثیر انبساط اور نشاط کی ہوتی ہے۔ دقیق اور باریک معنی والے اشعار، نغمات اور اصوات حسنہ سے بھی اسی قسم کی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ انھیں الفاظ میں لطیفہ کی تشریح کتاب اللمع فی التصوف (طبع لائیڈن ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۹، ۲۸۷) میں کی گئی ہے اور اسے ایک روحانی کیفیت بتایا گیا ہے۔ لغوی اعتبار سے لطیف کلام وہ ہوتا ہے جس کے کچھ معنی مخفی بھی ہوں اور وہ جب ظاہر ہوں تو انبساط کی کیفیت پیدا ہو اس طرح یہ لفظ لطیفہ کے قریب المعنی ہے۔ لطیفہ کو اشارہ کہا گیا ہے۔ سید محمد ذوقی: سرِ دلبران (طبع اول، ۱۳۷۱ھ، ص ۲۵، ۲۸، ۳۲۸) میں لطیفہ کو اشارۂ دقیق المعنی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ معانی کی جو تصویریں ذہن میں مرتسم ہوتی ہیں ان کی جانب رموز کے ذریعے ہی سے اشارہ کیا جاتا ہے۔ معنی کی ایک روشن تصویر جو مختصر لمحے کے لیے سالک کے دل پر وارد ہوتی ہے، عبارت کے ذریعے اسے بآسانی سمجھا نہیں جا سکتا۔ حقائق اور معارف کی بلندیوں اور جذبات و کیفیات کی لطافتوں کے بھرپور اظہار کی قدرت عبارت میں ممکن نہیں ہوتی۔ کہا گیا ہے کہ لطیفہ کی تاثیر میں نشاط بھی پائی جاتی ہے۔ انبساط کی حد تک تو یہ تاثیر محمود ہوتی ہے، کیونکہ یہ قبول، لطف، رحمت اور انس کی علامت ہے، لیکن جب اس میں افراط پیدا ہو جائے اور نشاط کے مشابہ ہو جائے تو حق تعالٰی کی طرف سے عقوبت کے طور پر قبض کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ (دیکھیے: کشاف اصطلاحات الفنون، طبع بیروت ۱۹۶۶ء، ۱: ۱۲۷)۔ حکما نفس ناطقہ کو لطیفۂ انسانیہ کہتے ہیں مگر درویش دل کو لطیفہ کہتے ہیں۔ کشف اللغات کے حوالے سے کشاف اصطلاحات الفنون ۵: ۱۳۰۰ - ۱۳۰۱ میں بتایا گیا ہے کہ درحقیقت لطیفۂ انسانیہ روح ہے۔

سید محمد ذوقی سرِ دلبران میں لکھتے ہیں کہ فیوض و انوار و برکات الٰہیہ کا نزول جسم انسانی

میں چھے مواضع پر ہوتا ہے جنھیں لطائف ستّہ کہا جاتا ہے ۔ انھیں بھی لطیفہ کی مندرجۂ بالا بحث کی روشنی میں لطائف کہا گیا ہے، کیونکہ سالک ان کے ضمن میں لطیف اور دقیق اشارات و کیفیات سے دوچار ہوتا ہے ۔ مرشد کامل کی توجہ اور سالک کے ذکر کرنے سے یہ تمام ذاکر ہو جاتے ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں: لطیفۂ قلبی :دو انگشت زیر پستان چپ، معرفت کا محل ہے، نور اس کا سرخ ہے ۔ لطیفۂ روحی : دو انگشت زیر پستان راست، محبت کا محل ہے، نور اس کا سپید ہے ۔ لطیفۂ نفس : زیر ناف، نور اس کا زرد ہے ۔ لطیفۂ سرّی : مابین سینہ، مشاہدے کا محل ہے، نور اس کا سبز ہے ۔ لطیفۂ خفی : بالائے ابرو، اسے لطیفۂ قابلیہ بھی کہتے ہیں، یہ روح و جسم کے درمیان مقام اتصال ہے ، نور اس کا نیلگوں ہے ۔ لطیفۂ اخفٰی : ام الدماغ میں، نور اس کا سیاہ ہے، سیاہی چشم کے مثل ۔ اختلافاتِ مکشوفات کے اعتبار سے ان کے انوار میں اختلاف ہے، مگر سلوک میں اس قسم کے اختلافات مؤثر نہیں، اس لیے اہل تحقیق کہتے ہیں کہ مقید بہ انوار نہیں ہونا چاہیے بلکہ ذکر کے ملکۂ دوام کا پیدا کرنا مقصود ہونا چاہیے ۔ حضرات مجدّدیہ کے نزدیک انسان دس لطائف سے مرکب ہے ۔ پانچ عالم امر سے متعلق ہیں اور پانچ عالم خلق سے ۔ عالم امر کے لطائف کی جڑیں عرش کے اوپر بنائی جاتی ہیں اور جسم انسانی میں ان کے مختلف ٹھکانے ہیں، ان کے نام مندرجۂ بالا کے مطابق ہیں، لیکن نفس کو عالم خلق کے لطائف میں شمار کیا گیا ہے ۔ اس عالم کے باقی چار لطائف اربعہ عناصر ہیں جن کی اصل عالم امر کے لطائف کی اصل بتائی جاتی ہے ۔ جملہ لطائف مختلف انوار سے منور اور مختلف اولوالعزم انبیا علیہم الصلوٰۃ و السلام کے زیر قدم ہیں (دیکھیے : محمد ہ۔وقی : سر دلبران، ص ۳۲۶، ۳۲۷).

رسالۂ حالات و مقامات حضرت مظہر جانجاناں [مطبع احمدی ۱۲۶۹ھ، ص ۲۳] میں لکھا ہے کہ لطیفۂ قلب کے حسب اقتضا شوق بیتابی پیدا کرتا ہے، سرّ توحید منکشف ہوتا ہے، مدر و حجر بھی محبوب نظر آتے ہیں اور محویت، فنا و بقا اور وصل و یافت کا حصول ہوتا ہے ۔ جب لطیفۂ قلب کی حدود ختم ہوتی ہیں تو لطیفۂ دماغ سے سروکار شروع ہو جاتا ہے اور آتش شوق افسردہ ہو جاتی ہے، سُکر و مستی اور آہ و نالہ کی مجال نہیں ہوتی ۔ بے مزگی اور بے ذوقی کی کیفیت ہوتی ہے ۔ فنائے نفس اور تہذیب اخلاق حاصل ہوتی ہے اور اپنے سلسلے سے نسبت میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔ نیز جو خطرات پہلے لطیفۂ دماغ سے قلب پر نازل ہوتے تھے، زائل ہو جاتے ہیں ۔ حضرت مجدّد رحمۃ اللہ علیہ تربیت کے دوران میں ہر لطیفہ کو جدا جدا سامنے رکھتے تھے ۔ ان کے بعد لطیفۂ قلب اور لطیفۂ نفس کی تہذیب و تسلیک بحال رہی، اس لیے کہ ان دو کے ضمن میں لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی اور لطیفۂ اخفٰی بھی نور و صفا حاصل کرتے ہیں.

حقائق سے بھی صوفیہ خاص معانی مراد لیتے ہیں ۔ حقائق حقیقت کی جمع ہے ۔ محمد بن عبدالجبار بن الحسن النِّفّری نے اپنی تصانیف (کتاب المواقف، ص ۱۰۹ اور کتاب المخاطبات، ص ۲۰۴، قاہرہ ۱۹۳۴ء) میں حقیقت کو حق تعالٰی کا وصف بتایا ہے ، اس ذات قدوس کو حق الحقیق کہا ہے اور تصریح کی ہے کہ ہر حقیقت اس سے قائم ہے ۔ دستور العلماء (مطبوعۂ حیدرآباد، دکن، ۲ : ۴۳)میں حقیقت کو ایسا امر ثابت بتایا گیا ہے جس کی جڑ وجود میں ہوتی ہے اور اصطلاح میں جس سے مستحق شے کی کنہ مقصود ہوتی ہے ۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ذات حق اپنی کنہ اور حقیقت

کے لحاظ سے نامعلوم و ناقابل علم ہے ۔ سر دلبران (ص ۱۶۵، ۱۶۶، ۳۸۷، ۴۰۲) میں علم حقائق کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ وہ علم ہے جس سے حق تعالٰی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس علم کو دوسرے علوم سے عام و خاص کی نسبت ہے ۔ اس کا موضوع کسی حد معین پر محدود نہیں ہوسکتا، بلکہ تمام علوم کا موضوع اس کا موضوع ہے اور اسی کا نام علم حکمت ہے ۔ وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوتِیَ خَیْراً کَثِیرًا (۲ [البقرہ] : ۲۶۹) ۔ میں اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے ۔ جب مدعی اشیاے موجودہ کو بطریق استدلال بقدر طاقت بشری جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے محدود یا غلط علم کے مطابق اعتقاد و اعمال پر مصر رہتا ہے تو ایسی حکمت صوفیۂ کرام کی نگاہ میں مذموم ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس ارباب تحقیق معلول سے علت کی جانب نہیں جاتے بلکہ اللہ کے رسولوں سے انوار قدس کا اقتباس کرتے ہیں اور ہادیان برحق کی وساطت سے علت کو مجملاً دریافت کر کے تفصیل کے لیے معلول سے سیر شروع کرتے ہیں اور از روے کشف حقائق تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ حقائق کے سلسلے میں بھی سمجھنے کی خاطر صوفیہ کے ہاں کئی اصطلاحات رائج ہیں ۔ حقائق عینیہ : ان سے مراد وہ امور ہیں جو ذات میں موجود ہیں اور عین ذات ہیں نہ کہ غیر ۔ حقائق الٰہیہ وحقائق کونیہ : ان کا تعلق تنزلات ستہ سے ہے ۔ تجلی اول میں جو شئون ذاتیہ مخفی تھے تجلی ثانی میں انھوں نے پہلے حقائق الٰہیہ اور حقائق کونیہ کا امتیاز حاصل کیا ۔ بعد ازاں انسان میں پہنچ کر حقائق الٰہیہ و کونیہ کی جامعیت کو پھر دکھلایا ۔ حقائق الممکنات : ان سے مراد صُور علمیہ اور اعیان ثابتہ ہیں ۔ تنزلات ستہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے : میر ولی الدین : قرآن اور تصوف، دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۱۰۱ - ۱۳۱ [نیز رک بہ مراتب وجود].

مآخذ : (۱) محمد اعلٰی بن علی التھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بیروت، ۱۹۶۶ء، ۱ : ۱۲۷ ؛ ۵ : ۱۳۰۰، ۱۳۰۱ ؛ (۲) ابی نصر عبداللہ بن علی السراج الطوسی: کتاب اللمع فی التصوف، لائیڈن ۱۹۱۴ء، ص ۲۶۹، ۲۸۷ ؛ (۳) عبدالغنی بن عبدالرسول احمد نگری : دستور العلماء، بار اول، حیدرآباد دکن، ۲ : ۳۳ ؛ ۳ : ۱۷۱، ۳۱۸ ؛ (۴) محمد بن عبدالجبار بن الحسن النِّفَّری : کتاب المواقف و کتاب المخاطبات، قاہرہ ۱۹۳۴ء، ص ۵، ۱۵۹، ۲۰۴ ؛ (۵) بدر الدین سرہندی : حضرات القدس، لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۱۱ ؛ (۶) محمد ذوقی، سید : سر دلبران، بار اول، ۱۳۷۱ھ، بمدد اشاریہ ؛ (۷) میر ولی الدین : قرآن اور تصوف، دہلی ۱۹۴۵ء ؛ (۸) ہدایت علی، مولانا : معیار السلوک، ص ۱۳۱ مطبوعۂ دہلی، دیکھیے برائے لطائف ۔ (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

لُطْفُ اللہ مُہَنْدِس : عہد شاہجہانی و عالمگیری کا ایک ماہر حساب دان اور ماہر تعمیرات تھا ۔ درج ذیل اقتباس سے لطف اللہ مہندس کی علمی سرگرمی پر روشنی پڑھتی ہے : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِین ۔ اما بعد ! می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری غفراللہ له و والدیه و احسن الیھا و الیه که کتاب حساب را که تصنیف است از محقق و مدقق شیخ بہاؤ الدین محمد بن حسن عاملی رحمة اللہ تعالٰی علیه و مشتملست بر فوائد لطیفه باشارت خلاصۂ دودمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر محمّد سعید ابن میر محمد یحیٰی ادام اللہ اقبالہٗ و صاحب اجلاله ترجمه کردم چون آن نسخه خلاصه نام داشت این نسخه را منتخب نام نهادم وایں نام تاریخ تالیف این رساله است ۔ مقدمه، منتخب الحساب).

اس سے واضح ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دراصل

۱۰۹۲ھ میں بہاؤ الدین عاملی (م ۱۰۳۰ھ) کے رسالے کی شرح منتخب الحساب کے نام سے لکھی، اس کا باپ احمد معمار باشندۂ لاہور تھا ۔ اسی طرح لطف اللہ مہندس نے ابن سینا کے خواص اعداد پر چار مقالات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جس کے مقدمے میں کہتا ہے :

''الحمدللہ ۔ اما بعد میگوید و فقیر لطف اللہ المتخلّص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری کہ این رسالہ کہ علم ارثما طیقی (Arithmatic) خواص اعداد . . . . . ''

بہاء الدین عاملی نے خلاصۃ الحساب ۱۰۳۰ء میں تصنیف کیا تھا جس کی شرح لطف اللہ مہندس نے ۱۰۹۲ھ میں کی اور اس کا نام منتخب الحساب رکھا .

لطف اللہ مہندس کا نام ایک تاریخی کتبے میں ملتا ہے جو مانڈو کے مقام پر سلطان ہوشنگ شاہ غوری کے مقبرے کے باہر، دروازے سے قریب ایک دھات کے پترے پر معمولی خط میں موجود ہے .

''بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری، فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد، احمد معمار شاہجہانی، ہمراہ جادو رائے، استاد شورام استاد حامد بجہت زیارت آمدہ بود و دو کلمہ یادگار نوشت *Epigraphia-Indo-Muslemica*، ۱۰ - ۱۹۰۹ء، ص ۲۳، ۱۹۱۲ء کلکتہ) .

ان تمام شواہد سے یہ امر یقینی ہو جاتا ہے کہ لطف اللہ مہندس نے بعہد شاہجہان و اورنگ زیب عالمگیر بحیثیت ماہر حساب دان و تعمیر کار (معمار) نام پایا، اس کا باپ احمد معمار بھی (جو لاہور کا باشندہ تھا) بعہد شاہجہانی معماری کے فن میں شہرت رکھتا تھا، جس کا ذکر ہمیں شاہجہانی عہد کی تاریخوں میں بھی ملتا ہے ۔ جب شاہجہان نے دہلی کی عمارات کی بنیاد ۱۰۵۷ھ میں رکھی تھی تو ان کے ضمن میں اس عہد کی تاریخوں میں ۱۰۸۴ء کے واقعات کے تحت احمد معمار کا ذکر آیا ہے، مثلاً محمد صالح کنبوہ : عمل صالح، ج ۳، ص ۲۸، مطبوعۂ کلکتہ ۱۹۳۹ء .

لطف اللہ مہندس شاعر بھی تھا، اس کا دیوان بھی طبع ہو چکا ہے، جس میں وہ اپنے خاندان کا ذکر کرتا ہے ۔ اس دیوان میں احمد کی وفات کی تاریخ اس طرح بتائی ہے .

تاریخ وفات او خِرَد گفت
''محمود العاقبت شد احمد''
= ۱۰۵۹ھ .

سید سلیمان ندوی نے اس کی تائید کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا تعلق لاہور کے ایک مہندس خاندان سے ہے جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا (روداد ادارۂ معارف اسلامیہ، ۱۹۳۳ء، اجلاس لاہور) .

شفیع نگینوی نے اپنی کتاب مرآت واردات (B.M. Add. ۵۵۷۹) میں احمد معمار کے کارنامۂ ''خانۂ آصف'' کا ذکر کیا ہے جو اس نے لاہور میں بنایا تھا، لیکن اب یہاں اس کا نام و نشان موجود نہیں ۔ یہ عمارت آصف خان (م ۱۰۵۳ھ) کے لیے بنی تھی، اسی وجہ سے اسے ''خانۂ آصف'' کہا گیا ہے ۔ قرائن کے مطابق احمد ہی نے تاج محل بنایا تھا، لیکن تعجب کی بات ہے کہ کسی نے بھی احمد کو معمارِ تاج نہیں لکھا، البتہ اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کے مطبوعہ دیوان میں یہ شعر ملتا ہے ــــــــ

کرد بہ حُکمِ شہِ کشور کشا
روضۂ ممتاز محل را بنا

مگر یہ شعر قلمی نسخۂ دیوان مہندس میں موجود نہیں، (کتابخانۂ مولانا عمر یافعی حیدر آباد) احمد نے صوفی عبدالرحمٰن (م ۸۳۷۶ھ) کی کتاب

المجسطی کی شرح لکھی تھی ۔ احمد معمار کا ذکر حسن ابدال کی عمارات کے ضمن میں بھی ملتا ہے جن کا داروغہ محمد مومن تھا ۔ ملا طغرا نے بھی احمد معمار کا ذکر اپنے رسائل میں کیا ہے، دیکھیے عبداللہ چغتائی : "A Family of great Architects" در *Islamic Culture*، اپریل ۱۹۳۷ء.

عطاء اللہ : لطف اللہ نے اپنے دیوان میں اپنے والد احمد معمار کے بعد اپنے بڑے بھائی عطاءاللہ کا ذکر کیا ہے .

اتفاق سے برٹش میوزیم لنڈن میں دو مخطوطے ہیں جو عطاء اللہ رشیدی کی تصانیف ہیں، یہ احمد معمار کا بیٹا تھا اور علم ریاضی میں مہارت رکھتا تھا، پہلے مخطوطے (دیکھیے ریو : Add. 16869) کا مقدمہ یہ ہے :

الجبر مصنفہ عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ اربع و اربعین و الف ہجری مطابق ہشتم سال جلوس صاحب قرانی مہر اورنگ لطف و جہانبانی، کتب جبر و مقابلہ ہندسی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکر اچاریہ مصنف لیلاوتی را کہ در علم حساب کتابی بحقائق را . . . از زبان ہندوی بفارسی آوردم .

دوسرا مخطوطہ خلاصۃ الحساب ہے (ریو : Add. 16744) یہ کتاب نظم میں ہے جسے مصنف نے دارا شکوہ سے معنون کیا ہے .

اس مخطوطے کے بعض اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اورنگ آباد (دکن) میں مقبرۂ رابعۂ دورانی، (ملکۂ اورنگ زیب عالمگیر) کے ابتدائی بڑے دروازے پر پیتل کے پترے پر معمارِ عمارت ہذا کا نام ''عطاء اللہ'' اور ''داروغۂ عمارت ہذا کا نام ہیبت رائے'' لکھا ہے ۔ رابعۂ دورانی کا انتقال ۱۰۶۹ھ میں اورنگ آباد میں ہوا تھا اور بظاہر یہ مقبرہ تاج محل آگرہ کی پیروی میں بنوایا گیا ۔ اس کتبے کا اصل متن جو پیتل کے پترے پر کندہ کر کے جڑ دیا گیا ہے، یہ ہے :

۱ ۔ این دروازہ باہتمام رفعت پناہ ابو القاسم داروغہ تیار شد.

۲ ۔ این روضۂ منورہ در معماری عطاء اللہ بہ عمل ہیبت رائے تیار شد، ۱۰۷۳ھ.

لطف اللہ : دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ لطف اللہ مہندس احمد معمار کا دوسرا بیٹا تھا جس کے علمی کارناموں کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے .

(۱) پشاور کے عجائب گھر میں بارہ پُل کا جو پشاور کے قریب ہی ہے، اصل کتبہ موجود ہے ۔ یہ کتبہ فارسی کے چار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں شاعر مہندس کا نام درج ہے۔ یہ پل بعہدِ شاہجہان ۱۰۳۰ھ میں بنایا گیا تھا ۔ ان اشعار کے آخر میں مندرجۂ ذیل عبارت بھی درج ہے ۔ ''در عہد سلطنت حضرت ظلّ سبحانی صاحبقران ثانی در ایام حکومت نواب لشکر خان باہتمام بندہ رب ودود، داؤد بن قریشی میمنت اتمام یافت''.

(۲) مطلب یہ کہ لشکر خان صوبیدار کے زمانے میں داؤد بن ابو محمد قریشی نے تعمیر کا اہتمام کیا تھا ۔ کوشش کے باوجود عہدِ مغلیہ میں کسی اور شاعر کا تخلص مہندس نہیں ملا ۔ لہٰذا قرین قیاس ہے کہ یہ لطف اللہ مہندس ہی ہو گا ۔ عبداللہ چغتائی :- *Ancient Pakistan BaraBridge Inscri-ption of Shah Jahan* : Vol. II 1955-56 : PP. 13-16.

(۲) سحر حلال مصنفۂ لطف اللہ مہندس ایک فارسی مخطوطہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اس رسالے کا ایک اور نسخہ دفتر دیوانی حیدرآباد دکن میں بھی ہے، مصنف نے یہ رسالہ ۱۰۷۲ھ میں لکھا اور عالمگیر اورنگ زیب کے نام پر معنون کیا ۔

(عبداللہ چغتائی : اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۳۶ء، ص ۷۱ تا ۷۶)۔

(۳) قرآن مجید بخط لطف‌اللہ مہندس : مہندس نے قرآن مجید کی کتابت بڑے اچھے خط میں کی ہے ۔ یہ قلمی نسخہ مولوی محمد شفیع مرحوم کے کتابخانے میں ہے ۔

پروفیسر سی اے سٹوری نے *Persian Literature* میں مہندس کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے ۔ مگر اس نسخۂ قرآن مجید کا ذکر نہیں کیا ۔

(۴) رسالہ در معرفت سمت قبلہ : ایک رسالہ مولوی محمد شفیع مرحوم کے کتابخانے میں ہے ۔ جس کے آخر میں یوں لکھا ہے :

تمام گشت رسالہ، صاحب تصنیف این مراسلہ، لطف‌اللہ ابن احمد معمار غفراللہ ذنبہ، (اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۰۹ء)۔

لطف‌اللہ مہندس کا تیسرا بھائی نوراللہ تھا جو لطف‌اللہ مہندس سے چھوٹا تھا ۔ لطف‌اللہ کے بیان کے مطابق یہ بھی عمارت کے کام سے خوب واقف تھا ۔

نوراللہ ماہر خطاطی بھی تھا اور سات قلموں، یعنی طرزوں میں لکھ سکتا تھا ؎

گنج ہنر آمدہ در مشت او
ہفت قلم راندہ سر انگشت او

دہلی کی جامع مسجد کے ایوان کے باہر طاقوں کے کتبات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا کاتب بھی یہی نور اللہ ابن احمد ہے کیونکہ اختتام پر نور اللہ احمد ہی لکھا ہے، جس سے واضح ہے کہ یہی نور اللہ بن احمد معمار ہے، جو اس مسجد پر اپنے باپ کے ساتھ تعمیری کاموں میں شریک تھا ۔ (رہنمائے دہلی، مصنفۂ جی ۔ ایس ۔ مینول، دہلی ۱۸۷۴ء، ص ۳۶۸) ۔ راقم مقالہ کو ایک تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ اس کا بیٹا ''علیم اللہ'' تھا، جس نے علم حساب کی ایک کتاب کے آخر میں اپنا نام علیم اللہ ابن نور اللہ احمد درج کیا ہے ۔ کتاب نیشنل میوزیم پاکستان کراچی میں محفوظ ہے ۔

امام الدین الریاضی : خاندان احمد معمار کے بعض دیگر افراد مہندس اور شاعر بھی تھے ۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار مصنفۂ کشن چند میں مولانا امام الدین کا ذکر ملتا ہے جس کے متعلق سپرنگر نے اپنی فہرست مخطوطات اودھ، ص ۱۲۲ میں لکھا ہے کہ اسے عام طور پر ''امام الدین الریاضی'' کہا جاتا تھا ۔ وہ متوطن لاہور تھا، لیکن سکونت دہلی میں رکھتا تھا ۔ اس کا والد لطف اللہ مہندس بہت بڑا ریاضی دان تھا اور اس کی کتابیں مدارس میں رائج تھیں ۔ وہ ۱۱۳۶ھ تک زندہ تھا ۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار میں ریاضی کا ذکر چند اشعار میں آیا ہے ۔ جن کا خلاصہ اردو میں حسب ذیل ہے ۔

ریاضی : امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کی رائے کے مطابق قلعۂ شاہجہان آباد کی بنیاد قائم ہوئی تو اس نے شاہجہان آباد میں سکونت اختیار کی ۔ وہ علوم درسی کا ماہر تھا اور علم ریاضی میں ممتاز تھا ۔ اس کا انتقال ۱۱۴۵ھ میں ہوا ۔

تذکرۂ ہمیشہ بہار کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا امام الدین کا ہم عصر تھا ۔ (نذیر احمد : علی گڑھ اردو ادب، مارچ ۱۹۵۵ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۷۳)۔

نذیر احمد کے بیان کے مطابق لکھنؤ یونیورسٹی نے ایک نادر نسخۂ باغستان مصنفۂ امام الدین ریاضی بن لطف اللہ مہندس خریدا ہے جس میں اس کا نام امام الدین حسین درج ہے ۔ نیز یہ روایت بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ۱۰۶۶ھ میں پیدا ہوا تھا، اس کے اساتذہ میں سید حسن نارنولی، حاجی محمد عارف، مولانا شیخ شیر محمد،

میر تقی کابلی اور شیخ محمد جیسے بلند پایہ علما و فضلا تھے ۔ امام الدین نے اپنے باپ سے بھی تحصیل علوم کی، جیسا کہ اس کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے ۔ نذیر احمد کے مطابق اس کی تصانیف کی فہرست یہ ہے :

(۱) شرح تہذیب؛ (۲) شرح ہدایۃ الحکمۃ؛ (۳) حاشیۂ شرح مطالع؛ (۴) حاشیۂ فارسی ہئیت؛ حاشیۂ شرح خلاصۃ الحساب؛ (۵) حاشیۂ اخلاق ناصری؛ (۶) ترجمۂ منظوم کیدانی؛ (۷) حاشیہ بر شرح چغمینی؛ (۸) رسالۂ بیانیہ، رسالۂ تحقیق آیۃ الوضو؛ (۹) رسالۂ بدیعۃ؛ (۱۰) رسالۂ منظوم النجوم بطور مدخل؛ (۱۱) رسالۂ مرآۃ المواقف؛ (۱۲) رسالۂ نسبت مثناۃ مثلث بالتکریر، (۱۳) کتاب الکرہ و المخروط و الا سطوانہ؛ (۱۴) دیوان اشعار؛ (۱۵) انشاء دیگر اور تذکرۂ باغستان .

آخری تصنیف لکھنئو یونیورسٹی میں ہے لیکن یہ اس تذکرے کا محض جزو دوم ہے ۔ جزو دوم کا باغ ششم در ذکر رضوان اللہ علیہم اجمعین مشائخ سلسلۂ چشتیہ نقش بندیہ شطاریہ وغیرہ اور باغ ہفتم در ذکر علما، باغ ہشتم در ذکر ظرفا و ظرافت، باغ نہم در ذکر شعرا، باغ دہم در ذکر حقیقت خواب، باغ یازدہم در ذکر منجمین ہے .

نذیر احمد کے بیان کے مطابق یہ تذکرہ ۱۱۱۶ھ سے قبل تصنیف ہوا، راقم مقالہ کے نزدیک یہ تذکرہ ایک طرح کی بیاض ہے ۔

میرزا خیر اللہ : میرزا خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس کا پورا نام ابو الخیر المخاطب بہ خیر اللہ خان مہندس ہے ۔ اس نے مغل فرمانروا محمد شاہ کے زمانے میں (بہ حیثیت ریاضی دان و منجم) شہرت حاصل کی۔ اس کا ذکر تذکرۂ خوش گو مؤلفہ بندراین داس خوش گو نسخۂ بانکی پور میں ''امام الدین الریاضی'' کے حال میں اس طرح ملتا ہے .

''ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وے در ہیئت و ہندسہ و اکثر علوم یگانہ روزگار است چنانچہ راجہ ادھیراج جےسنگھ سوائی زمیندار آبنیر کہ درین ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ قریب بست لک روپیہ در بست سال صرف این کار نمودہ باستصواب ابوالخیر مذکور است و حق آنست کہ ذات او بر زمانہ منّت است (روداد ادارۂ اسلامیہ اجلاس اوّل، ص ۴۲) .

بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا نام میرزا خیراللہ بھی لکھا ہے، اس سے واضح ہے کہ جے سنگھ والی جے پور کی جنتر منتر (جو جے پور، اجین، دہلی اور بنارس میں موجود ہے) اسی ابوالخیر خیراللہ کی اختراع ہے ۔ بظاہر یہ سب اسی ابوالخیر خیراللہ کا کام ہے ۔ اسی طرح ایک نسخہ ''قانون الوقت'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مجموعۂ احسن مارہروی میں ہے (دیکھیے اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۰) جس کا مصنف ابوالخیر خیر اللہ بن لطف اللہ المشہور مہندس ہے .

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس نے اپنے باپ کی کتاب ''تقریب التحریر'' کو صاف کر کے اس پر دیباچہ لکھا (مضمون : سیّد سلیمان ندوی : ''لاہور کا ایک مہندس خاندان''، در روداد ادارۂ معارف ۱۹۳۳ء، ص ۴۷) ۔ محمد علی بن خیراللہ کا ایک مختصر سا رسالہ عربی میں بصورت مخطوطہ بہ عنوان ''تخریج نصف النہار'' خلیل الرحمٰن داؤدی کے کتابخانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ میرزا محمد علی اپنے زمانے کا ایک مستند کاتب بھی تھا اور خاص کر فرمان لکھتا تھا ۔ اسی نام کا ایک اور کاتب مرزا مولانا محمد علی مہرکن، مرزا محمد علی بن خیر اللہ کے شاگردوں میں بھی تھا، تذکرۂ خوش نویسان از مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی، کلکتہ، ۱۹۱۰ء، ص ۶۵ کے مطالعے سے معلوم ہوتا

ہے کہ وہ شیخ عبدالکریم قادری کے رشتے داروں اور شاگردوں میں سے تھا اور مؤلف تذکرۂ خوش نویساں سے اس کے اچھے تعلقات تھے، وہ عماد الملک کی سرکار میں بچوں کی تعلیم پر مامور تھا۔

مرزا محمد علی کے دو بیٹے زین العابدین اور امیر الدین تھے اور ان ہر دو کا استاد خود مرزا محمد علی ریاضی تھا۔ مطالعۂ باغستان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا امیرالدین دہلی میں ۱۱۰۶ ھ میں پیدا ہوا اور زین العابدین کو خود اس نے پڑھایا تھا اور اس کی علمی زندگی ۱۱۷۹ ھ میں شروع ہوئی تھی۔ ان کا دادا، یعنی مرزا محمد علی بذات خود اپنی تصنیفات میں ۱۱۶۱ ھ تک مصروف رہا تھا۔ ان میں سے امیر الدین کی عمر ۱۱۴۵ ھ میں ۴۳ سال تھی جب اس کا انتقال ہوا (اردو ادب، مارچ ۱۹۵۵ء، ص ۷۰، ۷۱، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نذیر احمد: ''معمار تاج محل کے خاندان کا ایک اہم رکن'')۔

ہم یہاں لطف اللہ مہندس کا پورا شجرۂ نسب پیش کرتے ہیں۔

شجرۂ نسب احمد معمار

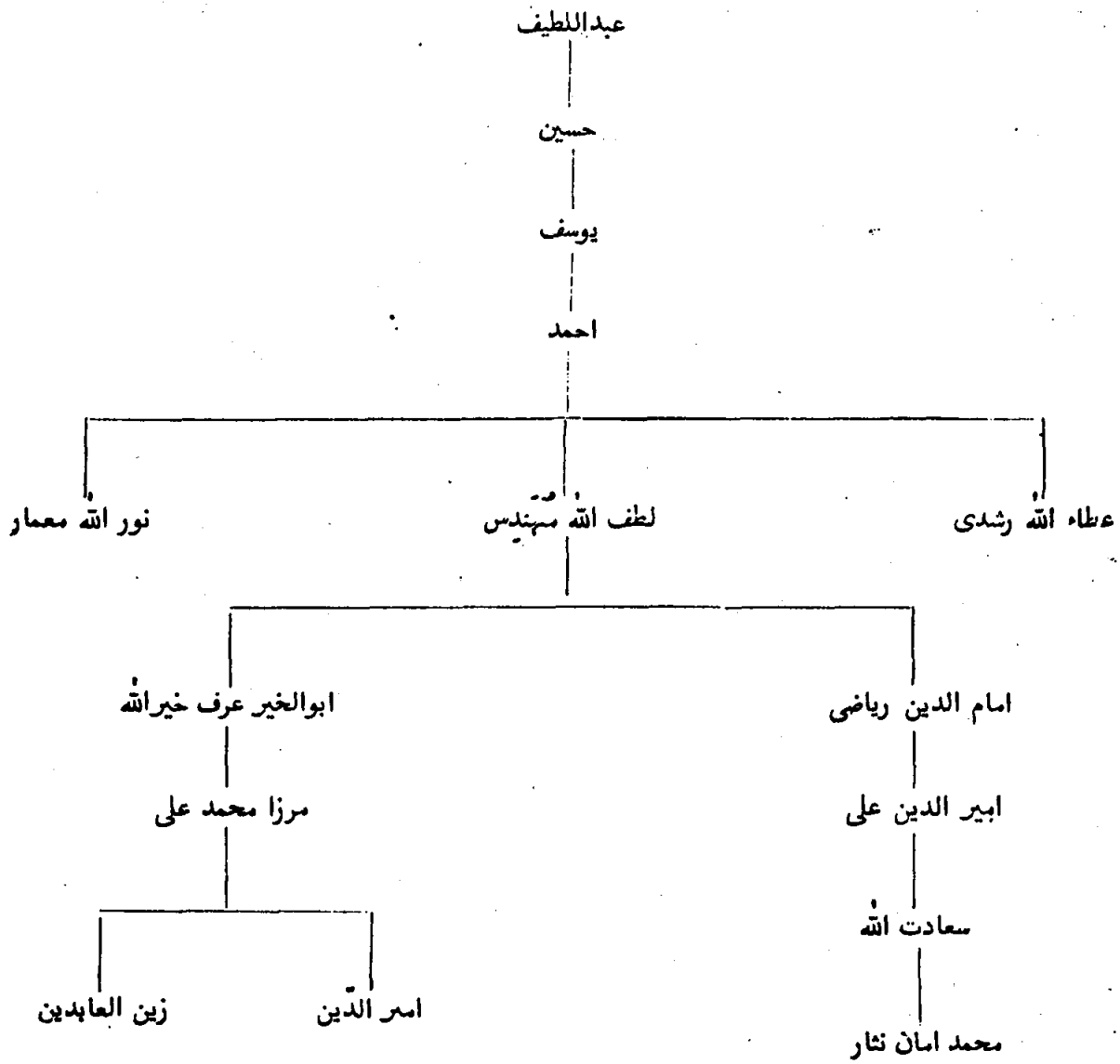

(اس شجرۂ نسب کے لیے دیکھیے محمد عبداللہ چغتائی : کارواں ۱۹۳۴ء، لاہور، ''احمد معمار لاہوری اور اس کا خاندان'').

عہد شاہجہان میں دہلی کی عمارات کی تعمیر میں اس خاندان کے چند دیگر افراد نے بھی حصہ لیا تھا ۔ ان میں اوّل محمد امان اللہ نثار بن سعادت اللہ معمار ہے ۔ جس کا ذکر مجموعۂ نثر (از حکیم ابو القاسم قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم مرتّبۂ پروفیسر محمود شیرانی، مطبوعۂ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۶،) میں بھی ذکر آیا ہے ۔ نیز دیکھیے تذکرۂ گلشن بیخار مطبوعۂ لکھنؤ ۱۹۱۰ء، ص ۲۲۷).

(عبداللہ چغتائی [و تلخیص از اذارہ])

⊗ **لطف علی بیگ آذر** : رک به آذر.

* **لطف علی خان** : ایران کے زند خانوادے کا آخری رکن تھا ۔ اس کا والد جعفر اور دادا کریم خان زند [رک بآں] تھا، ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا ۔ جعفر کو تخت و تاج ۱۷۸۵ء میں ملا ۔ آغا محمد خان قاجار کے ساتھ اس کی جنگ جاری رہی ۔ مؤخرالذکر نے آخر جعفر کو شیراز میں کناره کشی کرنے پر مجبور کر دیا، جہاں اس کی وفات زہر خورانی سے ۲۳ جنوری ۱۷۸۹ء کو ہوئی ۔ لطف علی خان باپ کے مختصر سے عہد حکومت میں لارستان اور کرمان کی مہم پر بھیجا گیا تھا جو اس نے کامیابی سے سر کر لی ، لیکن باپ کی وفات کے بعد وہ اپنے ہی لشکر کے ہاتھوں مجبور ہو گیا کہ کرمان کے عرب رئیس بو شہری کے پاس پناہ حاصل کرنے کے لیے جائے ۔ بو شہری کی مدد سے وہ اپنا دارالسلطنت شیراز حاصل کرنے کے قابل ہو گیا، جہاں ایک شخص سید مراد نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا ۔ لطف علی خان کو بادشاہ بننے میں جو کامیابی ہوئی، وہ اس کے والد کے وزیر حاجی ابراہیم کی کوششوں کی رہینِ منت تھی جو شہر شیراز کا کلانتر (میئر) تھا ۔ اس نوجوان کی شرافت اور سخاوت کی تعریف و توصیف ویسے ہی ہوتی تھی، جیسے اس کی ذاتی شجاعت و بسالت کی ، لیکن تخت نشینی کے بعد سے اس کا کردار یکسر بدل گیا ۔ اس کے ظلم و تشدد کے اعمال دیکھ کر حاجی ابراہیم مذکور نے فیصلہ کیا کہ زند خاندان کے مفاد کو ترک کر کے اس کے دشمن کی تائید کرے ۔ اس نے یہ قدم ۱۷۹۱ء میں اس وقت اٹھایا جب لطف علی خان نے آغا محمد خان کے خلاف چڑھائی کی ۔ حاجی ابراہیم خود شیراز پر قابض ہو گیا اور لطف علی خان کے اپنے لشکر کو اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر اکسایا ۔ لطف علی خان فرار اختیار کر کے ساحل بحر پر پہنچا ۔ مسلح فوجی دستے فراہم کرنے میں اسے کسی قدر کامیابی تو ہوئی جس کے بل بوتے پر اس نے شیراز حاصل کرنے کی کوشش کی ، لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔ اس کے بعد لطف علی خان نے کئی سال تک حیرت انگیز بہادری کے ساتھ قاجاروں کے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھی ۔ اس نے پورے جنوبی ایران کے نشیب و فراز عبور کیے ۔ کچھ عرصے کے لیے طبس کے حکمران نے بھی اس کی مدد کی اور یزد پر عارضی طور سے اس کا قبضہ ہو گیا ۔ ۱۷۹۴ء میں ضلع گرم سیر کے سرداروں کی مدد سے کرمان بھی اس نے مسخر کر لیا ۔ یہاں آغا محمد خان نے لشکر کثیر کے ساتھ اسے محاصرے میں لے لیا ۔ چار ماہ کے معاصرے کے بعد اہل شہر نے ہتیار ڈال دیے ۔ اب کے بھی لطف علی خان بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور بام جا پہنچا، جہاں دھوکے سے اسے آغا محمد خان کے حوالے کر دیا گیا، جو اسے تہران لے گیا ۔ یہاں اسے بصارت سے محروم کر دیا گیا ۔ ہاتھ پاؤں کاٹے گئے بالآخر اسے ہلاک کر دیا گیا ۔ اب قاجاروں کے ہاتھوں کرمان [رک بآں] کے باشندے نہایت

خوفناک انتقام کا نشانہ بنے۔

ایران کے بادشاہوں میں لطف علی خان کی شخصیت (بقول براؤن) ایک جانباز سورما کی تھی۔ غالباً اسے معاصرین کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود محمد خان کہلم کھلا اس کی شجاعت کا اعتراف کرتا تھا، لیکن اس کی تاریخ میں جو بعد میں ایران کے قاجاری عہد میں لکھی گئی، ایرانی مآخذ اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار نہ کر سکے۔ یورپی مآخذ نے اس زمانے کی رفتار حالات کی زیادہ صحیح تصویر پیش کی ہے۔ ایران کے جدید ترین مؤرخین، مثلاً علی خان (دورۂ مختصر تاریخ ایران، لتھو، مطبوعۂ تہران ۱۳۲۶، جسے Beck نے *Neupersische Konuersations-Grammatik*، ہیڈل برگ ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۹ تا ۳۵۶ میں بطور اقتباس نقل کیا ہے) حاجی ابراہیم کے کردار کو غدارانہ قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ حاجی ابراہیم نے جو فوراً بعد وزیر مملکت کے منصب پر فائز ہوا، سرجان میلکم کے روبرو اپنے کردار کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

مآخذ: (۱) تاریخ زندیہ، طبع Beer، لائیڈن ۱۸۸۸ء؛ (۲) J. Malcolm: *The History of Persia*، بار دوم، لنڈن ۱۸۲۹ء، ۲ : ۱۰۲ ببعد؛ (۳) H. J. Brydges: *The Dynasty of the Kajars*، لنڈن ۱۸۳۳ء، ص دیباچہ ۱۲۰ ببعد؛ متن تاریخ مآثر سلطانیہ (مؤلفۂ عبدالرزاق بن نجف قلی) پر مشتمل ہے؛ (۴) E. G. Browne: *A History of Persian Literature in Modern Times*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ص ۱۴۳ ببعد۔

(J. H. KRAMERS)

لطفی پاشا: پورا نام حاجی لطفی پاشا بن عبدالمعین، ترکی کے ایک اہم مدبر، عالم اور مؤرخ۔ سلطان سلیمان اول القانونی کے عہد میں صدر اعظم تھے۔ البانوی نسل کے تھے۔ تاریخ پیدائش اور مقام [illegible]ت دونوں نا معلوم ہیں۔ پرورش شاہی محل میں ہوئی، جہاں وہ ظاہراً ینی چری [جاں نثار فوج کے سپاہی] کی جمع آوری کے سلسلے میں پہنچے۔ اپنی لکھی ہوئی تاریخ اور آصف نامہ میں انھوں نے اپنے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے، اس سے ان کے حالات زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ محل میں رہتے ہوے بھی انھوں نے اپنے آپ کو دینی علوم کی تحصیل کے لیے وقف رکھا اور ان کے لیے ذوق و شوق ان کے دل میں عمر بھر موجود رہا۔

سلطان سلیم (۱۵۱۲ — ۱۵۲۰ء) کے تخت نشین ہونے پر وہ عام خدمتگاروں کی صف سے نکل کر چوقہ دار (آقا کے گھوڑے کے ساتھ چلنے والے وردی پوش خدمتگار) بن گئے اور پھر وہ رفتہ رفتہ دربار میں ان عہدوں پر کام کرتے رہے: چاشنی گیر (مزہ چش)، قپوجی باشی، میر علم (شاہی جھنڈا اٹھانے والا)۔ اس کے بعد وہ قسطمونی کا سنجق بیگ، قرمان اور اس کے بعد آناطولی کا بیگلر بیگ اور ۹۴۱/۱۵۳۴ء میں قبہ وزیری (کونسل آف سٹیٹ کا ممبر وزیر) بنے۔ صدی کا ایک چوتھائی حصہ انھوں نے سلطان کی وزارت خارجہ میں گزارا۔ اپنے بیان کے مطابق سلطان سلیم کے دور حکومت میں جو ان پر بڑا مہربان تھا، وہ تمام جنگوں اور لڑائیوں میں شامل رہے۔ خواہ وہ معرکے روم ایلی اور آناطولی میں ہوے یا عرب، شام اور مصر میں۔ اسی طرح سلیمان کے دور حکومت میں انھوں نے بلگریڈ جزائر روڈس، ہنگری، وی انا، قزلباش، بغداد، کورفو وغیرہ کے خلاف مہموں میں حصہ لیا۔ ۹۴۵/۱۵۳۸ء میں انھوں نے قرابوغدان پر وزیر دوم کی حیثیت سے مہم میں حصہ لیا۔ ۹۴۶/۱۵۳۹ء میں صدر اعظم ایاز پاشا کے جانشین بنے، جو طاعون سے فوت ہوا۔ وہ بھی البانیہ کا رہنے والا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عثمانی سلطنت اپنی طاقت کا پورا پورا اظہار عملاً کر رہی تھی - (کاتب چلبی کی تقویم التواریخ، مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۱۴۶ھ، ص ۱۷۶ پر یہ سال ۹۴۴ھ بتایا گیا ہے جو غلط ہے - بعد کے تمام مؤرخین نے اسے اختیار کیا ہے اور اس طرح ہم تک بھی پہنچا ہے - لطفی پاشا کے اپنے بیان اور واقعات کے تجزیے سے یہ غلط ثابت ہوتا ہے - انھوں نے اپنی قابلیت کا سکّہ اعلیٰ فوجی عہدوں پر، بحریہ میں اور انتظامی مناصب پر فائز ہو کر جمایا.

اندرونی نظم و نسق میں وہ ان اصلاحات کو بڑی جرأت اور مضبوطی کے ساتھ عمل میں لانا چاہتے تھے جنھیں وہ عرصۂ دراز سے ضروری سمجھ رہے تھے- یہ خاص طور پر مالی نظام میں کفایت، ظالمانہ قوانین کی منسوخی (الاق، ہر کاروں کے حقوق)، بحریہ کی ترقی اور اس کے استقلال (ترکی کے لیے جس کی اہمیت انھوں نے دوربینی سے کام لے کر محسوس کی تھی) سے متعلق تھیں - سیاسی نظام جو بظاہر جاہ و جلال رکھتا تھا، اس کی بابت انھوں نے سب سے پہلے بھانپ لیا کہ اس کی تباہی کا آغاز ہو چکا ہے - ساتھ ساتھ انھوں نے وینس، آسٹریا اور فرانس سے بڑی مہارت اور مضبوطی کے ساتھ گفت و شنید جاری رکھی - یہ امر قابل ذکر ہے کہ معمار سنان کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف سب سے پہلے انھوں نے کیا تھا، جسے انھوں نے شاہی معمار مقرر کر دیا - وہ ایک اعلیٰ درجے کے ذہین مدبّر، سرگرم اور فولادی عزم والی شخصیت کے مالک، انتہا درجے کے دیانتدار، ہر قسم کی سازش سے بالا تر اور بلند مقاصد سے سرشار انسان تھے - مذہبی اور سائنسی علوم میں مہارت رکھتے تھے - تند و تیز مزاج رکھنے کے باوجود انھیں نیک فطرت وزیر شمار کیا جاتا تھا.

وہ سلطان سلیمان کے بہنوئی تھے جس کی بہن شاہ سلطان سے انھوں نے شادی کی تھی - تاہم انھیں ۹۴۱ھ / ۱۵۴۱ء میں بڑی عجلت سے موقوف کر دیا گیا جب غصے میں آ کر انھوں نے اپنی بیوی کو دھمکیاں دی تھیں جس نے ایک مسلمان کنیز سے نامناسب سلوک کرنے پر انھیں سرزنش کی تھی - اصلاح کے لیے ان کے شوق کے باعث دربار سلطانی میں بالکل قلیل تعداد میں دوست بن سکے - کہا جاتا ہے کہ محض داماد کے طور پر اپنے مقام کی وجہ سے وہ تختۂ دار پر نہ لٹکائے گئے.

لطفی پاشا کو پنشن دے کر دموتیقہ بھیج دیا گیا جہاں ان کی چفتلک (زرعی جائداد) تھی - وہاں وہ مکمل طور پر مطالعۂ علوم میں منہمک ہو گئے - سیاسی زندگی کے دوران میں علمائے دین اور فضلائے عصر سے مستقل طور پر روابط رکھنے کے باعث اس کام کے وہ اچھی طرح اہل تھے - مکۂ معظمہ سے دموتیقہ واپسی کے بعد ان کے اور سلطان کے درمیان مکمل مصالحت کو روکنے میں ان کا جانشین رستم پاشا کامیاب رہا - اس لیے انھوں نے جبری فراغت کا زمانہ عربی اور ترکی زبانوں میں متعدد تصنیفات کی تسوید میں صرف کیا - منجّم باشی کی طرح دموتیقہ ہی میں اغلباً ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ میں، لیکن بہر صورت ۹۶۱ھ کے بعد، انھوں نے وفات پائی - اس ضمن میں ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء کا جو سال عام طور پر دیا جاتا ہے، ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی تاریخ ۱۰ رمضان المبارک ۹۶۱ھ / ۱۴ اگست ۱۵۵۴ء تک جاری رکھی اور اس بات کے باور کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بعد کوئی اور شخص تاریخ کی یہ کتاب لکھتا رہا - اس کے برعکس متن میں ۹۶۱ھ کے واقعات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں - قسطنطنیہ میں ایک چشمے کی صورت میں انھوں نے صرف ایک بنیاد چھوڑی جس کی وجہ سے محلہ اور مسجد لطفی پاشا کا نام پڑا - اس کا بنانے والا ایک دفتر دار احمد چلبی تھا.

لطفی پاشا اکیس کتابوں کے مصنف ہیں، جن کی فہرست انھوں نے اپنی تاریخ میں صفحہ ۱ تا ۴ میں دی ہے (فہرست کے لیے نیز دیکھیے (۱) Hammer-Purgstall: *Geschichte des Osman Reiches*، بار اوّل، ۳ : ۷۰۳؛ (۲) Flügel: *Katalog der Wiener Handschr.*، ۲ : ۲۲۴؛ (۳) Tschudi: *Turkische Bibliothek*، ۱۲ : xv تا xvii) ۔ اس فہرست میں عربی کی ۱۳ اور ترکی زبان کی ۸ کتابیں شامل ہیں ۔ ان میں شاید قانون نامہ کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، جو ان سے منسوب ہے، لیکن وہ شاید اسے اپنی تصنیف ظاہر نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کے سرکاری فرائض کے نتیجے کے طور پر مکمل ہوئی۔

ان کی دینی تصنیفات ہم تک نہیں پہنچیں ۔ بعض بیانات کے مطابق جو خصوصی طور پر ان کے حق میں نہیں، وہ دینی علوم کی مختلف شاخوں اور طب میں اوسط درجے کی قابلیت رکھتے تھے، مگر انھیں شوق تھا کہ وہ اتائیوں کی مانند اپنی اہلیت کی بابت مبالغہ آمیز رائے کا اظہار کریں، لیکن یہ بات پوری طرح قابل اعتماد نہیں، کیونکہ نہ صرف ان کی بالکل معمولی درجے کی دینی کتب بلکہ ان کی فی الواقع تاریخ سے متعلق اہم تصنیفات بھی آصف نامہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے، التفات سے محروم رہی ہیں۔

شاعر کے طور پر ان کی تعریف سیہی بے نے کی ہے جس نے اپنی ہشت بہشت ۹۴۵ھ میں ان کی صدارت عظمیٰ کے ایّام میں مکمّل کی، لیکن ان کی تاریخ میں جو اشعار جا بجا ملتے ہیں، ان کے اپنے نہیں۔ علاوہ بریں شعرا کے وہ اتنے زیادہ قدردان بھی نہیں تھے ۔ یہ بات اس حقارت آمیز رویّے سے معلوم ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے ہمایوں نامہ کے مصنف علی چلبی کے متعلق کیا ۔ اسے وہ طعنہ دیتے ہیں کہ اس نے مسائل شعر پر بحث کرنے کے بجائے بیس سال اس کتاب پر صرف کر دیے ۔

تاہم ایک مؤرخ کی حیثیت سے ان کی تعریف میں ایک حد سے زیادہ مبالغہ نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی تصنیف آصف نامہ جو حکومت کے مختاروں کے لیے آئینۂ ہدایت ہے، وزرائے سلطنت کے لیے نصاب اخلاق کا کام دیتی ہے اور جس میں انھوں نے اپنے جانشینوں کے لیے اپنے وسیع انتظامی تجربے کو کھول کر بیان کر دیا ہے، خاصی کامیاب رہی ۔ یہ بات ان کثیر مخطوطوں سے ظاہر ہوتی ہے جو اس کتاب میں موجود ہیں (توثیب و ترجمہ از R. Tschudi، برلن ۱۹۱۰ء؛ ترثیب و تدوین علی امیری، قسطنطنیہ ۱۳۲۶ھ)، لیکن ان کی تواریخ آل عثمان بہت زیادہ اہم ہے ۔ اس کے باوجود اب کہیں یہ معمولی قسم کی اشاعت کی صورت میں دستیاب ہوئی ہے (لطفی پاشا: تاریخ ترکیہ جمہوریتی معارف وکالتی نشریاتندن، عدد ۲۸، قسطنطنیہ ۱۳۴۱ھ) ۔ اس اشاعت کا دارو مدار اس نامکمل نسخے پر ہے جو ایم طاہر کو بروسہ میں ملا اور جس کا تکملہ علی کے سابقہ واحد نسخۂ وی‌انا سے تیار ہوا ہے جسے فان ہیمر نے بھی استعمال کیا تھا (فلوگل، ۲ : ۲۲۴، عدد ۱۰۰۱)۔

لطفی پاشا نہ صرف یہ کہ اپنے عنوان کے لیے پرانی عثمانی تواریخ کو نمونہ قرار دیتے ہیں، بلکہ اپنے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے بھی فن تاریخ نویسی کی اس قدیمی طرز کو اختیار کرتے ہیں جو فارسی کے پر تکلف درباری اسلوب سے نمایاں طور پر مختلف ہے ۔ سلطان بایزید کے عہد تک وہ صرف نقل نویس ہی رہتے ہیں، لیکن اس کے بعد ان واقعات کا بیان شروع ہو جاتا ہے جن کا وہ تین سلاطین (بایزید، سلیم اور سلیمان) کے زمانے میں عینی شاہد تھے ۔ اس طرح ان کی تاریخ ایک عجیب اور نادر

تصنیف بن جاتی ہے ۔ انھوں نے سلطان سلیمان کے عہد کا جو بیان درج کیا ہے، وہ عام طور پر انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے، خاص طور اس لیے کہ یہ ان کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ تھا ۔ شاہ نامہ جی اور شاہی وقائع نو ویسلر کے برخلاف وہ حالات کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جسے کوئی چھو بھی نہیں سکا، اگرچہ یہ درست ہے کہ باقی مدبرین کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو جانبداری سے مکمل طور پر بچا نہیں سکے ۔ سولھویں صدی عیسوی میں ترکی سلطنت کے اندر کمزوری اور فساد پذیری کے آغاز کے متعلق ہماری معلومات کے سلسلے میں اس کی دونوں تصنیفات اہم تاریخی مآخذ کا کام دیتی ہیں ۔

مآخذ: مذکورۂ بالا کتاب کے علاوہ (۱) سہی: ہشت بہشت، قسطنطنیہ ۱۳۲۵ھ، ص ۲۵؛ (۲) منجم باشی: صحائف الاخبار، قسطنطنیہ ۱۲۸۵ھ، ۳ : ۵۱۸؛ (۳) قراچلبی زادے: روضۃ الابرار، قسطنطنیہ ۱۲۴۸ھ، ص ۴۲۷؛ (۴) ایم شامی: علاولی اثمار التواریخ مع ذیل، قسطنطنیہ ۱۲۹۵ھ، ص ۹۲؛ (۵) عبداللہ خلوصی: دوحۃ الملوک، قسطنطنیہ ۱۲۶۷ھ، ص ۲۰؛ (۶) حافظ حسین: حدیقۃ الجوامع، قسطنطنیہ ۱۲۶۱ھ، ۱ : ۱۹۰، ۲۵۶؛ (۷) ساعی: تذکرۃ البنیان، قسطنطنیہ ۱۳۱۵ھ، ص ۲۴ تا ۲۵؛ (۸) احمد تائب: حدیقۃ الوزراء، قسطنطنیہ ۱۲۷۱ھ، ص ۲۷؛ (۹) عطا: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۹۳ھ، ۲ : ۱۹؛ (۱۰) پیچوی: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۳ھ، ۱: ۲۱؛ (۱۱) بروسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، قسطنطنیہ ۱۳۴۳ھ، ۳ : ۱۳۲ تا ۱۳۴؛ (۱۲) سامی: قاموس الاعلام؛ (۱۳) ثریا: سجل عثمانی؛ (۱۴) قلسلی معلم رفعت: لطفی پاشا کی تاریخ کے ابتدائیہ میں؛ ان کے علاوہ خاص طور پر (۱۵) گوپرولو زادہ فؤاد: لطفی پاشا در ترکیات، قسطنطنیہ ۱۳۲۵ھ، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۵۰؛ (۱۶) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، طبع فلوگل؛ (۱۷) مخطوطوں کی مختلف فہارس؛ (۱۸) Hammer-Purgstall: *Geschichte des osman Reiches*؛ (۱۹) وہی مصنف: *Gesch-der Osman Dichtkunst*؛ (۲۰) وہی مصنف: *Staatsverfassung*، ۱ : ۳۵۸ - ۳۶۰؛ (۲۱) Mouradgea d'Ohsson: *Tableau général de l'Empire Othoman*، پیرس ۱۷۹۱ء، ۴ : ۳۵۱؛ (۲۲) Wickerhauser: *Chrestomathie*، وی انا ۱۸۵۳ء، ص ۲۸۳ و ۳۰۹؛ (۲۳) Gibb: *History of Ottoman Poet*.

(TH. MENZEL)

لُطفی مَنفلُوطی: رک بہ مصطفی لطفی المنفلوطی.

اللَّطِیف (ع): اللہ تعالیٰ کے [رک بآں] ناموں میں سے ایک نام ۔ [رک بہ الاسماء الحسنیٰ].

لَطیفی: اصل نام عبد اللطیف چلپی قسطمونی، وہ محکمۂ اوقاف (امارت کیاتیبی) اور بلغراد میں کاتب رہے ۔ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں قسطنطنیہ میں ایوب کے دفتر وقف میں آئے اور بعد ازاں رودس (Rhodes) اور مصر گئے ۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں مصر سے بحر قلزم کے ساحلی مقام ینبوع کی طرف بحری سفر کے اثنا میں وفات پائی ۔

لطیفی ایک اچھے شاعر تھے اور بہتر صاحب طرز انشا پرداز ۔ وہ اپنے تذکرۂ شعرا کی بدولت مشہور ہیں جو انھوں نے ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں ختم کیا تھا اور جس کو انھوں نے سہی کی تقلید میں سب سے پہلے سلطان سلیمان اعظم کے نام معنون کیا تھا ۔ اپنے مولد سے محبت کی بنا پر انھوں نے ایسے بہت سے شاعروں کو بھی اپنے شہر (قسطمونی) سے منسوب کر دیا، جو وہاں پیدا نہ ہوئے تھے، اس وجہ سے ان کی تصنیف طنزاً قسطمونی نامہ

کہلاتی تھی ۔ یہ کتاب جو ۱۳۱۴ھ میں قسطنطنیہ میں چھپی تھی اپنی اغلاط کے باوجود پرانے شاعروں کے سلسلے میں ہماری معلومات کا ایک ناگزیر مأخذ ہے ۔ اس میں سلطان مراد خان کے عہد سے مصنف کے اپنے زمانے تک کے ۳۰۲ شاعروں کے تذکرے درج ہیں ۔ لطیفی کی تنقیدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن شاعری کی ماہیت کو خوب سمجھتے تھے مگر جو معیار انھوں نے اپنے تذکرے میں شعرا کو شامل کرنے کے سلسلے میں اختیار کیا ہے ، کچھ زیادہ اونچا نہیں ۔ انھوں نے اس کتاب کا تتمہ شائع نہیں کیا حالانکہ وہ اپنے زیر بحث تذکرے کی تکمیل کے بعد چالیس برس سے زیادہ زندہ رہے ۔ ان کی دیگر تصنیفات یہ ہیں :

(۱) ایک مناظرہ جسے ۱۲۸۷ھ میں توفیق بے نے طبع کیا؛ (۲) ایک باقاعدہ دیوان؛ (۳) مجموعۂ صد احادیث مع شرح منظوم ترکی جسے غلط طور پر کمال پاشا زادہ سے منسوب کیا جاتا ہے؛ (۴) رسالہ اوصاف استانبول؛ (۵) نثر الآلی؛ (۶) ربیع الازہار؛ (۷) انیس الفصحاء؛ (۸) فصول اربعہ؛ (۹) تذکرۂ شعرا کا ترجمہ Thomas Chabert نے Zurich میں ۱۸۰۰ء میں تیار کیا تھا جس کا عنوان ہے *Latifi oder Biographische Nachrichten von vorzüglichen türkischen Dichtern nebst einer Blumenlese aus ihren Werken*.

مآخذ : (۱) سہی : هشت بهشت، قسطنطنیہ ۱۳۲۵ء، ص ۱۳۸؛ (۲) ثریا : سجل عثمانی؛ (۳) سامی : قاموس الاعلام؛ (۴) بروسلی م - طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۳ - ۱۳۵ - ۱۳۴؛ (۵) Hammer-Purgstall : *Geschichte der Osmanischen Dichtkunst*، ۳ : ۲۸۶ اور (۶) مصنف مذکور : *Geschichte des Osmanischen Reiches*؛ (۷) Smirnow : *Očerk istorii tureckoj literatury*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۱ء (Kors iv)، ص ۳۵۶؛ (۸) Basmadjian : *Essai Sur l'histoire*، قسطنطنیہ ۱۹۱۰ء، ص ۵۰؛ (۹) قلمی نسخوں کے مختلف مجموعوں کی فہرستیں۔

(TH. MENZEL)

لعازر : رک بہ لازار۔

لِعان : ''لعان'' اور ''ملاعنہ'' عربی زبان کے مصدر ہیں اور ان کے معنی ہیں باہم ایک دوسرے پر لعنت کرنا'' (الزبیدی : تاج العروس، بذیل مادّہ)، لیکن اسلامی فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک عدالتی عمل ہے جس کے ذریعے شوہر اور بیوی بعض مخصوص حالات میں ایک دوسرے کے خلاف قسمیں کھا کر رشتۂ نکاح کو ختم کر دیتے ہیں ۔ اس عمل میں چونکہ ہر فریق یہ قسم کھاتا ہے کہ ''اگر میں نے جھوٹ بولا ہو تو مجھ پر لعنت ہو''، اس لیے اس عمل کو ''لعان'' کہتے ہیں۔ ''لعان'' کرنے والے شوہر کو ''ملاعِن'' اور بیوی کو ''ملاعنہ'' کہا جاتا ہے ۔

اسلامی فقہ میں ''لعان'' کی اصطلاحی تعریف یہ ہے ''ھی شھادات مؤکدات بالایمان مقرونۃ باللعن قائمۃ مقام حد القذف فی حقہ و مقام حد الزنا فی حقھا (النسفی : کنز الدقائق، بہامش؛ البحرالرائق، ۴ : ۱۱۲، دارالکتب العربیۃ الکبری، مصر)، یعنی : ''لعان ایسی شہادتوں کے مجموعے کا نام ہے جن کو ایسی قسموں کے ذریعے مؤکد کر دیا گیا ہو جن میں لعنت کے الفاظ بھی شامل ہوں اور یہ شہادتیں شوہر کے حق میں حد قذف کے اور بیوی کے حق میں حد زنا کے قائم مقام ہو جائیں''

اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ اسلام میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر زنا کا الزام لگائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ زنا کے کم از کم چار عینی گواہ پیش کرے۔ اگر اس نے چار عینی گواہ پیش کر دیے اور ان کی گواہی شرعی شرائط کے

مطابق عدالت میں قبول کر لی گئی تو ملزم پر ''زنا'' کی حد یعنی سزا جاری ہو گی اور اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکا تو خود الزام عائد کرنے والے پر ''حد قذف'' یعنی تہمت لگانے کی سزا عائد ہو گی۔ اس حکم کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو شخص چار گواہ پیش نہ کر سکتا ہو، وہ کسی پر زنا کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔ عام حالات میں تو چونکہ بدکاری پر پردہ ڈالنے کو پسند کیا گیا ہے، اس لیے اس حکم میں کوئی دشواری نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو اپنی آنکھ سے بدکاری میں ملوث دیکھتا ہے اور اس کے لیے چار گواہ مہیا کرنا بھی مشکل ہے، اس صورت حال کو خاموشی سے برداشت کرنا بھی دشوار ہے، اوز اگر وہ چار گواہ لائے بغیر الزام لگاتا ہے تو اس پر ''حد قذف'' یعنی تہمت کی سزا عائد ہونے کا اندیشہ ہے۔

ایسے حالات میں شوہر کی مشکل کو ''لعان'' کے حکم کے ذریعے حل کیا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں وہ اس معاملے کو حد قذف سے بے خوف ہو کر قاضی کے پاس لے جا سکتا ہے۔ قاضی ایسی صورت میں شوہر اور بیوی دونوں کو جمع کرے گا اور ان سے اس مخصوص طریقے پر جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، قسمیں کھلوائے گا جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان نکاح کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ بیوی زنا کی حد سے محفوظ رہے گی اور شوہر قذف (تہمت لگانے) کی حد سے محفوظ رہے گا، اور اولاد کا نسب ماں سے ہوگا، باپ سے نہیں۔

قرآن مجید میں لعان کا تذکرہ مندرجۂ ذیل آیات میں آیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۲۴ [النور]: ۶ تا ۱۰)، یعنی اور جو لوگ اپنی بیویوں پر (زنا کا) الزام عائد کریں، اور ان کے پاس اپنے سوا اور گواہ نہ ہوں تو ان کی شہادت یہی ہے کہ وہ (مرد) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ بیشک میں سچا ہوں، اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اس عورت سے (زنا کی) سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ مرد سچا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالٰی کا فضل اور اس کا کرم ہے اور یہ کہ اللہ تعالٰی توبہ قبول کرنے والا بڑا حکمت والا ہے (تو تم بڑی مصیبتوں میں پڑ جاتے)''۔

آیات لعان کا زمانۂ نزول صراحۃً کسی حدیث میں نہیں ملتا، البتہ صحیح بخاری میں حضرت سہلؓ بن سعدؓ کی روایت ہے کہ شهدت المتلاعنين و انا ابن خمس عشرة سنه (البخاری: الصحیح، کتاب الحدود، باب من اظہر الفاحشة الخ، ۲: ۱۰۱۳، مطبوعۂ کراچی)، یعنی: ''میں نے لعان کرنے والے زوجین کو لعان کرتے ہوئے پندرہ سال کی عمر میں دیکھا تھا اور بخاری کے ابوالیمان والے نسخے میں حضرت سہل بن سعدؓ ہی سے مروی ہے کہ ''جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وفات ہوئی تو میں پندرہ سال کا تھا'' (ابن حجر: فتح الباری، باب اللعان و من طلق بعد اللعان، ۹: ۳۹۳، مطبوعۂ بیروت)۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لعان کے واقعات جو

مذکورۂ بالا آیات کا سبب نزول ہیں، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیات طیبہ کے آخری سال پیش آئے تھے۔ دوسری طرف الطبریؒ، ابن حاتمؒ اور ابن حبان کا کہنا یہ ہے کہ آیات لعان شعبان ۹ھ میں نازل ہوئیں (حوالۂ مذکور) اور سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے مروی ہے کہ لعان کا قصّہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی غزوۂ تبوک سے واپسی پر پیش آیا۔ اس روایت کا حاصل بھی قریب قریب وہی ہے جو الطبریؒ وغیرہ کے اقوال کا ہے، لیکن اس روایت کا مدار چونکہ الواقدی پر ہے، اس لیے حافظ ابن حجر نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور کچھ دوسرے شواہد بھی اس روایت کی تردید کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ آیت لعان کا سبب نزول، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، ہلالؓ بن امیہ اور ان کی اہلیہ کا واقعہ ہے اور ہلالؓ بن امیہ ان تین صحابہ میں سے ایک ہیں جو غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی وجہ سے ایک مدت تک معتوب رہے؛ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ لعان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''و ھو احد الثّلاثۃ الّذین تاب اللہ علیہم'' (ابو داؤد: السنن، ۱: ۳۰۷، مطبوعۂ کراچی) جس سے صاف واضح ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بہت بعد کا ہے جبکہ پیچھے رہنے والے صحابہ کی توبہ قبول ہو چکی تھی۔ ان تمام روایات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آیات لعان شعبان ۱۰ھ میں نازل ہوئیں، اور ربیع الاوّل ۱۱ھ میں آپ کی وفات ہو گئی (ابن حجر: فتح الباری، ۹: ۳۹۴)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم کے عہد مبارک میں لعان کے دو واقعات پیش آئے: ایک ہلالؓ بن امیہ کا واقعہ ہے اور دوسرا عُویمر العجلانیؓ کا۔

ہلالؓ بن امیّہ کا واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو شریک بن سحماء کے ساتھ متہم کیا، آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم نے فرمایا کہ یا تو گواہ پیش کرو، ورنہ تم پر قذف (تہمت طرازی) کی حد لگے گی۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لے تو کیا وہ انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر گواہ تلاش کرنے چلا جائے؟ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم نے دوبارہ وہی بات ارشاد فرمائی کہ یا گواہ پیش کرو، ورنہ تم پر حد لگے گی۔ اس پر حضرت ہلالؓ بن امیہ نے عرض کیا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میں یقیناً سچا ہوں، اس لیے اللہ تعالٰی ضرور کوئی ایسا حکم نازل فرمائیں گے جو میری پشت کو حد سے بری کر دے؛ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لے آئے، اور آپ (صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم) پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ ... الآیۃ (البخاری: الصحیح، کتاب التفسیر، ۲: ۶۹۵)۔

حضرت عویمر العجلانیؓ کا واقعہ حضرت سہل بن سعدؓ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ حضرت عویمرؓ ایک روز عاصمؓ بن عدی انصاری کے پاس آئے، اور ان سے کہا کہ عاصم اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ مبتلا دیکھے تو اگر وہ اسے قتل کر دے تو اسے (قصاصاً) قتل کر ڈالا جائے گا، لہٰذا وہ کیا کرے؟ ذرا یہ بات رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے پوچھ کر مجھے بتائیے؛ چنانچہ حضرت عاصمؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے اس بارے میں پوچھا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اس قسم کے

سوالات کو ناپسند فرمایا، اور حضرت عاصمؓ پر یہ بات شاق گزری کہ دوسرے شخص کے سوال کی بنا پر انھیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ناراضی کا نشانہ بننا پڑا ۔ پھر جب حضرت عاصمؓ گھر پہنچے تو حضرت عویمرؓ ان کے پاس آئے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے جواب کے بارے میں دریافت کیا ۔ حضرت عاصمؓ نے حضرت عویمرؓ سے کہا کہ آپ نے مجھے کوئی اچھا کام سپرد نہیں کیا تھا، کیونکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے اس سوال کو پسند نہیں فرمایا ۔ حضرت عویمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم، میں تو خود آپ (صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم) سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہوں گا؛ چنانچہ حضرت عویمرؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے پاس حاضر ہوے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے پاس دوسرے لوگ بھی موجود تھے ۔ حضرت عویمرؓ نے کہا : یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کوئی مرد دیکھے تو کیا اسے قتل کر ڈالے؟ لیکن اس صورت میں اسے قتل کر دیا جائے گا پھر وہ کرے تو کیا کرے؟ اس پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے اور تمھاری عورت کے بارے میں اللہ تعالٰی نے ایک حکم نازل فرما دیا ہے، جاؤ اس کے مطابق عمل کرو؛ چنانچہ دونوں کے درمیان لعان ہوا'' (البخاری : الصحیح، تفسیر سورۃ النور، ۲ : ۶۹۵ و باب اللّعان، ۲ : ۷۹۹)۔

ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعارض نہیں، بلکہ یہ دونوں واقعات آیات لعان کا سبب نزول ہو سکتے ہیں اور بقول حافظ ابن حجرؒ حقیقت یہ تھی کہ حضرت عاصمؓ جب پہلی بار آپ سے سوال کر کے چلے گئے تو بعد میں حضرت ہلالؓ بن امیہ آئے ۔ انھوں نے بھی یہی سوال کیا ۔ ان کی آمد پر آیات لعان نازل ہو گئیں اور جب ان کا فیصلہ ہو چکا تو اسی روز یا کسی اور دن حضرت عویمرؓ خود پہنچ گئے اور اس وقت چونکہ آیات لعان نازل ہو چکی تھیں، اس لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ان سے فرمایا کہ تمھارے بارے میں اللہ تعالٰی نے حکم نازل فرما دیا ہے (ابن حجر : فتح الباری، ۹ : ۳۹۷)۔ اس کی تائید مسند ابو یعلی اور مسند ابن مردویہ میں حضرت انسؓ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا لعان ہلالؓ بن امیہ اور ان کی اہلیہ کے درمیان پیش آیا (الآلوسی : روح المعانی، ۱۸ : ۱۰۵، مطبوعۂ دمشق)۔

مذکورۂ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لائیڈن کے مقالہ نگار جوزف شاخت نے حضرت ہلالؓ بن امیہ اور حضرت عویمرؓ کی روایات میں تعارض دکھلا کر انھیں من گھڑت ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے ۔

لعان کے سلسلے میں چند ضروری فقہی احکام درج ذیل ہیں :

۱ ۔ لعان جس طرح زنا کی صریح تہمت پر واجب ہوتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں یہ کہے کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے، تب بھی لعان ہو سکتا ہے، بشرطیکہ بچے کی ولادت کو زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو، اور اس دوران شوہر نے قولی یا عملی طور پر اس بچے کے اپنا ہونے کا اقرار نہ کیا ہو (ابن نجیم : البحرالرائق، ۴ : ۱۱۲، مطبوعۂ قاہرہ)۔

۲ ۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک لعان اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں میں شرائط شہادت پائی جاتی ہوں، اور بیوی میں وہ صفات موجود ہوں جن کی موجودگی میں اس پر تہمت لگانے

والا حدِّ قذف کا مستوجب ہوتا ہے، لہٰذا اگر زوجین یا صرف زوجہ کافر ہو، یا ان میں سے کوئی غلام یا بچہ یا مجنون ہو یا اس پر پہلے حدِّ قذف لگ چکی ہو، یا بیوی پر پہلے زنا کا ثبوت ہو چکا ہو تو لعان نہیں ہو سکتا (ابن نجیم : البحرالرائق، ۴ : ۱۱۳) - تقریباً یہی مذہب امام زُہری، سفیان ثوری، امام اوزاعی اور حمّاد کا بھی ہے - لیکن امام مالک، اسحٰق بن راھویہ، ربیعۃ الرّأی، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار اور ایک اور روایت کے مطابق امام احمد کے نزدیک صرف زوجین کا مکلف ہونا کافی ہے - باقی شرائط شہادت کی موجودگی لعان کی صحت کے لیے ضروری نہیں (ابن قدامہ : المغنی، ۷ : ۳۹۲، مطبوعۂ مصر، ۱۳۶۷ھ)۔

۳- فریقین میں سے کوئی ''لعان'' سے انکار کر دے تو امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، اور امام زُفر کے نزدیک اسے قید کر دیا جائے گا، تا آنکہ یا وہ فریق مخالف کے موقف کی تائید کر کے اپنے جرم کا (جو عورت کی صورت میں زنا اور مرد کی صورت میں قذف ہوگا) اقرار کر لے جس کے بعد اس پر حد جاری ہو گی، یا پھر لعان پر آمادہ ہو جائے، لیکن امام شافعی، امام مالک، لیث بن سعد اور حسن بن صالح وغیرہ کے نزدیک اگر مرد لعان سے انکار کرے تو اس پر حد قذف اور عورت انکار کرے تو اس پر حد زنا جاری ہو گی (الجصّاص : احکام القرآن، ۳ : ۳۶۴، مطبوعۂ مصر ۱۳۴۷ھ)۔

۴- اس بات پر فقہاے امت کا اتفاق ہے کہ لعان سے بالآخر زوجین کے درمیان جدائی عمل میں آ جاتی ہے - صرف عثمان البتّی کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ لعان کو موجب فرقت قرار نہیں دیتے تھے، (ابن قدامہ : المغنی، ۷ : ۴۱۱)، البتہ ان کے نزدیک بھی شوہر کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ لعان کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دیدے، لیکن البتّی کا یہ قول پوری امت میں منفرد قول ہے جس کا امت میں کوئی اور قائل نہیں؛ چنانچہ امام ابوبکر الجصّاص لکھتے ہیں کہ ''فانہ قول تفرد بہ و لانعلم احدًا قال بہ غیرہ'' (احکام القرآن، ۳ : ۳۶۷) اور لعان کے جتنے واقعات عہد رسالت میں پیش آئے، ان سب میں بالآخر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے تفریق فرمائی ہے، بلکہ ابن جُریج امام زُہری سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عُویمر العجلانی نے لعان کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ ''ذاکم التفریق بین کلّ متلاعنین'' یعنی یہی تفریق ہر دو لعان کرنے والے کے لیے ہے'' (مسلم : الصحیح، کتاب اللعان، ۱ : ۴۸۹، مطبوعۂ کراچی ۱۳۷۵ھ) - اس سے واضح ہوتا ہے کہ تفریق کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور صحیح مسلم ہی میں اس کے بعد یہ بھی مروی ہے کہ حضرت سعید بن جبیر کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا کہ لعان کے بعد تفریق عمل میں آتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ جب ان سے حضرت مصعب نے یہ مسئلہ پوچھا تو وہ پریشان ہو کر حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس گئے اور اس کی بابت دریافت کیا - حضرت عبداللہ بن عمر نے بتایا کہ تفریق عمل میں آتی ہے (حوالۂ مذکور) - اس سے جوزف شاخت کا یہ استنباط کرنا درست نہیں کہ اس دور میں بھی کوئی ایسا مکتب فکر موجود تھا جو لعان کے ذریعے تفریق کا قائل نہ تھا، کیونکہ حضرت سعید بن جبیر کا حضرت ابن عمر سے مسئلہ پوچھنا محض لا علمی کی بنا پر تھا - اگر ان کی پریشانی کی وجہ یہ ہوتی کہ اس دور کے فقہا میں کوئی اختلاف رائے پایا جاتا تھا تو وہ حضرت ابن عمر کے سامنے ان لوگوں کا قول ضرور ذکر کرتے جو تفریق کے قائل نہ تھے - اس کے برعکس حضرت ابن عمر کے

بیان پر انھوں نے سکوت اختیار کیا جس سے معلوم ہوا کہ ان کو تفریق پر کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ وہ محض اس مسئلے سے ناواقف تھے، اور صحیح بخاری میں امام زہریؒ کا قول مروی ہے کہ فکانت سنّۃ المتلاعنین یعنی یہ بات کہ زوجین میں لعان کے بعد تفریق کر دی جائے لعان کرنے والوں کی سنت بن گئی (البخاری: الصحیح، ۲: ۷۹۹)۔ اس قول سے صاف واضح ہے کہ فقہاے امت میں سے کوئی تفریق کے خلاف نہیں تھا۔

۵۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ لعان کرنے والوں کے درمیان تفریق کب اور کس طرح عمل میں آتی ہے۔ امام مالکؒ، امام ابو عبیدؒ، امام ابو ثورؒ، داود ظاہریؒ، لیثؒ بن سعد اور امام زفرؒ کے نزدیک جونہیں فریقین لعان سے فارغ ہوں گے تو بالفور تفریق عمل میں آجائے گی اور حاکم کی طرف سے تفریق کی وضاحت ضروری نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں کے لعان سے فارغ ہونے کی بھی شرط نہیں، بلکہ جونہیں مرد لعان سے فارغ ہوگا، خود بخود تفریق ہو جائے گی خواہ ابھی عورت نے لعان نہ کیا ہو، لیکن امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک محض لعان سے تفریق نہیں ہوتی، بلکہ لعان کے بعد یا تو مرد طلاق دیدے یا حاکم تفریق کردے (اس مسئلے کے تفصیلی دلائل کے لیے دیکھیے الجصاص: احکام القرآن، ۳: ۳۶۷؛ ابن قدامہ: المغنی، ۷: ۴۱۰؛ ابن حجر: فتح الباری، باب التفریق بین المتلاعنین، ۹: ۴۰۳ ببعد)۔

۶۔ اس بات پر اجماع ہے کہ لعان کے بعد جب تفریق کر دی جائے تو ملاعنہ ملاعن پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا، البتہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اگر ملاعن بعد میں اپنے آپ کو جھٹلا دے اور اس پر حد قذف لگ جائے یا کسی اور عورت پر تہمت لگانے کی بنا پر اسے حد قذف لگ جائے تو ملاعن دوبارہ ملاعنہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہ مسلک تابعین میں سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعیؒ، عامر شعبیؒ اور سعید بن جبیرؒ سے بھی مروی ہے، لیکن امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی دونوں کے درمیان تجدید نکاح ممکن نہیں (الجصاص: احکام القرآن، ۳: ۳۷۲، باب نکاح الملاعن للملاعنۃ)۔

۷۔ جب شوہر نے بیوی سے پیدا ہونے والے بچے کو اپنا بیٹا ماننے سے انکار کیا ہو تب بھی لعان ہوتا ہے، اور ایسی صورت میں قاضی دونوں کے درمیان تفریق کرنے کے ساتھ ساتھ ملاعن کے ساتھ بچے کی نسبت ختم کر دیتا ہے اور بچے کو میراث وغیرہ کے احکام میں ماں کے ساتھ ملحق کر دیتا ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا (مسلم: الصحیح، ۱: ۴۹۰)۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد کے نزدیک اس عمل کے لیے ملاعن کا صراحۃً یہ کہنا ضروری ہے کہ بچہ میرا نہیں، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک اس صراحت کے بغیر بھی بچے کا نسب ملاعن سے ختم کیا جا سکتا ہے (ابن قدامہ: المغنی، ۷: ۴۱۷)۔

۸۔ لعان کے بعد اگرچہ جھوٹا فریق آخرت کے شدید عذاب کا مستحق ہوگا، لیکن دنیا میں نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ملاعنہ کو زانیہ کہے یا لعان کی وجہ سے اس پر زنا کی تہمت لگائے اور نہ اس بچے کو حرامی کہنا جائز ہے، بلکہ اگر کوئی شخص عورت کو زانیہ یا بچے کو حرامی کہے گا تو اس پر حد قذف جاری ہو گی؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ہلالؓ

بن امیّہ کے لعان کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے دونوں کے درمیان تفریق کے بعد ارشاد فرمایا: ''لا یدعی ولدھا لاب و لا ترمی ولدھا، و من رماھا او رمی ولدھا فعلیہ الحد، یعنی اس عورت کے بچے کو باپ سے منسوب نہ کیا جائے گا، لیکن نہ اس عورت پر زنا کا عیب لگانا جائز ہے اور نہ اس کے بچے پر حرامی ہونے کا اور جو شخص اس پر یا اس کے بچے پر تہمت لگائے، اس پر حد لگے گی'' (ابوداؤد: السنن، ۲: ۳۰۷)۔ لہٰذا جوزف شاخت نے جو لکھا ہے کہ لعان کے ذریعے ''بچے کا تعلق اپنی ماں کے ساتھ محض رشتے اور وراثت کے لحاظ سے ہوگا، یعنی وہ حرامی خیال کیا جائے گا'' قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور مذکورۂ بالا صریح حدیث اس کی تردید کرتی ہے۔

مآخذ: (۱) ۲۴ [النور]: ۶ تا ۹، کے تحت جملہ تفاسیر، بالخصوص تفسیر ابن کثیر، الآلوسی: روح المعانی اور اردو تفاسیر میں [امیر علی: مواھب الرحمٰن؛ سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن؛ مفتی محمد شفیعؒ: معارف القرآن، مطبوعۂ ادارۃ المعارف کراچی؛ (۲) عہد رسالت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم میں لعان کے واقعات کی تفصیل کے لیے کتب حدیث کے ابواب اللعان، بالخصوص ابو داؤد: سنن، نور الدین الہیثمیؒ: مجمع الزوائد، دارالکتاب العربی بیروت، نیز علی المتقی، کنز العمال (دائرۃ المعارف دکن)؛ (۳) لعان کے فقہی مسائل کی تفصیل کے لیے حنفی فقہ میں الکاسانی: بدائع الصنائع و ابن نجیم: البحرالرائق، شافعی فقہ میں المطیعی: المجموع شرح المہذّب، مالکی فقہ میں الصاوی۔ حاشیۂ شرح الدردیر اور حنبلی فقہ میں ابن قدامہ: المغنی۔

(محمد تقی عثمانی)

* لَعْزَر: رک بہ لازار۔

لَعْل (لال) شَہْباز قلَنْدر: نام عثمان تھا۔ ۵۷۳ھ/۱۱۷۷ء میں مرند میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید کبیر تھا۔ سلسلۂ نسب بارہ واسطوں سے امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ تعلیم و تربیت مرند میں ہی پائی۔ عثمان اپنے زمانے کے بڑے عالم اور لسانیات اور صرف و نحو کے ماہر تھے اور کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۲ء کے قریب صرف و نحو کی جو کتابیں سندھ میں رائج تھیں، مثلاً میزان صرف اور صرف صغیر کے متعلق قسم دوم، حضرت عثمان مرندی سے منسوب کی جاتی تھیں [دیکھیے محمد اکرام: آب کوثر، لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۲]۔ تحصیل علم کے بعد انھوں نے بابا ابراہیم سے بیعت کی اور ایک سال کی عبادت اور ریاضت کے بعد خلافت پائی۔ مرشد نے لال شہباز قلندر کا لقب عطا کیا۔ بہت دنوں تک شیخ منصور کی خدمت میں بھی رہے۔

مرند سے ملتان اور اجودھن کی طرف آئے تو علم و فضل اور فقر و تصوف کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کے مالک بن چکے تھے، اس لیے یہاں خاص مقام حاصل کر لیا۔ تحفۃ الکرام [ترجمۂ اردو، کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۸] میں شیخ بہاء الدین زکریا (م ۱۲۶۲ء) شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (م ۱۲۷۱ء) سید جلال الدین سرخ بخاری (م ۱۲۹۱ء) اور حضرت عثمان مرندیؒ کو چار یار کہا گیا ہے۔ اول الذکر تینوں بزرگ زندگی کی ابتدا میں تنہا یا مل کر بڑے عرصے تک حرمین شریفین، بغداد، بخارا وغیرہ اسلامی مراکز میں آتے جاتے رہے۔ ممکن ہے کہ عثمان مرندیؒ بھی اشتراک مقصد کی بنا پر کہیں ان کے ساتھ ہو گئے ہوں۔ تحفۃ الکرام میں یہ بھی لکھا ہے [ص ۳۲۸] کہ ان اکابر کے ساتھ انھوں نے سیوستان کی یک ستونی عمارت کی چھت پر بیٹھ کر مکاشفے کیے۔ معلوم ہوتا ہے عثمان مرندی کئی بار ملتان آئے۔ ۶۶۲ھ/

۱۲۶۳ء میں غالباً شیخ بہاءالدین زکریاؒ کی وفات کی خبر سن کر آئے ۔ بعد میں عثمان مرندی اس وقت بھی ملتان آئے جب غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۷ء) نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان قآن ملک کو کول سے ملتان اور سندھ کے علاقے میں بھیجا تاکہ مغول کی تاخت و تاراج کا سدباب کرے اور وہ یہاں بارہ تیرہ سال ۶۸۴ھ / ۱۲۸۰ء میں اپنے روز شہادت تک ان کا بڑی جواں مردی سے مقابلہ کرتا رہا ۔ یہ شہزادہ علم و ادب کا بڑا سر پرست تھا، چنانچہ امیر خسرو اور حسن سجزی اس کی عمر کے آخری پانچ سال تک اس کے ساتھ رہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے شیخ سعدیؒ کو بھی ملتان لانے کے لیے آدمی بھیجے ۔ اس شہزادے نے عثمان مرندی کی بڑی تعریف سن رکھی تھی اور ان کا بڑا معتقد تھا، اس وجہ سے اس نے چاہا کہ مرندی اسے بھی مشرف فرمائیں ۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ ان کے آنے پر اس نے ان کی بہت تواضع کی اور نذرانے کے طور پر بہت کچھ پیش کیا ۔ مزید لکھا ہے کہ ''خان شہید ـــ بسیار جہد کرد کہ آن بزرگ را در ملتان بدارد و برائے او خانقاہ سازد و دھما بدھد، شیخ عثمان اقامت نکرد'' ۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ ایک روز خان شہید نے شیخ صاحب اور شیخ صدرالدینؒ ابن شیخ بہاءالدین زکریاؒ کو اپنی مجلس میں دعوت دی اور سماع شروع ہوا ۔ دونوں بزرگ اور باقی درویش حالت وجد میں رقص کرنے لگے ۔ جب تک کہ درویش سماع اور رقص کی حالت میں رہے، خان شہید دست بستہ کھڑا رہا اور زار زار روتا رہا ۔ برنی کے اس بیان سے حضرت عثمان مرندیؒ کی شخصیت، عظمت اور عزت و تکریم کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھچ جاتا ہے ۔ مذکورۂ بالا تین بزرگوں کے علاوہ شیخ کے مراسم شیخ صدرالدین ابن شیخ بہاء الدین زکریا سے بڑے گہرے تھے، جن کے معتقد سندھ میں ٹھٹھے تک پائے جاتے تھے ۔ بظاہر عثمان مرندی کے ملتان بار بار آنے کا سبب شیخ صدر الدین کا وجود گرامی تھا ۔

اقامت پذیر ہونے سے پہلے تحفۃ الکرام کے بیان کے مطابق شیخ عثمان مرندی، شاہ شمس بو علی قلندرؒ (م ۱۲۳۴ء) پانی پتی سے ملے ۔ یہ عمر میں بڑے تھے اور بو علی قلندرؒ چھوٹے، اس کے باوجود انھوں نے ان کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ ہندوستان میں پہلے ہی تین سو قلندر موجود ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ پھر واپس سندھ چلے جائیں ۔ یہ مشورہ اس لیے دیا کہ وسط ہند اور جنوبی پنجاب میں چشتی بزرگ توحید اور محبت الٰہی کا درس دے رہے تھے، ملتان سے سہروردیہ کے فیوض پھیل رہے تھے، اوچ کا روحانی مرکز بہاول پور میں تھا اور سندھ خالی پڑا تھا ۔ ان سے پہلے ایک پاک سیرت بزرگ شیخ نوح بھکری سندھ میں موجود تھے لیکن ان سے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ اتنا وسیع نہیں ہوا ۔ مگر جو مقبولیت عثمان مرندی کو حاصل ہوئی پوری سات صدیاں گزر جانے کے بعد اب بھی قائم ہے ۔ اپنے زمانے کے متشرع علما کی طرح جبہ و دستار ان کا لباس تھا ۔ اس کے باوجود ان پر جذب و سکر غالب آ گیا تھا ۔ ان کے وجد و رقص کے متعلق ضیاء الدین برنی کا بیان گزر چکا ہے ۔ فارسی میں ردیف ''می رقصم'' والی ان کی غزل آج تک گائی جاتی ہے ۔ اسی لیے ان کے طریقے کے قلندروں کو، جن کا شعار رقص کرنا ہے، لال شہباز یہ کہا جاتا ہے ۔ مذکورہ غزل میں انھوں نے بتایا ہے کہ ان کا سماع و رقص اس سرور روحانی کی وجہ سے ہے جو وصال الٰہی سے پیدا ہوتا ہے ۔

حضرت قلندر صاحب کرامت تھے ۔

تمام عمر مجرد رہے ۔ ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ۔ کوہستان مکلی پر مدفون میاں لال ان کے سگے یا چچیرے بھائی تھے ۔ فیروز تغلق کے عہد میں اختیار الدین ملک ارشد نے ۷۰۷ھ / ۱۳۰۶ء میں ان کی قبر پر روضہ بنوایا ۔ ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء میں مرزا حاجی بیگ ترخان اور ۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۰ء میں اس کے بیٹے مرزا غازی بیگ وقاری نے اس کی مرمت کرائی ۔ تذکرۂ صوفیاے سندھ میں درج ایک قطعے میں ان کی کرامت، سخاوت و شفقت، دین پروری، پاکیزگی اور عزت و توقیر کا ذکر ہے ۔ ان کی درگاہ کے متولی صاحب کرامت ہو گزرے ہیں ۔ دیکھ بھال قدیم الایام سے شیوخ کے ذمے ہے اور قرابت کی وجہ سے سادات بھی اس سے متعلق ہیں، چنانچہ سندھ کے مشہور لکیاری سادات بھی متولی ہوے ہیں ۔

شہبازؒ کی وفات کے بعد ان کے فیوض و برکات کا چرچا روز بروز بڑھتا چلا گیا ۔ فیروز تغلق جس کی تاج پوشی ۲۴ محرم ۷۵۲ھ / ۲۳ مارچ ۱۳۵۱ء کو ٹھٹھے کے قریب ہوئی، اگلے ماہ سیوھن میں ان کے اور دوسرے بزرگوں کے آستانوں پر زیارت کے لیے گیا اور اس نے محمد تغلق کی میت کو، جو اس سال ۲۱ محرم / ۲۰ مارچ کو ٹھٹھے کے قریب فوت ہوا، دہلی لے جانے سے پہلے کم از کم ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء تک حضرت قلندر کے مقبرے کے نزدیک سیوھن میں مدفون رکھا ۔ جس کی تائید قبر پر ایک معمار سرمست کے بنائے ہوے قبّے کے کتبۂ تاریخ سے ہوتی ہے جو اب تک وہاں موجود ہے ۔ [دیکھیے محمد معصوم بھکری : تاریخ معصومی، بمبئی ۱۹۳۸ء، ص ۲۸۱، ۲۸۲] مخدوم بلال (م ۹۲۹ھ / ۱۵۵۲ء) حضرت قلندر کے اشارے پر ان کے مزار کی زیارت کے لیے آئے ۔ سادات کربلا میں سے جلیل القدر سید میر کلاں قندہار سے سندھ آئے تو سیوستان کے نواح میں ٹھیرے ۔ اپنا وقت زیادہ تر مخدوم، شہباز قلندرؒ کے مزار پر گزارتے تھے ۔ ٹھٹھے کے گرد و نواح کے اولیا میں سے لال موسی بھی ان سے فیضیاب ہوے ۔ حاجی منگھا کے پہاڑ میں مخدوم لال شہباز سے منسوب کندری (پیراگن) نامی ایک نہر ہے جس کے دونوں کناروں پر خوشگوار باغات اور درویشوں کے پُرسکون تکیے ہیں.

مآخذ : (۱) شیر علی قانع : تحفۃ الکرام، ترجمۂ اردو، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۲) محمد معصوم بھکری تاریخ معصومی، ترجمۂ اردو، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) اعجاز الحق قدوسی : تاریخ سندھ، ج ۲، لاہور، ۱۹۷۳ء، بمدد اشاریہ؛ (۴) اعجاز الحق قدوسی : تذکرۂ صوفیاے سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۶، ۲۱۸، ۲۱۹؛ (۵) عبدالحق محدث دہلوی : اخبار الاخیار، مطبع احمدی ۱۲۷۰ھ، ص ۳۲؛ (۶) اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۵، ۱۵، بذیل مادۂ بہاء الدین زکریاؒ و فرید الدین گنج شکرؒ؛ (۷) ضیاء الدین برنی : تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۵۳، ۶۶ تا ۶۸، ۱۰۹، ۵۳۶ تا ۵۳۸؛ (۸) محمد اکرام : آب کوثر، لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۰ تا ۳۳۳؛ [(عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

لُغات : رک بہ علم (لغات).

لَغْوات : (= لغواط؛ Laghuat) : رک بہ اَلْاَغْواط.

لُقْطَہ : (عربی) کوئی پائی ہوئی چیز (زیادہ صحیح : گری پڑی چیز جو اٹھا لی جائے)؛ شریعت اسلامی میں گم شدہ چیز کے پانے والے کے مقابلے میں مالک کے حق کو تحفظ حاصل ہے، اس کے ساتھ بعض اوقات معاشری ملحوظات شامل ہو جاتے ہیں ۔ گری پڑی چیزوں کو عام طور سے اٹھا لینے کی اجازت ہے، اگرچہ کبھی کبھی یہ

بھی کہا گیا ہے کہ انہیں پڑا رہنے دینا ہی زیادہ قابل ستائش ہے۔ پانے والے پر لازم ہے کہ وہ ہر اس چیز کا جو اسے ملی ہو (یا اس نے اٹھا لی ہو)، پورے ایک سال تک اعلان کرتا رہے، الّا یہ کہ وہ چیز بالکل حقیر و بے قیمت ہو یا جلد فنا پذیر ہو۔ اعلان کی صورت اور اس سے متعلق تفصیلات نہایت دقّت نظر کے ساتھ خاص خاص قواعد کے ماتحت منضبط ہیں۔ ایک سال گزر جانے کے بعد حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانے والے کو پائی ہوئی چیز پر قبضہ کر لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے، جس طرح چاہے اسے کام میں لائے، لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قبضے کا حق صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب پانے والا ''غریب یعنی محتاج ہو'' لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے ہاں اس ضابطے میں ایک فقرے کا اضافہ کیا گیا ہے کہ لقطہ کو بطور صدقہ دینا افضل ہے، چاہے سال پورا بھی نہ ہوا ہو۔ اگر ایک سال کی مدت کے انقضا سے پہلے یافتہ شے کا مالک حاضر ہو جائے تو اسے اس کی چیز واپس مل جائے گی۔ اگر مدت کے انقضا کے بعد آئے تو بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ پائی ہوئی چیز پانے والے کے پاس موجود ہو، لیکن اگر پانے والے نے قانون (اسلامی) کے مطابق اسے ٹھکانے لگا دیا ہو تو اس کے ذمّے مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے، داؤد ظاہری تنہا اس کا قائل ہے کہ اس صورت میں مالک نقصان برداشت کر لے اور اسے کسی سے کچھ لینے کا حق نہیں ہے۔ ملکیت کے اثبات کے طریق کو بمقابلہ اس معمول بہ طریق کے جو بمقابل حضرت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا تجویز کردہ ہے، اس کے ہاں آسان کر دیا گیا ہے (البخاری کا بھی یہی مسلک ہے، دیکھیے اس کا ترجمہ کتاب اللقطہ، باب ۱)۔ گھریلو جانوروں سے متعلق جو جنگل میں بھٹکتے ہوئے مل جائیں خاص خاص قواعد موجود ہیں۔ ان قواعد کے اندر زخمی جانوروں کی صورت میں پانے والے پر کمتر ذمے داریاں ہیں اور صحیح سالم جانوروں کی صورت میں یہ ذمے داریاں زیادہ تر ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے ہاں حرم مکہ میں یافتہ اشیا سے متعلق خاص قواعد موجود ہیں، جن کی بنیاد وہ مسئلۂ قدیمہ ہے کہ حرم کی کل اشیا اور وہاں کی پائی ہوئی چیزوں کا حق ملکیت صرف اللہ عزّ و جلّ کے ساتھ مختص ہے۔

فقہ کے یہ احکام دراصل چند احادیث پر مبنی ہیں جو بعض اختلافات کے ساتھ فقہا تک پہنچی ہیں (دیکھیے، البخاری: لقطہ، مسلم، قسطنطنیہ ۱۳۲۹ھ، ج ۵: ۱۳۳)۔ ان کے یہاں نقل کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ وہ تمام بنیادی امور میں اصولاً ایک دوسرے سے متفق ہیں، لیکن یہاں اس بات کا ذکر کر دینا مناسب ہے کہ ایک پرانی زمین میں گاڑی ہوئی چیز کے لیے جسے بعد کے زمانے میں کھود کر نکالا گیا ہے دو اور تین سال کی مدت بھی مذکور ہے۔ فقہا کے ہاں لقطہ کو ودیعت کا درجہ دیا گیا، مزید برآں تقوے اور اجتناب مشتبہات کا تقاضا یہ ہے کہ گری ہوئی کھجوروں کو اٹھا کر کھانا نہ چاہیے، ہو سکتا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی ہوں۔

سب سے آخر میں ایک حدیث کا ذکر ضروری ہے۔ اس میں حجاج مکّہ کو گری پڑی چیزوں کے اٹھانے سے قطعاً منع کیا گیا ہے۔ بخاری کی کتاب اللقطہ ترجمہ، باب ۱۱ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشیاے یافتہ کو محکمۂ حکومت کی تحویل میں دے دینا چاہیے یا معمولاً دے دیا جاتا تھا۔ پانے والے کی تحویل میں ان کا رہنا ایک خاص حدیث کی رو سے جائز قرار دیا گیا ہے۔

ان روایات میں سے کسی کو بھی تاریخ سے ثابت شدہ نہیں سمجھا جا سکتا ۔ زیادہ سے زیادہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا فتح مکّہ کے بعد اپنے خطبۂ مبارک میں حرم میں گری پڑی ہوئی چیزوں کو بغیر اس کی علامات کے اعلان کے (دیکھیے بیان بالا) اٹھانا اور پاس رکھنا، ممنوع قرار دینا صحیح کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں قدیم مصطلحات استعمال کی گئی ہیں، لقطہ کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ہے ۔

مآخذ : فقہ و حدیث کے مجموعوں میں متعلقہ ابواب کے لیے دیکھیے [(۱) مفتاح کنوز السنّۃ، بذیل مادّہ؛ (۲) معجم الفقہ الحنبلی، جلد ۲، بذیل مادّہ؛ (۳) معجم فقہ ابن حزم، بذیل مادّہ؛ (۴) المرغینانی : الھدایۃ، بذیل مادّہ].

(J. SCHACHT)

⊗ **لُقْمٰن** : قرآن حکیم کی ایک مکی سورۃ کا نام جو ۳۴ آیات پر مشتمل ہے البتہ تین آیات (۲۷، ۲۸، ۲۹) مدنی ہیں (الاتقان فی علوم القرآن، ۱ : ۱۰؛ تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۱؛ التفسیر الکبیر، ۲۵ : ۱۳۹؛ تفسیر القاسمی، ۱۳ : ۴۷۹۲) ۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس سورت کا عدد ۳۱ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا عدد ۵۷ ہے ۔ یہ سورت الصّٰفّٰت [رکوع ۵] کے بعد اور سورۂ سبأ [رکوع ۵] سے پہلے نازل ہوئی (الاتقان فی علوم القرآن ۱ : ۱۰؛ تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۱) ۔ اس کی وجہ تسمیہ ایک تو یہ ہے کہ اس کے دوسرے رکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو لقمان حکیمؑ نے اپنے بیٹے کو کی تھیں؛ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام لقمٰن رکھا گیا (تفہیم القرآن، طبع ۱۹۷۲، ۴ : ۶)۔ جمال الدین القاسمی نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ لقمان حکیم کے قصے میں حکمت کی فضیلت، اللہ تعالٰی کی معرفت کا راز، اس کی صفات، شرک کی مذمت، اخلاق حسنہ اور افعال حمیدہ کا ارشاد فرمایا گیا ہے اور بری باتوں سے منع کیا گیا ہے ۔ یہ سب امور قرآن حکیم کے اہم مقاصد ہیں (تفسیر القاسمی، ۱۳ : ۴۷۹۲) ۔

گذشتہ سورۃ سے اس کا ربط اولاً یہ ہے کہ اس کے آخر میں ارشاد باری ہے : وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۳۰ [الرّوم] : ۵۸)؛ جب کہ اس سورۃ کے آغاز میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۔ ثانیاً مذکورۂ بالا آیت کے آخری حصّے میں ہے : وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝ (۳۰ [الرّوم] : ۵۸) جب کہ اس سورت میں ارشاد خداوندی ہے : وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَكْبِرًا (۳۱ [لقمٰن] : ۷) ۔ ثالثاً گزشتہ سورت میں ارشاد خداوندی ہے : ''وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ'' (۳۰ [الرّوم] : ۲۷) اور اس سورت میں فرمایا : ''مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (۳۱ [لقمٰن] : ۲۸) ۔ گویا دونوں میں تخلیق کے بارے میں عظیم قدرت خداوندی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے ۔ رابعاً، گزشتہ سورت میں ارشاد باری ہے : وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ الآیۃ (۳۰ [الرّوم] : ۳۳) جبکہ اس میں ارشاد فرمایا ''وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ الآیۃ (۳۱ [لقمٰن] : ۳۲) اور ان دونوں میں ایک ہی مضمون کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے (دیکھیے تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۱) ۔

اس سورۃ کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس کے تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے ۔ اس کے مضامین کی داخلی شہادت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سورت

اس زمانے میں نازل ہوئی جب کہ تبلیغ اسلام کو روکنے کے لیے جور و ظلم کا آغاز ہو چکا تھا (۳۱ [لقمٰن] : ۲۰ و ۲۱)، تاہم ابھی طوفان مخالفت نے پوری شدت اختیار نہ کی تھی ۔ حضرت ابن عباسؓ لھو الحدیث کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت النّضر بن الحارث کے بارے میں نازل ہوئی جس نے ایک مغنّیہ خریدی اور جب کبھی کسی کو اسلام کی بات سنتے پاتا تو اسے اس مغنیہ کے پاس لے جاتا اور اس سے یہ کہتا : اطعمیہ و اسقیہ وغنّیہ یعنی اسے کھلاؤ، پلاؤ اور موسیقی سے اس کی تواضع کرو اور اس شخص کو مخاطب کر کے کہتا : ''ھٰذا خیرٌ مما یدعوک الیہ محمّد من الصّلاۃ و الصّیام و ان تقاتل بین یدیہ، یعنی یہ امر اس سے کہیں بہتر ہے جس کی طرف تجھے محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم بلاتے ہیں اور نماز روزے اور جہاد کا حکم دیتے ہیں (دیکھیے تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۳) ۔ مقاتل کی روایت ہے کہ النضر بن الحارث تجارت کے لیے فارس جایا کرتا تھا اور وہاں سے عجمیوں کی کتابیں اور قصے خرید لاتا اور وہ قریش کو سناتا اور ان سے یہ کہتا : ''ان محمد یحدثکم حدیث عاد و ثمود و انا احدثکم حدیث رستم و اسفند یار'' یعنی محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم تم سے عاد و ثمود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں تمھیں رستم و اسفند یار کے (زیادہ دلچسپ) واقعات سناتا ہوں ۔ قریش کے جاہل لوگ اس کی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے اور قرآن حکیم کے سماع سے باز رہتے (دیکھیے کتاب مذکور، ۲۱ : ۷۴) ۔ ابو امامہ نے اسی آیت کی تشریح میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے : ''لا تبیعوا القینات و لا تشتروھنّ و لا تعلّموھنّ و لا خیر فی تجارۃ فیھنّ و ثمنھنّ حرام'' یعنی گانے ناچنے والی عورتوں کی خرید و فروخت نہ کرو اور نہ انھیں یہ فن ہی سکھاؤ ۔ ان کی تجارت میں مطلقاً کوئی بھلائی نہیں اور ان کی قیمت وصول کرنا حرام ہے (الترمذی : الجامع السنن، ۱۲ : ۷۲ ببعد؛ ابن العربی : احکام القرآن، ۲ : ۱۵۰۰) ۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ دعوت اسلامی کو روکنے کے لیے مختلف حربے اختیار کیے جارہے تھے تاکہ لوگ قرآن حکیم سننے سے باز رہیں اور اس کی صوتی تاثیر اور روحانی و قلبی اثرات سے متأثر ہو کر کہیں اسلام قبول نہ کر لیں، اس لیے النضر بن الحارث آنے جانے والوں کے راستے میں بیٹھ جاتا تاکہ انھیں اپنی گفتگو کی طرف مائل کرے (فی ظلال القرآن، ۲۱ : ۶۶)۔

یہ سورت بہت سے مضامین پر مشتمل ہے ۔ سورۃ کا آغاز قرآن حکیم کی اہمیت و عظمت کے بیان سے ہوتا ہے کہ یہ اہل ایمان اور نیکوکاروں کے لیے سرچشمۂ ہدایت و رحمت ہے (۳۱ [لقمٰن] : ۱—۳) ۔ چونکہ کفّار مکّہ کا یہ زعم تھا کہ رسول کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دعوت پر لبّیک کہنے والے اپنی زندگیاں برباد کر رہے ہیں، اس لیے اس سورت کی ابتدا میں زور دے کر فرمایا کہ اہل ایمان ہی دراصل فلاح پانے والے ہیں (تفہیم القرآن، ۴ : ۸) ۔ تاریخ اس امر پر شاھد ہے کہ دنیا میں قرآن مجید کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو چکی ہے اور یقیناً آخرت میں بھی پوری ہو گی ۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو حکمت و بصیرت سے معمور کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے خرافات کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کر کے وقت ضائع کر رہے ہیں ۔ امام الرّازی فرماتے ہیں کہ اول تو حکمت بھری باتوں کو چھوڑ کر دوسری کسی بات کی طرف دھیان دینا ہی قبیح ہے؛ دوسرے یہ قباحت اس وقت اور بھی نمایاں ہو

جاتی ہے کہ جب دوسری طرف ''لھو الحدیث'' ہو (التفسیر الکبیر، ۲۵ : ۱۴۰) - ''لھو الحدیث'' کی تشریح میں ابن کثیر نے ابن مسعودؓ کا یہ قول پیش کیا ہے کہ اس سے مراد گانا بجانا ہے، ''ھُوَ وَاللّٰہِ الْغِنَاء'' (تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۴۴۱) - ابن کثیرؓ نے ابن عباسؓ، عکرمہؓ، سعید بن جُبَیرؒ، مُجاہدؒ، مَکحولؒ اور عمرو بن شعیب سے بھی یہی معنی نقل کیے ہیں اور حسن بصریؒ کا بھی یہ قول پیش کیا ہے : نُزِّلَت ھٰذہ الایۃ (وَمِنَ النَّاسِ... الایۃ) ''فِی الْغِنَاء وَالْمَزَامِیْر'' (کتاب مذکور، ۳ : ۴۴۲) - ابن عربی نے ''لھو الحدیث'' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے : ''ھو الغناء وَمَا اتّصل بہ'' (احکام القرآن، ۲ : ۱۵۰)- القاسمی نے اس کی تشریح میں الزمخشری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ : ''و اللّھو کُلّ باطل اَلْھی عن الخیر'' (تفسیر القاسمی، ۱۳ : ۴۷۹۳؛ المفردات فی غریب القرآن : ۴۷۱)۔

قرآن حکیم کی عظمت اور کفار کے زعم کو باطل ثابت کرنے کے لیے (آیات ۱۰ تا ۱۱ میں) انسانی توجہ آسمان اور زمین کی تخلیق اور ان کے عجائبات کی طرف مبذول کرائی گئی ہے تاکہ وہ خالق حقیقی کی عظمتوں کا اندازہ لگا سکے - اس کے بعد توحید کی حقّانیت کو راسخ کرنے کے لیے یہ بتایا جا رہا ہے کہ عقل و حکمت پر مبنی یہ تعلیمات آج کوئی پہلی مرتبہ تمہارے سامنے پیش نہیں کی جا رہی ہیں، بلکہ پہلے بھی عاقل و دانا لوگ یہی بات کہتے رہے ہیں اور تمہاری جانی پہچانی شخصیت لقمان حکیم اب سے بہت پہلے یہی کچھ کہہ گئے ہیں (تفہیم القرآن، ۴ : ۱۳) - لقمان حکیم کی شخصیت کے بارے میں مفسّرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں (دیکھیے کتاب مذکور، ۴ : ۱۳ ببعد؛ تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۸؛ ابن العربی : احکام القرآن، ۲ : ۱۵۰ ببعد نیز رک بہ لقمان) - ابن کثیر نے سفیان ثوریؒ کے حوالے سے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے ''کَانَ لقمانُ عبداً حبشیاً نجّاراً'' (تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۴۴۳) اور یحیی بن سعید الانصاری کے حوالے سے سعید بن المسیبؒ کا یہ قول نقل کیا ہے : ''کَانَ لقمانُ من سودان مصر ذامشافر اعطاہُ اللہ الحکمۃ و منعہ النّبوۃ''- ابن جریر نے خالد الرّبعی کے حوالے سے لقمان کے بارے میں وہ مشہور قصّہ بیان کیا ہے کہ اس کے آقا نے پہلی بار اسے بکری کو ذبح کر کے اس کے دو سب سے اچھے ٹکڑے (اَطْیَبُ مضغتین) اور دوسری بار گوشت کے دو سب سے برے ٹکڑے پکا کر لانے کے لیے کہا اور لقمان نے دونوں بار، دل اور زبان پکا کر، آقا کو پیش کیے اور اس کے استفسار پر دل اور زبان دونوں کی سعادت اور شقاوت پر حکیمانہ خطبہ ارشاد فرمایا (دیکھیے کتاب مذکور ۳ : ۴۴۳؛ ابن العربی : احکام القرآن، ۲ : ۱۴۱)۔

ابن کثیر نے اس بحث کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے کہ لقمان نبی تھے یا غیر نبی - چنانچہ فرماتے ہیں : ''اختلف السّلف فی لقمان ھل کَانَ نبیّاً، اَوعَبْداً صالحًا من غیر نبوۃ علی قولین الاکثرون علی الثانی'' (تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۴۴۳) - المراغی نے لقمان کے ذکر میں ان کے چند حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں، مثلاً یَا بُنَیَّ لا تَکُنْ حلواً فتبتلع و لا مُرّاً فتلفظ یعنی اے میرے بیٹے! تو اتنا میٹھا نہ ہو کہ نگل لیا جائے اور نہ اتنا تلخ ہی کہ تجھے تھوک دیا جائے (تفسیر المراغی، ۲۱ : ۷۸؛ احکام القرآن، ۲ : ۱۵۱)۔

اس کے بعد قرآن حکیم نے حضرت لقمان کی چند نصیحتوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کیں - یہ نصیحتیں، شرک کی مذمت

اللہ تعالٰی کی صفات حمیدہ، اقامت صلوٰۃ، امربالمعروف اور نہی عن المنکر، صبر کی تلقین، تکبر سے بچنے، گفتگو اور چال میں تواضع اختیار کرنے اور گلا پھاڑ کر بولنے سے باز رہنے کی تلقین پر مشتمل ہیں (تفہیم القرآن، ۴: ۱۰ ببعد) ۔ اس سورۃ کے دیگر مضامین یہ ہیں: اطاعت والدین، اخروی کامیابی کے حصول کے لیے رجوع الی اللہ، اللہ تعالٰی کی غیر محدود اور ان گنت نعمتوں کا ذکر، عجائبات فطرت کے مشاہدے کی تلقین، کفار کے مضحکہ خیز رویے کا ذکر کہ مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتے ہیں اور مصیبت ٹلنے پر شرک شروع کر دیتے ہیں، فلاح و کامرانی کے حصول کے لیے خوف خدا اور خوف قیامت رکھنے کی تاکید (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر المراغی، ۲۱: ۱۰۱) ۔ سورت کے آخر میں ان پانچ امور غیبیہ [خمسہ مغیبات] کا ذکر ہے جنھیں سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا ۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ صرف پانچ امور غیبیہ کا ذکر مثال کے طور پر ہے [اور ان کی تخصیص کی کھلی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے انھیں پانچ مسئلوں کی بابت سوال کیا گیا تھا] ورنہ امور غیبیہ کی کوئی حد نہیں (تفہیم القرآن، ۴: ۲۹؛ التفسیر الکبیر، ۲۵: ۱۶۴) :

مآخذ: (۱) الراغب الاصفہانی: المفردات، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲) ابن العربی: احکام القرآن، قاہرہ، ۱۳۳۱ھ؛ (۳) السیوطی: الاتقان، مطبوعہ قاہرہ؛ (۴) الفخر الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعہ قاہرہ: (۵) ابن کثیر: تفسیر، مطبوعہ قاہرہ؛ (۶) محمد جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، قاہرہ، ۱۹۵۹ء؛ (۷) سیّد قطب: فی ظلال القرآن، مطبوعہ بیروت؛ (۸) احمد مصطفٰی المراغی: تفسیر المراغی، قاہرہ، ۱۹۴۶ء؛ (۹) ابوالاعلٰی مودودی: تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۲ء؛ (۱۰) الترمذی: الجامع السنن، قاہرہ، ۱۹۳۴ء؛ [(۱۱) سیّد امیر علی: تفسیر مواہب الرحمٰن؛ (۱۲) مفتی محمد شفیع: معارف القرآن].

(بشیر احمد صدیقی)

لقمان: عرب قدیم کی ایک برگزیدہ ہستی، ⊗ حکمت اور دانائی میں ضرب المثل ۔ شعرائے جاہلیت مثلاً امرؤ القیس، لبید، اعشٰی، طرفہ وغیرہ کے کلام میں لقمان کا ذکر موجود ہے ۔ سیرۃ ابن ہشام اور اسد الغابہ میں ہے کہ سُوید بن صامت جب مدینے سے حج کعبہ کے لیے آئے اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کو حاجیوں کے درمیان تبلیغ کرتے سنا تو عرض کی کہ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں اسی طرح کی ایک چیز صحیفۂ لقمان میرے پاس بھی موجود ہے ۔ آپؐ کی فرمائش پر اس نے صحیفے کا کچھ حصہ آپؐ کو سنایا ۔ آپؐ نے فرمایا یہ بہت اچھا کلام ہے مگر ہمارے پاس اس سے بھی بہتر کلام ہے ۔ چنانچہ آپؐ نے اسے قرآن مجید سنایا اور اس نے اعتراف کیا کہ بلا شبہہ یہ صحیفۂ لقمان سے بہتر ہے ۔ سوید بن صامت مدینے میں اپنی لیاقت، بہادری، شعر و سخن اور نسب و شرف کی بنا پر کامل کے لقب سے پکارا جاتا تھا ۔ مدینے واپسی کے کچھ عرصہ بعد جنگ بعاث میں مارا گیا۔

حیرت ہے کہ قدیم الایام سے عربوں میں اس قدر شہرت اور صحیفۂ لقمان کی موجودگی کے باوجود حضرت لقمان کا حسب معروف نہیں ۔ انھیں حضرت ایوبؑ کا بھانجا بھی کہا گیا ہے اور خالہ زاد بھائی بھی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت ایوبؑ سے علم سیکھا اور داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا ۔ بنی اسرائیل میں قاضی رہے ۔ سلسلۂ نسب لقمان بن عنقا بن مرون تھا ۔ ابن کثیر مرون کو سدون لکھتے ہیں اور کہتے ہیں انھیں لقمان بن ثاران بھی کہا گیا ہے ۔ مواہب الرحمٰن میں ان کا

سلسلۂ نسب اس طرح بھی درج ہے : لقمان بن باعور بن ناحور بن تارخ اور تارح حضرت ابراہیمؑ [آزر بآں] کے باپ تھے ۔ حسب و نسب کے متعلق ان کوائف کا تقاضا تھا کہ حضرت لقمان کا ذکر دائرۂ معارف یہود یا انجیل مقدس میں ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے ۔ القاسمی نے تفسیر القاسمی میں لکھا ہے کہ بعض علماے اسلام کا خیال ہے کہ تورات میں مذکور بلعام سے مراد حضرت لقمان ہیں، لیکن دائرۂ معارف یہود اور انجیل مقدس میں بلعام کی سیرت اس قدر قابل نفرت بیان کی گئی ہے کہ اسے لقمان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی ۔ ان علما کا یہ خیال شاید بلع اور لقم (کھانا، نگلنا) کے متحد المعنی ہونے کی بنا پر تھا، لیکن نام سے سیرت کی مطابقت لازم نہیں ہو جاتی۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے قصص القرآن میں حضرت لقمان کی اصل پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ روض الانف، تاریخ ابن کثیر اور تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت لقمان سیاہ رنگ کے حبشی غلام تھے ۔ موٹے موٹے ہونٹ، ہاتھ پیر بھدے، پستہ قد، بھاری بدن، نوبہ کے رہنے والے تھے جو مصر کے جنوب اور سوڈان کے شمال میں واقع ہے ۔ البدایۃ و النہایۃ میں ان کا پیشہ نجاری بتایا گیا ہے ۔ اور مجاہدؒ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ پہلے ریوڑ چراتے تھے۔ تفسیر الکشاف میں ابن المسیبؒ کا یہ قول بھی درج ہے کہ حضرت لقمان خیاط تھے ۔ امین، حق گو اور منصف مزاج ہونے کی بنا پر حکمت عطا ہوئی ۔ ان کے حکیمانہ اقوال و امثال کے عرب میں شائع ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اصلاً نوبی تھے، مگر مدین اور ایلہ (موجودہ عقبہ) کے باشندے تھے، اس لیے زبان عربی تھی ۔ ان کے حبشی ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بہت سی تفاسیر مثلاً تاریخ ابن کثیر میں عبدالرحمن بن حرملہ کی یہ روایت درج کی گئی ہے کہ سعید بن المسیبؒ کے پاس ایک حبشی آیا جو اپنی سیاہ رنگت کے باعث محزون تھا ۔ انھوں نے کہا دلگیر ہونے کی کوئی وجہ نہیں؛ سوڈانیوں میں تین آدمی بہترین ہوے ہیں : حضرت بلالؓ، حضرت عمرؓ کے غلام منہجع اور لقمان حکیم ۔ مواہب الرحمن میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا کہ لقمان حبشی تھے ۔ ساتھ ہی ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا کہ تین حبشی اہل جنت میں سے ہیں: لقمان، نجاشیؓ اور بلالؓ، لیکن ان دونوں حدیثوں کی اسناد ضعیف ہیں، صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے اس ضمن میں کوئی بات بہ اسناد صحیح مروی نہیں ۔

لقمان حکیم کے حسب و نسب کے متعلق کتاب التیجان کا بیان کسی قدر مختلف ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ افریقی الاصل نہیں بلکہ عربی النسل تھے ۔ وہب بن منبّہ کی روایت ہے کہ جب شداد بن عاد کا انتقال ہوا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی ۔ لقمان کو سو آدمیوں کے برابر حاسّۂ ادراک عطا ہوا تھا اور اپنے زمانے میں سب سے زیادہ طویل القامت انسان تھے ۔ وہب نے یہ بھی روایت کی ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ ان کا نسب نامہ لقمان بن عاد بن الملطاط بن السکسک بن وائل بن حمیر ہے برّ صغیر کے مشہور محقق سید سلیمان ندوی ارض القرآن میں لکھتے ہیں کہ لقمان بن عاد ہی لقمان حکیم تھے اور عرب نژاد تھے ۔ ان کے عرب ہونے کے متعلق سید صاحب ایک جاہلی شاعر، سلمٰی بن ربیعہ کے مندرجۂ ذیل اشعار سے استشہاد کرتے ہیں :

اَھلکُنَ طسمًا و بعدہ غَذِیَّ بھم و ذَاجُدُون واھل جاش و مأرب وحیّ لقمان و التقون

جس کا مطلب یہ کہ حوادث زمانہ نے قبیلۂ طسم، اس کے بعد ذاجدون، شاہ یمن، اھل جاش و مأرب اور قبیلۂ لقمان کو مٹا دیا ۔ وہ کہتے ھیں کہ اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ لقمان عرب تھے اور ایک قبیلے کے مالک اور یمن کے باشندے تھے اور عظمت و شوکت کے مالک بھی تھے ۔ یہ باتیں لقمان بن عاد پر صادق آتی ھیں ۔ اس لقمان کا ذکر اخبار عبید میں بھی موجود ھے جہاں اسے عادالآخرہ میں سے بتایا گیا ھے اور یہ لوگ حضرت ھودؑ کے وہ متبعین تھے جو ان کے ساتھ عاد الاولٰی کی تباھی کے بعد حضرموت وغیرہ میں آباد ھو گئے تھے ۔ سید سلیمان ندویؒ عرب کے تاریخی جغرافیے کے مصنف فارسٹر کے حوالے سے جنوبی عربی میں ایک حجری کتبے کا ذکر کرتے ھیں جو حصن غراب واقع قریب عدن کے کھنڈروں میں سے ۱۸۳۴ء میں برآمد ھوا تھا اس میں حضرت ھود کی شریعت کو ماننے والے نیک طینت بادشاھوں کی طرف اشارہ کیا گیا ھے جن کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے ۔ سید سلیمانؒ نے لکھا ھے کہ یہ کتبہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں بھی دریافت ھوا تھا اور اس کا ترجمہ عربی میں ھوا جو لفظ بہ لفظ فارسٹر کے ترجمے سے ملتا ھے ۔ اچھے فیصلوں والی کتاب سے سید صاحب صحیفۂ لقمان مراد لیتے ھیں جو عرب میں مشہور تھا ۔ کتاب التیجان اور اخبار عبید دونوں میں لقمان بن عاد کو صاحب النسور (گدھوں والے) کہا گیا ھے جن گدھوں کو کہانی کے مطابق پالنے کی وجہ سے انھیں ایک ھزار سال یا اس سے زیادہ طویل عمر ملی تھی ۔ ظاھر ھے عوامی تخیل کی پیداوار ھونے کے علاوہ اس کہانی کی اور کوئی حیثیت نہیں اور سید سلیمانؒ کا یہ کہنا درست ھے کہ لقمان کی مبیّنہ عمر سے خاندان کی عمر مراد لینی چاھیے ۔ اس بادشاہ کے خاندان میں حکومت کئی سو برس تک رھی ھو گی اور مجازًا بجاے خاندان کے اس کا شخصی نام خاندان قرار دیا گیا ھو گا اور تمام قدیم قوموں کی ابتدائی تاریخ میں اسی طرح ھوتا ھے ۔ اس طرح اس خاندان کے تمام بادشاھوں کے اچھے فیصلوں کو صحیفۂ لقمان کہ دینا بالکل قرین قیاس نظر آتا ھے ۔

حضرت لقمان کے متعلق اس نسبۃً طویل بحث کا مقصد یہ ھے کہ دور جاھلیت کی عربی شاعری میں لقمان کے ذکر اور صحیفۂ لقمان کے قدیم عربوں میں ملنے کی شہادتوں سے پتا چلتا ھے کہ حضرت لقمان ایک افسانوی شخصیت نہیں تھے جیسا کہ لائیڈن کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ھیلر نے کہا ھے ۔ کتاب التیجان اور اخبار عبید دونوں کتابیں ایک نیک فطرت بادشاہ لقمان کا ذکر کرتی ھیں ۔ محولۂ بالا حجری کتبہ بھی ان کی تائید کرتا نظر آتا ھے ۔ قرآن مجید میں بھی حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو خود پسندی اور نخوت کے خلاف جو نصیحت کی ھے وہ ایک شہزادے کے لیے تو موزوں ھے، غلام زادے کے لیے نہیں ۔ نیز چونکہ حضرت لقمان خالصۃً عرب نژاد تھے اور یہودیوں اور نصرانیوں کی مذھبی یا سیاسی تاریخ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیے ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ دوسری طرف عرب لوگوں کو اپنی نسل کے حکیم لقمان پر ناز تھا وہ اس کا نام قدیم الایام سے بصد احترام لیتے تھے اور ان کی نصائح کا چرچا کرتے تھے اور قرآن مجید نے اسی بنا پر اس تاریخی شخصیت کو حیات جاوداں عطا کر دی ۔ علماے یورپ حکیم لقمان اور یونانی حکیم ایسپ (۶۱۹ تا ۵۶۴ ق ۔م) کو ان کی ھم جنس حکایات و تمثیلات کی بنا پر ایک قرار دیتے ھیں، مگر سید سلیمان ندویؒ کا یہ کہنا بجا طور پر درست ھے کہ قدیم عرب حکماے یونان سے

واقف نہ تھے دوسرے دو تصانیف کے مطالب کا اتحاد ان کے مصنفین کے اتحاد شخصیت کو مستلزم نہیں۔ حکیم ایسپ کو بھدا اور غلام کہا گیا ہے۔ ہماری بعض روایتوں میں لقمان حکیم کے متعلق بھی یہی کچھ بتایا جاتا ہے، لیکن یہ مشابہت اس قدر ناکافی ہے کہ اس کی بنا پر حتماً دونوں کو ایک ہی شخصیت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ امثال لقمان حکیم کا ایک جعلی نسخہ مستشرق دیرتبورگ نے *Fables De Loqman Le Sage* کے نام سے شائع کرایا ہے جو تیرھویں صدی عیسوی کا مرتب شدہ ہے جس کی عربی ناقص ہے اور جو کسی اور زبان کا ترجمہ ہے۔ ان تمام باتوں کے زیر نظر لقمان حکیم کے سلسلے میں مستشرقین کے بیانات کو معتبر نہیں کہا جا سکتا۔

اگرچہ عکرمہؓ کی روایت ہے کہ لقمان نبی تھے۔(اور کتاب التیجان میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے کہ لقمان نبی تھے مگر رسول نہیں تھے)، لیکن البدایۃ و النہایۃ اور مواہب الرحمن میں عکرمہؓ والی روایت کو ضعیف اور غیر ثقہ کہا گیا ہے۔ تفسیر القاسمی میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مندرج ہے کہ جمہور سلف کا قول ہے لقمان نبی نہیں تھے۔ جہاں تک ابن عباسؓ کا تعلق ہے البدایۃ و النہایۃ اور انبیائے قرآن میں انہیں سے ایک ایسی روایت بھی مذکور ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ لقمان نبی نہیں تھے اور نہ ان پر وحی نازل ہوئی۔ قرآن مجید نے لقمان کو حکیم کہا ہے اور وہ نصائح بیان کی ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹے کو دی تھیں۔ حکمت سے مراد علم صحیح مع عمل صحیح ہے۔ انہیں حکمت اور دانائی عقل و فراست کی بنا پر عطا ہوئی تھی۔ عرب قوم کو قرآن مجید نے بتایا ہے کہ تم صدیوں سے جس کی عقل و فراست کے قائل چلے آتے ہو وہ توحید کو مانتے تھے اور شرک کو ظلم عظیم قرار دیتے تھے۔ موعظت لقمانی میں توحید، عزم الامور اور مکارم اخلاق کی تعلیم شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی اور حد درجے کی مخفی باتیں بھی علم الٰہی سے مخفی نہیں۔ اس لیے کوئی بھی شخص مؤاخذے سے نہیں بچ سکتا۔ اختصار کے باوجود سورۂ لقمٰن میں دی ہوئی لقمان حکیم کی یہ پند و نصائح اس قدر وقیع اور جامع ہیں کہ ان پر عمل کرنا انسانی صلاح و فلاح کے لیے کافی ہے۔

البدایۃ و النہایۃ اور مواہب الرحمن میں حضرت لقمان کے بہت سے کلمات نصیحت دیے گئے ہیں۔ معارف القرآن میں بھی قرطبی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ وہب بن منبہؒ نے حضرت لقمان کی حکمت کے دس ہزار سے زائد ابواب پڑھے تھے۔

مآخذ: (۱) حفظ الرحمن سیوہاروی: قصص القرآن، کراچی ۱۹۷۲ء، ۳: ۳۴ تا ۴۸؛ (۲) جمیل احمد: انبیائے قرآن، مطبوعۂ لاہور، ص ۵۱۷ تا ۵۲۳؛ (۳) الزمخشری: الکشاف، مطبوعۂ بیروت؛ (۴) سید امیر علی: مواہب الرحمٰن، مطبوعۂ لکھنؤ؛ (۵) ابو الاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، مطبوعۂ لاہور؛ (۶) محمد شفیع: معارف القرآن، مطبوعۂ کراچی؛ (۷) ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، طبع ۱۹۶۶ء، ۱: ۱۲۳ تا ۱۲۹: (۸) عبدالماجد دریا بادی، تفسیر ماجدی، مطبوعۂ لاہور؛ (۹) احمد مصطفٰی المراغی: تفسیر المراغی، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۰) القرطبی: الجامع لاحکام القرآن: [۱۴: ۵۹]: (۱۱) محمد جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی: (۱۲) ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۶۷ تا ۶۹؛ (۱۳) ابن الأثیر: اسد الغابۃ، ۱۳۷۷ھ، ۲: ۳۷۸؛ (۱۴) سلیمان ندوی: ارض القرآن، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء، ۱: ۱۷۸ تا ۱۸۴؛ (۱۵) ابن ہشام: کتاب التیجان مع اخبار عبید، حیدر آباد دکن ۱۳۴۷ھ، ص ۶۹ تا ۷۸، ۳۵۷ تا ۳۷۰؛

(۱۶) : *Encyclopaedia Britannica*، بذیل مادّۂ Fables؛ (۱۷) : *Jewish Encyclopaedia*، بذیل مادّۂ Balaam؛ (۱۸) : *The Holy Bible*، اشاریہ اسمائے معرفہ برائے Balaam؛ [(۱۹) وجدی : دائرۃ المعارف، ۸ : ۳۷۰؛ (۲۰) الزبیدی : تاج العروس، بذیل مادّہ (۸ : ۳۷۰)؛ (۲۱) الثعالبی : ثمار القلوب، ۱۳۲۶ھ، ص ۹۷؛ (۲۲) امام مالک : الموطأ، کتاب طلب العلم، حدیث ۱؛ (۲۳) الدارمی : السنن، مقدمۂ باب: ۲۳] - [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

* أَقِط : رک بہ لُقْطَة.

* لَک : ۱- کرد قبائل کا گروہ جو ایران کے انتہائی جنوب میں آباد ہے۔ زین العابدین کے بیان کے مطابق (بستان السیاحۃ، تہران ۱۳۱۵ھ، ص ۵۲۲) ان کے نام (لک اکثر لکّ) کی تشریح فارسی لفظ لک (بمعنی لاکھ ۱۰۰۰۰۰) سے ہوتی ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ لک خاندانوں کی تعداد ابتدا میں یہی تھی۔ قبائل کے اس گروہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ قبیلۂ زَنْد کا سلسلۂ سلاطین انہیں سے شروع ہوا۔ لک جو اب شمالی لُورستان میں آباد ہیں، بعض اوقات لُور سے خلط ملط کر دیے جاتے ہیں (وہی مصنف) جو ان سے جسمانی اور نسلی اعتبار سے مشابہ ہیں، لیکن تاریخی واقعات سے ظاہر ہے کہ لک اپنے موجودہ مساکن میں اقصائے شمال سے آئے ہیں۔ او، من O. Mann کے بیان کے بموجب لکّی زبان میں، لُوری بولیوں کی نہیں، بلکہ کردی زبان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ''لُر اور لک مختلف زبانیں بولتے ہیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں'' (دیکھیے لُور؛ Čirikov : *Putewoi Journal*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۵ء، ص ۲۲۷).

شرف نامہ جلد اوّل، ص ۳۲۳، پر لک کا ذکر زَنْد کے ساتھ دوسرے درجے کے کُرد قبائل کے ضمن میں آیا ہے، جو ایرانی رعایا ہیں۔ Rabino کے قول کے مطابق لک شاہ عباس کے حکم سے لورستان میں آباد ہوئے تھے جو اس طریقے سے لُورستان کے نئے والی حسین خان کے لیے کسی قدر امداد و اعانت کا سامان پیدا کرنا چاہتا تھا جسے اس نے بوڑھے شاہ وَردی اتا بیگ کے رشتے داروں میں سے انتخاب کیا تھا (تاریخ عالم آراء، ص ۳۶۹) - ان قبائل میں سے ''سِلسِلہ'' پہلے ''ماہی دشت'' میں آباد تھا (کرمان شاہ کے جنوب مغرب میں)؛ ''قبیلۂ دِلفان'' جو ابودُلف [رک بہ القاسم بن عیسیٰ] سے اپنے آپ کو موسوم کرتا ہے، اس کی جاگیریں تیسری صدی عیسوی میں لُورستان کے شمال میں واقع تھیں (دیکھیے : سلطان آباد) زوھاب اور لُورستان کے ''باجلان'' بتاتے ہیں کہ وہ موصل سے آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ قبائل دراصل ایک ہی قبیلہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عباس کے عہد میں جب لورستان کے قبیلے کی شاخ لک کے ساتھ آ کر آباد ہوئی تو یہاں کے دورانِ قیام میں اس نے اپنی ''کُرمانجی'' بولی کے بجائے ''لکّی'' زبان اختیار کرلی۔ عہد شاہ عباس کے بعد بھی متعدد لک قبائل لُورستان سے باہر آباد تھے۔ زین العابدین (انیسویں صدی کے آغاز میں) لک قبیلوں کے ضمن میں زَنْد، مافی، باجلان اور زَندیی کالا (Zandi-yi-Kälä) (؟) کا ذکر کرتا ہے۔ کریم خان زَند جو پارِیا جدید پارہ، میں جو دولت آباد سے تقریباً ۲ میل سلطان آباد کی سڑک پر واقع ہے، پیدا ہوا (*Begele* : Houtum-Schindler) اسی آخرالذکر قبیلے سے تھا۔ کریم خان جب شیراز میں تھا، اس نے لک کے ''بَیْران وَنْد'' قبیلے کو بلا بھیجا۔ بَیْران وَنْد اور باجلان قبائل نے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں محمد خان زَنْد کے قاجاریوں سے اقتدار چھیننے کے اقدام میں اس کی سرگرمی سے مدد کی (H.J. Brydges : *A History of Persia*، لنڈن ۱۸۳۳ء، ص ۳۶، ۵۸؛ R. G. Watson : *A History of Persia*،

لنڈن ۱۸۶۶ء، ص ۱۱۶) - قاچاریوں کے دور میں متعدد لک قبائل منتشر کر دیے گئے، ''زَند'' قبیلہ اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے - ۱۸۳۰ء میں خانیکن کے قبیلۂ باجلان میں البتہ زَند قبیلے کے کچھ لوگ موجود تھے (خورشید اِفندی : سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، ص ۱۱۲، ۲۲۱ - دورا فرامان کے ضلع میں جو کرمان شاہ کے جنوب مشرق میں ہے، اب بھی زَند قبیلے کے کچھ خاندان ملتے ہیں (*R.M.M.*; *xxxviii*، ص ۳۹)، پشت کوہ کے ''عملہ'' قبیلے کا ایک حصہ قبیلۂ کریم خان کے اخلاف میں ہونے کا دعوٰی کرتا ہے - قبیلۂ مافی آج کل ورامین، تہران اور قزوین میں آباد ہے .

ایک عملہ فہرست کے مطابق جو Rousseau نے کرمان شاہ میں ۱۸۰۷ء میں مرتب کی (دیکھیے *Fundgruben d. Orients*، وائنا ۱۸۱۳ء، ۳ : ۸۵ - ۹۸) مذکورۂ ذیل کو لک قبائل شمار کیا گیا ہے : کلھور، مافی، نانکی، جلیل وَند، پاے وَند، کُلیائی، صوفی وَند، بہرام وَند، کرکوکی، تَوَلّی، زُبیر وَند، کاکُووَند، نامی وَند، احمد وَند، بہتوئی زولیا، حرسینی، شیخ وَند - روبینو اور او سن O. Mann اور Robino کے بموجب لُورستان کے لک قبائل مندرجۂ ذیل ہیں .

سلسلہ (۹ ہزار گھرانے)، دِلفان (۷۰۴ گھرانے)، ترْھان اَمْرائی (۱۵۸۲ گھرانے)، بیْران وَند (۶۰۰ گھرانے) اور دال وَند (۱۰۰۰ گھرانے) - یہ سب مل کر بالا گریوہ گروہ کا ایک حصہ بنتے ہیں اور مجموعی لحاظ سے ان کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار خیموں پر مشتمل ہے - بیْران وَند اور دال وَند، خُرّم آباد کے مشرق میں اس شہر سے گزرنے والی ندی کے منابع کے گرد آباد ہیں - ''سلسلہ'' اور ''دلفان'' علی الترتیب اَلیشتر اور خاوہ کے خوبصورت میدانوں میں بستے ہیں، ترھان (= شاید ترخان بہ معنی محاصل معاف) سیمرہ کے بائیں کنارے اور اس کے بائیں معاون کے جو خُرّم آباد سے آتا ہے، زیریں حصے میں آباد ہیں، وہ حصہ جس میں لک رہتے ہیں بہ شمول شمالی اور شمال مغربی لُورستان، بعض اوقات ''لکستان'' کہلاتا ہے .

لک قبیلوں کا باہمی اتحاد اس بات سے ظاہر ہے کہ ۱۹۱۴ء سے بھی پہلے سِلسِلہ، دِلفان اور ترھان، اَمْرائی قبیلے کے نظر علی خان کی ماتحتی میں متحد ہو گئے تھے، قبائلی اور لِسانی رشتوں کے علاوہ ہم مذہب ہونا بھی اتحاد کی ایک وجہ ہے کیونکہ دِلفان کے سب کے تْرھان اور قبیلۂ ''عملہ'' کے بہت سے گھرانے شیعیوں کے غالی فرقۂ اہلِ حق کے پیرو ہیں (دیکھیے سلطان اسحٰق).

مآخذ : (۱) E. Beer : *Das Turikh-i-Zendije*، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ص ۱۸، ۲۶؛ (۲) زین العابدین شیروانی : بستان السیاحۃ، طہران ۱۳۱۵ء، ص ۵۲۲؛ (۳) O. Mann : *Skizze d. Lurdialekte S. B. Ak. Wein*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۱۷۳ تا ۱۱۹۳؛ (۴) O. Mann : *Die Mundarten d. Lur-Stämme*، برلن ۱۹۱۰ء، ص ۲۲، ۲۳، لکی بولنے والے قبائل کی تعداد میں مصنف کرمان شاہ کے کلھور اور پشت کوہ کے ماکی قبیلے کا اضافہ کرتا ہے؛ (۵) Rabino : *Les tribus du Luristan*, *R.M.M.*، ۱۹۱۶ء؛ (۶) Minorsky : *Notes sur la secte des Ahl-i-Hakk*، *R.M.M.*، ۴۰ : ص ۵۶ : ۲ - قبیلۂ غازی قُمّی، بھی جو وسطی داغستان کے مشرقی قُوی - سُو پر آباد ہے اپنے آپ کو اس نام سے پکارتا ہے [رک بآں] اور Erckert : *D. Kaukasus und s. Volker*، لائپزگ ۱۸۸۷ء، ص ۲۴۸، تا ۲۵۷ اور Dirr : *Die heutigen Namen d. Kaukasischen Volker Peterm Mitteil*، ۱۹۰۸ء، ص ۲۰۳ تا ۲۱۲)، اس کے برعکس ارمنی زبان کا لیک (Lăk) اور جارجوی زبان کا لکی (جمع : لک - ابی [Lek-ebi]

داغستان کے لزگی/لگزی کے ہم معنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کورا کے پہاڑی لوگ جو سُمُر اور منابع سُمُر کے قرب و جوار میں رہتے ہیں، اس آخری نام سے پکارے جاتے تھے، بعد میں یہ سب داغستانیوں پر چسپاں ہوگیا ہوگا اگرچہ قاف کا کوئی قبیلہ اپنے آپ کو واقعۃً لزگی / لگزی نہیں کہتا۔ Marquart : *Beiträge z. Geschichte und Sage v. Eran, Z.D.M.G*، ۱۸۹۵ء نے عربی لفظ الکز کی یہ تشریح کرنی چاہی ہے کہ یہ لک یا لک پر فارسی لاحقہ زی کے اضافے سے بنا ہے، دیکھیے : سگ زی یعنی ''باشندۂ سیستان''۔

(V. MINORSKY)

لَکّادِیو : (لکادیپ، لکشن دیپ Laksha divi، ایک لاکھ جزیرے) مونگے کے جزیروں کا ایک مجموعہ جو ساحل مالا بار کے پرے ۸ درجے اور ۱۴ درجے شمال کے درمیان اور ۷۱ درجے ۴۰ ثانیے اور ۷۳ درجے مشرق کے درمیان واقع ہیں۔ یہ نام ساحل مالا بار کے رہنے والوں ہی کا دیا ہوا ہے اور غالباً اس میں جزائر مالدیو (مالدیپ) بھی شامل تھے۔ ان جزیروں کی مجموعی تعداد ۱۴۱ ہے جن میں سے پانچ غیر آباد ہیں۔ یہ جزیرے دو گروہوں میں منقسم ہیں، شمال کے آٹھ جزیرے جن میں امینی، کرد مت، کِلتان، چتلت کے آباد جزیرے شامل ہیں اور جنوبی جزیرے جن میں اگتّی، کَوَرتّی، اندروتھہ، کلپنی کے آباد جزیرے شامل ہیں۔ لکا دیو کے جنوب میں منی کوئی Minikoi کا علیحدہ جزیرہ ہے جو طبعی اعتبار سے نہ تو جزائر مالدیو میں شامل ہے، نہ لکا دیو میں، البتہ جزائر مالدیو سے قریب تر ہے۔ یہ جزیرے چھوٹے چھوٹے ہیں اور ان میں سے کسی کی چوڑائی بھی ایک میل سے زیادہ نہیں۔ ان سب کا مجموعی رقبہ (تقریباً ۸۰ مربع میل ہے۔ ان جزیزوں کے ہر حصے میں ناریل بکثرت پیدا ہوتا ہے، گو بعض قسم کے اناج دالیں اور کیلے وغیرہ کی پیداوار بھی ہوتی ہے لیکن چاول باہر ہی سے منگایا جاتا ہے۔ یہاں کا خاص پیشہ رسیاں بنانا ہے۔

جزائر لکا دیو کو ابتدا میں مالا بار کے ہندوؤں نے آباد کیا، لیکن کہتے ہیں کہ تیرھویں صدی میں یہاں کی آبادی ۱۸۳۹۳ کے قریب تھی اور جو زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے باشندے عادات و خصائل اور رسوم و رواج میں شمالی مالا بار کے موپلا لوگوں سے مشابہ ہیں لیکن ان کی عورتوں کی زندگی کا معیار اور حیثیت نسبۃً بلند ہے۔ وہ نہ پردہ کرتی ہیں، نہ مردوں سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ورثہ عورت کی جانب سے تقسیم ہوتا ہے۔ یہ لوگ پہلے راجہ کولی تُرائی کے فرمان بردار تھے، لیکن عملاً خود مختار تھے یہاں تک کہ سولھویں صدی میں راجا نے اپنے امیر البحر علی راجہ والیِ کنانور Kananor کو یہاں کی حکومت بخش دی اور اس کے جانشینوں اور وارثوں نے یہاں ۱۷۹۱ء تک حکومت کی۔ جب کنانور کو انگریزوں نے فتح کر لیا تو انتظامی قصد کے لیے شمالی حصے کو ضلع کنانور کے جنوبی حصے کے ساتھ ملا دیا گیا اور جنوبی حصے کو احاطۂ مدراس کے ضلع مالا بار میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) J. Stanley Gardiner : *The Fauna and Geagraphy of the maldive and Lacadive Archipelagoes*، کیمبرج ۱۹۰۱ء-۱۹۰۳ء؛ (۲) *Malabar Distt. Gazetteer*، مدراس ۱۹۰۸ء؛ *Imperial Gazetteer*، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء)۔

(T. W. HAIG)

لکھنؤ : ایک شہر اور ضلع کا نام جو بھارت کے صوبۂ اتر پردیش [صوبجات متحدۂ آگرہ و اودھ جس کا نام ۱۹۵۰ء میں اتر پردیش رکھا گیا دیکھیے (The Statesman's year-book، ۱۹۷۰ -

۱۹۷۶ء)] کا دارالحکومت ہے ۔ اس کا رقبہ ۹۷۶ مربع میل ہے ۔ یہ ضلع گنگا کی وادی میں واقع ہے، دریائے گومتی اسے سیراب کرتا ہے اور ساردا نہر کے نظام سے اس علاقے کی آبپاشی ہوتی ہے ۔ لوگ عام طور پر زراعت پیشہ ہیں ۔ گندم، چاول، چنا، باجرا، تل، جو، گنا اور موٹا اناج منڈوا وغیرہ پیدا ہوتا ہے ۔ لکھنؤ، ملیح آباد، کاکوری اور امیٹھی اس کے خاص شہر اور قصبے ہیں ۔

شہر لکھنؤ کی آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق پانچ لاکھ تھی جس میں چھاونی کا رقبہ بھی شامل ہے ۔ یہ شہر گومتی کے کنارے آباد ہے اور نئی دہلی سے ۲۶۰ میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے ۔ پہلے یہ شہر نوابان اودھ کا پائے تخت تھا اور اب صوبائی حکومت کا صدر مقام ہے ۔ اس میں بڑی شاندار اور خوبصورت عمارتیں ہیں اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک اہم ثقافتی مرکز ہے ۔ کاغذ، جوتے، دوائیں، بجلی کا سامان، سگریٹ تانبے اور پیتل کے برتن بنانا یہاں کی کی بڑی صنعتیں ہیں ۔ اس کے علاوہ زر دوزی کا کام مٹی کے کھلونے اور چمڑے پر نقش و نگار بنانا بھی یہاں کی خاص خاص دستکاریاں ہیں ۔

اسلامی حملوں سے پہلے اس شہر کے تاریخی حالات معلوم نہیں بلکہ اس کے نام کے ماخذ بھی غیریقینی ہیں گو اس نام کا پہلا حصہ ''لکھ'' لکشمن یعنی لچھمن کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے ۔ اس کا قدیم ترین حصہ لچھمن ٹیلا ہے جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شیخوں نے آباد کیا تھا ۔ اس سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شاہ مینا ؒ نے جن کا وصال ۱۴۷۸ء میں ہوا، بڑی شہرت پائی اور آپ کا مزار آج بھی مرجع خواص و عوام ہے ۔ لکھنؤ کو دہلی کے سوری بادشاہوں کے زمانے میں اہمیت حاصل ہونا شروع ہوئی، ۱۵۲۶ء میں ہمایوں نے اس پر قبضہ کیا اور پھر ۱۵۲۸ء میں بابر نے اسے فتح کیا ۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں یہ ایک سرکار (صوبہ) کا صدر مقام تھا ۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سعادت خان (۱۷۲۴ء) نے یہاں نواب وزیران اودھ کا خاندان قائم کیا جو پہلے خود مختار والیوں کی حیثیت سے اور بعد میں ۱۸۵۶ء تک بطور شاہان اودھ یہاں حکمران رہے ۔ سعادت خان ایران کا ایک شیعی سید اور حکومت مغلیہ کا ایک وزیر تھا ۔ اس نے لکھنؤ کے شیوخ کے اقتدار کو ختم کر دیا لیکن اپنا صدر مقام فیض آباد ہی میں رکھا ۔ اس نے اپنے خاندان کا امتیازی نشان مچھلی کو قرار دیا ۔ اس شہر کی شان و شوکت کو نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے عہد میں چار چاند لگے ۔ یہ اس خاندان کا چوتھا حکمران تھا ۔ اس کی سخاوت کی داستانیں ضرب المثل بن گئی ہیں ۔ اس کا عہد حکومت گویا لکھنؤ کے لیے عہد زرین تھا جسے اس نے فیض آباد کے بجائے اودھ کا پائے تخت بنایا تھا ۔ خوبصورت وکٹوریا پارک (۱۸۸۷ء) کے مشرق میں خوبصورت عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے، یعنی رومی دروازہ، بڑا امام باڑہ اور ایک مسجد ۔ یہ سب عمارتیں آصف الدولہ ہی نے تعمیر کرائی تھیں ۔ دوسری اور تیسری عمارت مچھی بھون یا پرانے قلعے میں ہے ۔ یہاں لچھمن ٹیلا بھی ہے جس کے اوپر اورنگ زیب کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ہے، لیکن شہر کی شان اصل میں بڑے امام باڑے کے دم سے ہے ۔ اس زمانے کی یادگار مارٹینئر سکول بھی ہے ۔ یہ عمارت جنرل کلاڈ مارٹن Genl. Claud Martin نے پہلے تو اپنے رہنے کے لیے تعمیر کرائی تھی بعد میں اسے سکول میں تبدیل کر دیا ۔

سعادت علی خان (۱۷۹۷ تا ۱۸۱۴ء) نے سکندرہ باغ اور ''دلکشا'' محل تعمیر کرایا ۔ وہ اور اس کے جانشین اس شہر کے مضافات کو اپنی

یادگاروں، باغیچوں اور دیہاتی سیرگاہوں سے سجاتے رہے ۔ اس دور کے شاندار طرز تعمیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک اسلامی فن تعمیر انحطاط پذیر ہو چکا تھا ۔

غازی الدین حیدر نے شاہ اودھ کا لقب اختیار کیا ۔ اس نے چھتر منزل کے محلات تعمیر کرائے اور شاہ نجف کا مقبرہ بھی بنوایا ۔

محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء) نے حکومت کے نظام میں اصلاحات نافذ کیں اور بعض اقتصادی اقدامات کے ذریعے اپنے خاندان کی حکومت کو دو اور نسلوں تک تباہی سے محفوظ کر لیا ۔ حسین آباد کی عمارتیں اسی کی یادگار ہیں ۔ اس کے بیٹے امجد علی شاہ کے دور میں پرانی برائیاں اور بداعمالیاں خود کرائیں اور اس طرح ملک کی حکومت پوری طرح مفلوج ہو کر رہ گئی ۔

واجد علی شاہ (۱۸۴۷ تا ۱۸۵۶ء) اودھ کا آخری تاجدار تھا ۔ اس نے قیصر باغ کا محل تعمیر کرایا جو استرکاری، منقش اور رنگین اینٹوں کی عمارت کا اچھا نمونہ ہے ۔

اس دور کی بدانتظامی اور شاہ خرچیوں کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی، آخر یہ نتیجہ نکلا کہ صوبۂ اودھ کا الحاق ۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت سے ہو گیا ۔ اس وقت لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند تھے ۔ لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بعض ہولناک اور خونریز لڑائیاں ہوئیں جو مقامی ریذیڈنسی کے شجاعانہ دفاع کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رہیں گی ۔

موجودہ مقامی حکومت نے لکھنؤ کی ترقی اور خوش حالی کو بحال کیا ہے اور اب لکھنؤ اور اس کے مضافات کو شمالی ہند کا خوبصورت ترین شہر سمجھا جاتا ہے ۔ اردو ثقافت کا مرکز ہونے کی حیثیت سے یہ شہر دبستان دہلی کا حریف ہے ۔ علم و فضل کا مرکز ہے اور تعلیم نسوان کے لیے یہاں غیر معمولی سہولتیں موجود ہیں ۔ بادشاہ باغ میں کیننگ کالج ۱۸۶۴ء سے قائم ہے ۔ کنگ جارج میڈیکل کالج ۱۹۱۰ء میں جاری ہوا ۔ یہ کالج اور عورتوں کا ازیبلا تھاربرن کالج یونیورسٹی سے ملحق ہیں جس کی تشکیل ۱۹۲۱ء میں ہوئی ۔ ثانوی مدارس میں کولون سکول اور ریڈ کرسچین کالج قابل ذکر ہیں، صوبائی عجائب خانہ بھی لکھنؤ ہی میں ہے ۔ یہاں کی چھاونی اتر پردیش میں سب سے بڑی چھاونی ہے ۔ یہ شہر ریلوے کا مرکز ہے اور اودھ روہیل کھنڈ ریلوے کا صدر مقام بھی ہے ۔ کسی زمانے میں یہاں زری اور نقرئی بروکیڈ، ململ اور زردوزی کا کام ہوتا تھا، لیکن دوسرے شہروں کی طرح مقامی صنعت و حرفت اب زوال پذیر ہے ۔

مآخذ: (۱) لکھنؤ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۰۴ء؛ (۲) E.H. Hilton: *Guide to Lucknow*، مطبوعۂ لکھنؤ ۱۹۰۲ء؛ (۳) S. C. Hill: *The life of Claud Martin*، کلکتہ ۱۹۰۱ء؛ (۴) Sleeman: *A Journey through the kingdom of Oude*، لندن ۱۸۵۸ء؛ (۵) J. J. McLeod Innes: *Lucknow and Oude in the mutiny*، لندن ۱۸۹۵ء، ۱۹۰۰ء؛ (۶) مردم شماری رپورٹ ۱۹۰۱ء.

(R. B. WHITEHEAD)

تعلیقہ: لکھنؤ کی آبادی کے تین نمایاں مرکز ہیں ۔ مغربی سمت کا مرکز چوک کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ شہر کا قدیم ترین حصہ ہے ۔ اس کی بنیاد نوابان اودھ نے رکھی تھی ۔ درمیانی علاقے کا مرکز امین آباد ہے ۔ مشرقی سمت میں تیسرا مرکز ''حضرت گنج'' کے نام سے موسوم ہے ۔

''چوک'' میں صرافوں اور جوہریوں کی دکانیں ہیں ۔ پاندانوں اور خاصدانوں اور مصنوعی آرائشی چیزوں کی دکانیں بھی ہیں ۔ یہاں کی عطریات اور ⊗

قواموں کی دکانیں بہت مشہور ہیں ۔ ان کے علاوہ سبزیوں اور پھلوں کی وسیع و عریض منڈیاں ہیں ۔

امین آباد کو پورے شہر کا مرکز اعصاب سمجھنا چاہیے ۔ یہ مرکز صنعت و تجارت کی وجہ سے مشہور ہے ۔ یہاں سے شہر بھر کے تمام گوشوں کو سڑکیں نکلتی ہیں۔ صبح سے رات گئے تک لوگوں کا ہجوم رہتا ہے ۔ زنانہ بنائی کے کپڑوں اور زر دوزی کے کاموں کی وجہ سے یہ بہت مشہور ہے ۔

حضرت گنج، شہر کا جدید حصہ ہے ۔ اس علاقے میں ہر قسم کی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز حضرت گنج ہے۔ یہاں بنکنگ اور انشورنش کا وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا ہے ۔ جدید طرز کے ہوٹل، بار، ریستوران اور قہوہ خانے ہیں ۔ ہر قسم کی فیشن ایبل چیزیں یہاں دستیاب ہوتی ہیں ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رادھا مکرجی و بلجیت سنگھ : *Social profiles of a Metropoles Social and Economic Structure of Lucknow Capital of Uttar pradesh*، لنڈن، ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۶ء، ص ۵، ۷ ۔

نوابان اودھ کے عہد کی تہذیب و ثقافت کے لیے لکھنؤ کو بہت شہرت حاصل رہی ہے ۔ یہ کبھی ملک کا دارالحکومت تو نہ ہو سکا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنؤ علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایے تخت رہا ۔ فرنگی محل کا علم و فن کا وہ خاندان لکھنؤ میں منتقل ہوا جس نے اشاعت علوم و فنون میں بڑی ناموری حاصل کی تھی ۔ ندوۃ العلماء ایسے شہرۂ آفاق دارالعلوم کی بنیاد بھی یہیں رکھی گئی ۔ زبان اردو کے سلسلے میں سلیمان ندوی لکھتے ہیں : ''ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دہلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب و سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا . . . ۔ محاورات کی نزاکت الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کی وضع وتالیف کا جو اہم کام گزشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اسی کا اثر ہے کہ اس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا'' (نقوش سلیمانی، کراچی، ص ۷۸) ۔ پھر انیس و دبیر نے، جو اردو کے مشہور شاعر اور مرثیہ نویس تھے، یہیں زبان کا سکہ بٹھایا ۔ ناسخ نے زبان کی لطافت و نزاکت میں بڑا کام کیا ۔ سید انشاالله خان نے دریاے لطافت کا سیل لکھنؤ کی زمین ہی میں بہایا ۔ ان کے علاوہ ادبا نے اردو زبان کی ترقی کے لیے بہت اہم کتابیں تصنیف کیں، جو آج بھی اردو زبان کا گرانقدر سرمایہ ہیں ۔

شاہان اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں ایک دارالترجمہ قائم تھا ۔ نئے علوم و فنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہو کر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں ۔ اس ادارے کے زیر اہتمام مختلف علوم پر متعدد رسالے بھی شائع ہوتے تھے (نقوش سلیمانی، ص ۸۲، ۸۳) ۔ ان کے علاوہ لکھنؤ کو اس لحاظ سے بھی اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ داستان گوئی نے یہاں مستقل فن کی حیثیت حاصل کی ۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، نوشیروان نامہ، ایرج نامہ، فسانۂ عجائب، امانت کی اندر سبھا، وغیرہ میں مصنفوں نے ہزاروں صفحات میں خیال، ادب اور زورِ بیان کا طلسم کھڑا کیا ۔ نظم میں مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں جواہر پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ناولوں کی ایجاد و تخلیق کے لیے لکھنؤ کی زمین موزوں ثابت ہوئی ۔ سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن اور رسم و رواج اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص طبقے کی خصوصیات بیان کی ہیں ۔ سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد، شرر کی فردوس بریں اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔

لکھنؤ میں ماہ محرم کے عشرۂ اول میں

سید الشہدا کی مرثیہ خوانی اور تعزیہ داری انتہائی جوش و احترام سے کی جاتی ہے۔ لکھنؤ کی مرثیہ خوانی نے پورے ملک میں یہ تسلیم کرا لیا کہ شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ دیگر اصناف سخن میں بہت ممتاز ہے۔ لکھنؤ میں متعدد امام باڑے ہیں۔

مطابع: کتابوں کی نشر و اشاعت میں مطابع منبعوں کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ذیل کے مطابع کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں:۔ مطبع سلطانی، مطبع محمدیہ، مطبع مصطفائی، مطبع محمدی، مطبع جعفریہ، مطبع امینی، مطبع صدیقی۔ ان کے بعد نولکشور نے اپنا پریس قائم کیا (۱۸۵۸ء)۔ اس ناشر نے مشرقی علوم کی ضخیم اور بکثرت کتابیں شائع کیں۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ ہماری زبان کی اکثر نایاب علمی و ادبی کتابیں اس مطبع میں طبع ہوئیں۔

اودھ کا دارالحکومت جب فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل ہوا تو ملک کے نامور شعرا میر، سودا، انشا، جرأت اور مصحفی نے ادھر کا رخ کیا۔ میر انیس کا خاندان تو پہلے ہی سے دہلی سے لکھنؤ آچکا تھا، ان کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار اور اہل علم کی محفلیں شعر و سخن سے پر رونق ہو گئیں (یہ مندرجات تحریر مقالہ کے وقت تک کے ہیں)۔

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں [مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* لکھنوتی: رک بہ گوڑ۔

⊗ لکیاری سادات: سندھ میں وارد ہونے والے سادات کا پہلا خانوادہ۔ اس خاندان کے جد اعلیٰ سید علی بن عباس غالباً چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سندھ پہنچے۔ تحفۃ الکرام میں ان کا شجرۂ نسب اس طرح درج ہے: سیّد علی بن سیّد عباس بن سیّد حسین بن سیّد ارشد بن سیّد زید بن سیّد جعفر بن سیّد عمران بن سیّد ہارون بن سیّد عبداللہ اشرف بن قاسم بن عبداللہ بن امام موسیٰ کاظمؑ۔ سیّد علی مکی اکابر شیوخ اور اولیاے کبار میں تھے۔ خلیفہ نے انھیں سامرے سے ایک سو فوجی سپاہیوں کے ساتھ ایک بدکردار سردار دلو راے کی گوشمالی کے لیے سندھ بھیجا، جس کی شکایت اس کے چھوٹے نو مسلم بھائی چھٹو بن آمر نے کی تھی۔ دلو راے اپنے افعال بد سے تائب ہو کر پشیمانی کے ساتھ سیّد علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بیٹی کو ان کے عقد میں دے دیا جس کے بطن سے چار فرزند سیّد محمد، سیّد مرادیہ، سیّد حاجی عرف بھرکیو اور سیّد چنگو پیدا ہوے۔ سیّد علی پرگنۂ سیوستاں ضلع دادو میں بھگے توڑے نامی پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے ایک پر فضا اور خاموش بستی میں سکونت پذیر ہوے، جو ان کے نام پر ''لک علوی'' کے نام سے مشہور ہوئی اور ان کی اولاد لکیاری سادات کہلائی۔ لکیاری سادات بڑے صحیح النسب ہیں اور اب تک اپنی لڑکیوں کا رشتہ دوسرے سادات میں نہیں کرتے۔

سیّد علی کے پہلے فرزند سیّد محمّد کے بیٹے سیّد صدر الدّین الملقب بہ شاہ صدر تھے۔ سندھ میں سلسلۂ قادریہ کے شیوخ میں ان کا بڑا دخل ہے۔ سٹیشن لکی شاہ صدر کے متصل ان کا مقبرہ ہے۔ کہتے ہیں نادر شاہ نے ان کا روضہ تعمیر کرایا تھا۔ شاہ صدر کے ایک نواسے سید محمد تھے، درود شریف کا پڑھنا ان کا معمول تھا۔ ایک نواسے سید محمد شجاع تھے۔ نقشبندیہ سلسلے کے نامور صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔

میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں شاہ صدر کی اولاد میں سے بہت سے بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت سیّد علی کے چوتھے فرزند سیّد چنگو کا ایک بیٹا تھا۔ ان کی اولاد بھی بڑی پھیلی اور سندھ کے مختلف علاقوں میں جا آباد ہوئی۔ ان میں سے سیّد کہیر ٹھٹھے جا پہنچے۔

لکیاری سادات میں سے ایک بزرگ سیّد محمّد بقا تھے جن کی ولادت ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء میں رسول پور علاقۂ ریاست خیر پور میں ہوئی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ سلسلوں سے فیض یاب ہوے۔ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء میں شہید ہوے اور قصبۂ شیخ طیّب ریاست خیر پور میں مدفون ہوے۔ ان کے اٹھارہ فرزندوں میں سے پیر سیّد محمّد راشد علم و فضل میں باکمال ہونے کے علاوہ فقر و تصوف میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہوے۔ ان کا فیض سندھ سے باہر جودھ پور، جیسلمیر اور دوسرے علاقوں میں بھی پہنچا۔ انھوں نے ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں شہادت پائی۔ ان کے متعدد خلفا تھے۔ امروٹ شریف کے بزرگوں کو ان کے خلفا کی وساطت سے فیض پہنچا اور امروٹ شریف کو برصغیر کی تاریخ میں یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی جیسے دینی اور سیاسی مفکر وہاں کے فارغ التحصیل تھے۔ پیر محمّد راشد کی اولاد راشدی کہلائی۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ پہلے پیر پگارا ان کے سجادہ نشین بنے۔ سید احمد شہید ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء میں ان کی دعوت پر سندھ میں ان کے گھر پیر گوٹ گئے تھے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف حرّ تحریک شروع کر رکھی تھی، اسی لیے وہ سید احمد شہید کی تحریک آزادی میں ہر طرح مدد کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ کے ایک بھائی پیر محمد یاسین، جھنڈا یا علم لے کر دوسری جگہ چلے گئے اور پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور ہوے۔ ''پیر جھنڈا'' کا کتابخانہ سندھ کا نہایت نادر علمی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ پیر گوٹ کا کتابخانہ بھی بڑا نادر تھا۔ عہد حاضر کے مشہور محقّق اور مؤرخ پیر حسام الدّین راشدی اور معروف صحافی پیر علی محمد راشدی بھی پیر محمد راشد کی اولاد میں سے ہیں۔

ظاہر ہے سادات لکیاری کا خاندان بڑا گرامی قدر ہے۔ اس سے سارا سندھ مستفیض ہوا۔ بالائی اور زیریں سندھ میں اس کی وجہ سے متعدد خانقاہیں قائم ہوئیں، جن میں سے ہر ایک کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔

مآخذ: (۱) علی شیر قانع: تحفۃ الکرام، ترجمۂ اردو کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۵؛ (۲) اعجاز الحق قدوسی: تذکرہ صوفیائے سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء ص ۱۰۸ تا ۱۱۵، ۲۶۳ تا ۲۷۷؛ (۳) غلام رسول مہر سید احمد شہید، ص ۲۹۸ تا ۳۰۵، ۳۰۸ تا ۳۱۰؛ (۴) حسام الدین راشدی: مقالۂ سادات لکیاری در مہران شاہ صدر نمبر، ۲۷ جنوری ۱۹۵۸ء۔ [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

لله عارفه: [اس کتاب میں اس کو شامل کرنے کا جواز یہ ہے کہ صوفیۂ کشمیر کے تذکروں میں اس کا ذکر مسلم اولیا کے ساتھ ساتھ ملتا ہے] ۔ للہ عارفہ ۷۳۵ھ/ ۱۳۳۵ء میں (بعہد راجہ ادیان دیو، ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء تا ۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء) سرینگر سے چار پانچ میل جنوب مشرق میں واقع ایک گاؤں پنڈریتھن میں پیدا ہوئی، جو قدیم زمانے میں اشوک کا

دارالحکومت تھا ۔ عبدالوہاب شائق کہتا ہے :

فزون بود بر ہفت صد سی و پنج
ز ویرانۂ شد پدیدار گنج

للّہ کے والدین متوسط درجے کے زمیندار تھے ۔ انھوں نے بچی کا نام لل ایشوری رکھا اور ہندوؤں کے دستور کے مطابق اس کی شادی صِغر سنی ہی میں پانپور کے ایک برہمن زادے سے کر دی، مگر یہ شادی اس کے حق میں اچھی ثابت نہ ہوئی ۔ وہ گھر کے سارے کام کاج کرتی، دریا سے پانی لاتی، برتن، کپڑے دھوتی، دھان کوٹتی، باریک سے باریک سوت کاتتی، مگر اس کی ساس کسی طرح خوش نہ ہوتی ۔ وہ اس کے پھوہڑ پن کی شکایت بیٹے سے کر کے ناحق اسے پٹواتی اور ناروا سختیوں سے اس کا ناک میں دم کر دیتی، یہاں تک کہ بھوکوں مارنے سے بھی دریغ نہ کرتی ۔ ان سب باتوں کے باوجود للّہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی.

یہ سختیاں اور تلخ کلامیاں اس کے لیے مفید ثابت ہوئیں ۔ طعن و تشنیع برداشت کرنے، بھوکا رہنے اور دکھ سہنے سے اسے نفس کشی کی عادت ہوگئی، توکل و استغنا کی قوت بڑھتی گئی، وجدان بیدار ہوتا گیا اور اسے اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس ہونے لگی ۔ اس نے اپنی اس کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے :

''یہ کیا تھا اور کیا ہوگیا؟ میرے لیے ہر بات الٹی ہو گئی ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کنارے لگوں گی ۔ مجھے چھت بنوانے کے لیے ایک ناتجربہ کار بڑھئی ملا [؟ اشارہ غالباً شوہر کی طرف ہے] ۔ یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ اس طرح میں اپنے آپ کو پہچان لوں گی''.

اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ۔ وہ ان فکروں اور سوچوں میں کھو جاتی :

''میں کہاں سے آئی؟ کس راہ سے آئی، کس راستے سے جاؤں؟ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا ۔ ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتی ہوں، مگر مجھے اپنی حالت کا کچھ پتا نہیں چلتا''.

آخر ایک دن اسے عرفان نفس حاصل ہوگیا اور وہ پکار اٹھی : ''میں نے اپنے نفس کو مارا، جس سے میرے اندر کا چراغ روشن ہوگیا ۔ مجھے اپنی اصلیت معلوم ہوگئی ۔ اندر کی چمک باہر نکل آئی اور میں نے اندھیرے میں اسے پا لیا ۔ حق نے مجھے ایک حرف پڑھنے کو کہا اور فرمایا ۔ اندر آ باہر نہ رہ ۔ جب میں اندر آئی تو اس نے اپنا راز مجھ پر فاش کر دیا ۔ میں آپے میں نہ رہی، اچھل اچھل کر رقص کرنے لگی اور ظاہری و باطنی اسرار سے واقف ہو کر پھولی نہ سمائی''.

جب دوئی کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا اور دل کے روشن آئینے میں اس کا عکس پڑا تو اسے معلوم ہوا کہ وہی سب کچھ ہے، میں تو کچھ بھی نہیں ۔ اس کے بعد دنیا اس کی نظروں میں ہیچ تھی ۔ اب اسے مرنے کی خواہش تھی نہ جینے کی آرزو ۔ اس حالت میں اس سے چند خارق عادت باتیں ظہور میں آئیں، جن کی بدولت وہ ساری بستی میں مشہور ہو گئی ۔ ہر کہ و مہ کی زبان پر اس کی مظلومی اور اس کی ساس کی سختی کا تذکرہ رہنے لگا ۔ عورتیں دور دور سے اس کی زیارت کو آتیں اور گاؤں میں میلا سا لگ جاتا، مگر وہ اپنی ہی دھن میں مست رہتی ۔ وہ ہجوم سے گھبراتی، تنہائی کو پسند کرتی، آپ ہی آپ گنگناتی اور ایسی باتیں کرتی کہ

سننے والے دنگ رہ جاتے، کوئی مجھے گالی دے کوئی میری غیبت کرے یا قسم قسم کے خوبصورت پھول مجھ پر نثار کرے - میں علم حقیقت کا آب حیات پی کر توانا ہو گئی ہوں - اب نہ کسی بات سے خوش ہوتی ہوں، نہ رنجیدہ .

''مجھ کو لوگوں نے بدنام کیا، لیکن مجھ پر ان تہمتوں کا کیا اثر ؟ میں تو ماگھ کے مہینے میں ٹھنڈے پانی سے نہانے والی اور اساڑھ میں تپتی آگ کی گرمی برداشت کرنے والی ہوں''.

آخر اسے اپنے جذبے پر کوئی اختیار نہ رہا - وہ علائق دنیا سے کنارہ کش ہو کر جوش جنون میں جنگلوں اور بیابانوں میں سرگرداں رہنے لگی - کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا، نہیں تو فاقوں سے وقت گزار لیا - اس کے دل کو کہیں قرار نہ تھا، وہ کسی رہنما کی تلاش میں کبھی پہاڑوں سے سر ٹکراتی، کبھی ویرانوں کی خاک چھانتی، کبھی دور دراز کا سفر اختیار کرکے متبرک مقامات کی زیارت کرتی، کبھی پرندوں کے نغمے سننے کے لیے راہ میں بیٹھ جاتی، کبھی مستانہ وار اٹھ کھڑی ہوتی اور نعرے لگاتی اور جذب و کیف میں اتنی محو ہو جاتی کہ اسے اپنے تن بدن کی بھی سدھ بدھ نہ رہتی - اس کے اقوال میں پٹن، مٹن، ہر مکھ گنگا، کوثر ناگ اور سمیرو پہاڑ کا ذکر اکثر آتا ہے .

ان دنوں راجگان ہنود کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا - حکومت بدل رہی تھی اور کشمیر ہزارہا سال کے ہندو راج کے بعد مسلمان سلاطین کے زیر نگیں آنے کے لیے ایک انقلاب سے گزر رہا تھا - دیکھتے ہی دیکھتے ہندو راج کی بساط الٹ گئی اور کشمیر پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا - لَلّہ نے یوں تو بعض اور مسلمان بادشاہوں کا زمانہ بھی دیکھا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز سلطان علاء الدین کے زمانے میں ہوا - تاریخ اعظمی میں لکھا ہے : ''ظہورش در زمان سلطان علاء الدین بود -'' تاریخ جدولی کشمیر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے - ۷۷۳ھ / ۱۳۷۱ء میں مشہور روحانی بزرگ سیّد حسن سمنانی، جن کا مزار کولگام میں ہے، کشمیر میں وارد ہوے تو لَلّہ ان کی تعلیمات وحدت و محبت سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ وہ بےشمار دیوتاؤں کے بجاے ہر جگہ ایک ہی ذات کا جلوہ دیکھنے لگی - وہ ہر مخلوق کو خالق کی نعمتوں سے متمتع ہونے کا حقدار سمجھتی اور کہتی : ''کیا سورج دنیا کی ہر چیز کو روشن نہیں کرتا؟ کیا وہ صرف اچھے اچھے شہروں کو روشنی پہنچاتا ہے ؟ کیا ہوا ہر گھر میں داخل نہیں ہوتی ؟ یہی اشارہ کافی ہے، اس اصول کو سمجھو''.

اسی زمانے میں مخدوم جہانیاں جہان گشت سید جلال الدّین بخاری اور امیر کبیر سید علی ہمدانی بھی وارد کشمیر ہوے اور لَلّہ ان کے فیوض سے بھی مستفیض ہوئی - اب اس کے نزدیک اپنے پرائے سب برابر تھے - وہ ہندو مسلمان کی تمیز چھوڑ کر انسانی رشتے کو دیگر تمام رشتوں سے افضل جانتی تھی اور قادر مطلق کی خواہش کے سوا باقی تمام خواہشوں کو نجات اور مکتی کا دشمن تصور کرتی تھی - وہ بت پرستی کے خلاف تھی اور لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے کی تلقین کرتی تھی.

اس کے ایسے ہی صوفیانہ خیالات کی وجہ سے لوگ اسے مسلمان سمجھنے لگے - وہ رسم و رواج کے ظاہری امتیازات کی تنگ حدود سے نکل گئی تھی - ہندو اسے لَل ایشوری

یا لَل یوگیشوری اور مسلمان لَل دَدی یا لَل مَاجی کہتے تھے، جس کے معنی ہیں بزرگ ماں؛ مگر عام طور پر وہ لَلّہ ہی کے نام سے مشہور ہے، جو کشمیر میں پیار کا لفظ سمجھا جاتا ہے۔

بابا کمال الدین ریشی نامہ (نور الدین نامہ) میں لکھتے ہیں کہ شیخ نور الدین ولی نے کشمیری زبان میں ایک مناجات لکھی ہے، جس میں چند خدا رسیدہ بزرگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد خدائے تعالیٰ سے ان کی همسری کی التجا کی ہے۔ اس مناجات میں انھوں نے لَلّہ عارفہ کی بھی تعریف کی ہے اور اسے ارباب معرفت میں شمار کیا ہے۔

لَلّہ ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء میں ہیرا پور کے مقام پر امیر کبیر سیّد علی ہمدانیؒ سے ملی۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس نے بیج بہاڑہ میں وفات پائی، جو سرینگر سے ۲۸ میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔

لَلّہ کے اقوال کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ سر جارج گریرسن اور بارنٹ نے پنڈت مکند رام شاستری کی مدد سے کشمیری پنڈتوں کی یادداشتوں کی بنا پر جو اقوال جمع کیے تھے، ان سے پتا چلتا ہے کہ ہندو مت کے یوگ فلسفے کا رنگ اس پر غالب تھا، مگر بعض دوسرے مجموعوں میں ایسے اقوال بھی موجود ہیں، جو خالص اسلامی متصوفانہ خیالات کے حامل ہیں، غالباً اسی بنا پر لَل واک کے انگریز شارح سر رچرڈ سی ٹمپل نے لکھا ہے کہ لَل دَدی کے کلام میں تصوف کی جو چاشنی پائی جاتی ہے، وہ زیادہ تر سیّد علی ہمدانی اور بعض دوسرے صوفیۂ کرام کی ملاقاتوں اور صحبتوں کا نتیجہ ہے۔ عبداللہ یوسف علی اپنی کتاب ''تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات'' میں صفحہ ۸۲ پر لکھتے ہیں:

''جس مذہبی تحریک کے باعث جدید شو مَت صوفیوں کے نقشبندی سلسلے کے قریب آ گیا، اس کی اعلیٰ مثال کشمیر کی مجذوبہ لَلّہ کی تصنیف میں موجود ہے۔ لَلّہ چودھویں صدی عیسوی میں ہوئی ہے، جب کہ اس کے اپنے وطن میں اسلام کی کشش عالمگیر ہو رہی تھی''۔ اس کی تصنیف کے اس عالمانہ ایڈیشن (لل واکیانی) کے علاوہ، جو سر جارج گریرسن نے مرتب کیا ہے، ایک منظوم انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے، جو سر رچرڈ ٹمپل نے شائع کیا ہے۔ انھوں نے اس پر نہایت قیمتی مقدمہ بھی لکھا ہے، جس سے ہندوستان کی چودھویں صدی عیسوی کی مذہبی فضا پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

ان ترجموں کے علاوہ ایک ترجمہ اردو زبان میں بھی ہوا ہے، جو واکھیہ للی ایشوری کے نام سے مقبوضہ کشمیر میں ملتا ہے۔

مآخذ: (۱) محی الدّین مسکین: تاریخ کبیر کشمیر (تحائف الابرار)، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء؛ (۲) محمد شاہ سعادت مفتی: کشمیری صالحات (قلمی)؛ (۳) محمد سیف الدین کاشمیری: تاریخ جدولی کشمیر (موجز التواریخ)، امرتسر ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء؛ (۴) عبدالوہاب شائق: ریاض الاسلام (شاہ نامۂ کشمیر، یعنی منظوم تاریخ کشمیر کا وہ حصّہ جو بزرگان کشمیر کے حالات پر مشتمل ہے) تصنیف ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء (غیر مطبوعہ)؛ (۵) خواجہ محمد اعظم دیدہ مری: واقعات کشمیر (تاریخ کشمیر اعظمی)، تصنیف ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء، لاہور ۱۸۸۶ء، سرینگر ۱۹۳۶ء؛

(۶) بابا داؤد مشکواتی: اسرار الابرار (۱۰۶۳ھ)؛ (۷) بابا کمال الدین ریشی: نورالدین نامہ (منظوم حالات شیخ نورالدین ولی)، تصنیف ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء مخطوطۂ مملوکۂ پیر غلام احمد مہجور)؛ (۸) محمد الدین فوق: لـلـہ عارفہ، لاہور ۱۹۲۹ء؛ (۹) وہی مصنف: خواتین کشمیر، سرینگر ۱۹۴۰ء؛ (۱۰) محمد عبداللہ قریشی: آئینۂ کشمیر، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۱۱) Sir Richard Temple: *The world of Lalla, The Prophetess*، کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۲۴ء؛ (۱۲) پنڈت آنند کول: *Lalla Yogeshwari*، لاہور ۱۹۴۲ء؛ (۱۳) Grierson و Barnett: *Sayings of Lalla*؛ (۱۴) Dr. G. M. D. Sufi: *Kashir*، ج ۲، لاہور ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء.

(محمد عبداللہ قریشی)

لَمْتُونہ: صَنہاجہ کی نسلی برادری کا ایک بڑا بربر قبیلہ، جو خیموں میں رہتا تھا اور مراکش کے جنوب کی طرف صحرا میں ان دوسرے قبیلوں کے ساتھ بدویانہ زندگی بسر کرتا تھا جو اپنے چہروں پر لثام [رَکّ بان] یعنی نقاب ڈالے رہتے تھے [مُلَثَّمون].

لمتونہ نے جو شروع میں بت پرست تھے، مسلمان ہونے کے بعد گرد و پیش کے زنگیوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔ ایک عرصے تک ان میں خود مختار بادشاہتوں کے سلسلے قائم رہے، لیکن پھر ان میں بدنظمی پھیل گئی، یہاں تک کہ یحیی بن ابراہیم الگدالی نے ان پر تسلّط قائم کیا۔ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸-۱۰۴۹ء میں یحیی حج کے لیے مکّے گئے تو واپسی پر نفیس سے فقیہ عبداللہ بن یاسین الگزولی کو اپنے ہمراہ لے آئے، جنھوں نے لمتونہ کو دین اور شریعت کے اصول کی تعلیم دی۔ پھر خود سرداری اختیار کرکے گدالہ اور مسوفہ کے ہمسایہ قبائل کو زیر کیا اور ان کی قیادت کرتے ہوئے مراکش فتح کیا۔ یہی عبداللہ سلطنت الموحدین کے بانی تھے، جو مُلَثَّمون یا لمتونہ (دیکھیے المرابط) کی سلطنت بھی کہلاتی ہے۔ سلطنت المرابط کے سقوط کے بعد مراکش کی تاریخ میں لمتونہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا، البتہ ماریطانیہ Mauritania کے بعض قبائل اب تک ان کے نام سے موسوم ہیں.

مآخذ: عرب مؤرخوں نے جو باب سلسلۂ سلاطین المرابط کے لیے وقف کیا ہے، اس کی ابتدائی عبارات، خصوصاً دیکھیے (۱) ابن ابی زرع: روض القرطاس؛ (۲) ابن خلدون: کتاب العبر، طبع de Slane، ۲۳۵، ۲۳۷؛ (۳) البکری: کتاب المغرب، طبع de Slane، ۱۹۱۱ء، ص ۱۶۳ تا ۱۶۸.

(G. S. Colin)

لَمْطَہ: برانی خاندان کا ایک بڑا بربر قبیلہ۔ بربر نسّاب اس کی صحیح اصل سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو فقط صنہاجہ، ہسکورہ اور گزولہ کے بھائی بند (اخوان) کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ ہوارہ اور لواتہ کی طرح حِمیری نسل سے تھے.

لمطہ ان بدوی قبیلوں میں سے تھے، جو نقاب پہنتے تھے (مُلَثَّمون)۔ اس قبیلے کی ایک شاخ دریائے مزاب Mzab کے جنوب میں رہتی تھی، جس کے مغرب میں مسوفہ اور مشرق میں تارگہ (توارگ Tuareg) قبائل آباد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دریائے نائیجر Niger تک بھی پھیل گئے تھے۔ مراکش کے جنوب میں السوس کے علاقے میں، جہاں لمطہ قبائل گزولہ قبائل کی معیت میں بدویانہ زندگی بسر کر رہے تھے، لمطہ کوہ اطلس سے قریب ترین علاقے میں جاگزیں تھے۔ معقل خاندان کے بدوی عربوں کی آمد پر لمطہ کی دو شاخیں

ذوی حسّان میں جذب ہو گئیں، باقی ماندہ شاخیں معقل خاندان کے ایک اور قبیلے شبانات میں جا ملیں تاکہ گزولہ کی، جو ذوی حسّان سے جا ملے تھے، مخالفت کر سکیں.

لمطۂ السوس کے علاقے میں وادی نال کے دہانے پر، جو اب وادلون کہلاتا ہے، نول یا نولِ لمطہ کا تجارتی شہر واقع ہے، سب سے پہلی آبادی، جو صحراے اعظم سے آنے والے مسافروں کو نظر آتی ہے، یہی ہے ۔ مراکش کے متعدد حکمران خاندانوں نے اس مقام سے اپنے ناموں کے سکے جاری کیے.

سجِلماسہ کے فقیہ وگّاگ بن زَلّو، جو ابو عمران الفاسی کے شاگردوں میں سے تھے، قبیلۂ لمطہ ہی کے ایک فرد تھے ۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک عبداللہ بن یاسین الگزولی بھی تھے، جو المرابطہ کی سلطنت کے بانی ہوگزرے ہیں.

لمطہ کا علاقہ لمطیہ ڈھالوں کے لیے مشہور تھا، جو نول لمطہ میں ہرن کی کھال سے بنائی جاتی تھیں.

مآخذ: (۱) الادریسی؛ (۲) البکری؛ (۳) ابن خلدون: کتاب العبر، اشاریہ، بذیل لمطہ اور نول؛ (۴) الحسن بن محمد الوزّان (Leo Africanus): *Description de l'Afrique*، طبع Schefer، ص ۲۷۲، ۳۳۷.

(G. S. COLIN)

لَمْغَانَات: مشرقی افغانستان کا ایک ضلع، جس کا بابر اکثر ذکر کرتا ہے (دیکھیے ترجمۂ توزک، از W. Erskine، ص ۱۴۱، Courteille، ۱: ۲۸۷) ۔ اس نام کو محض خیالی طور پر حضرت نوحؑ کے والد لمک Lamech سے متعلق کیا جاتا ہے.

(H. BEVERIDGE)

لِمْنی: جزیرۂ لمنوس Lamnos کے نام کی صورت ۔ یہ جزیرہ بحیرۂ ایجئین میں جبل اتھوس Athos اور ایشیاے کوچک کے ساحل کے مابین درِ دانیال کے مدخل سے ۵۰ میل جنوب کی طرف مشرق میں واقع ہے.

[... تفصیل کے لیے دیکھیے ۱؎ لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) Zinkeisen: *G. O. R.*، ۱: ۱۶۹ و ۲: ۲۳۱، ۲۳۵ ببعد، ۳۱۵ و ۳: ۸۵۳ ببعد، ۹۴۳ ببعد؛ (۲) von Hammer: *G. O. R.*، ۱: ۸۱، ۱۸۶، ۴۳۸ ببعد، ۴۹۴، ۵۳۴ و ۳: ۴۵۷، ۴۸۲ و ۴: ۶۸۵؛ (۳) V. Cuinet: *La Turquie d Asie*، ۱: ۴۷۰ ببعد، ۴۷۰ ببعد.

(J. H. KRAMERS)

لَنکَران: (لنکَرن) صوبۂ باکو میں اسی نام کے ضلع کا صدر مقام ہے ۔ یہ اس نام کا روسی تلفظ ہے جسے کسی وقت لنگرکناں (=جہاں لنگر اندازی ہو) لکھا جاتا تھا اور جس کا فارسی تلفظ لنکران اور تالشی زبان میں لنکون ہے ۔ باکو اور انزلی [رک بآں] کے درمیان چلنے والے جہاز لنکران میں ٹھیرتے ہیں، جس کا بحری راستہ کافی چوڑا ہے ۔ اس سے آٹھ میل شمال مشرق کی طرف جزیرۂ "سرا" واقع ہے، جس کا بحری راستہ بڑا عمدہ ہے اور یہاں خراب موسم میں جہازوں کو پناہ ملتی ہے [.... تفصیل کے لیے دیکھیے ۱؎ لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) رک بہ تالش؛ زین العابدین شیروانی؛ (۲) بستان السیاحۃ، تہران ۱۳۱۵ھ، بذیل مادّہ لنکران؛ (۳) Bérézine: *Puteshestwiye po Daghestanu*، قزن ۱۸۴۹ء، ۳: ۱۱۳؛ (۴) Semenow: *Geogr-statis slowar Ross imperii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۷ء؛ (۵) *La grande Encycl. russe* (طبع Brok-haus-Efron)؛ (۶) G. Radde: *Reisen an d.*

persischruss Grenze، لائپزگ ۱۸۸۶ء؛ (۷) Radde : Talysch, Pet. Mitt، ۳۱، ۱۸۷۵ء؛ (۸) de Morgan : Mission scient Etudes Géogr، ۱ : ۲۳۱ تا ۲۸۹؛ (۹) Études Archéol، ۱ : ۱۳ تا ۱۲۵ جس کے ساتھ آثار قدیمہ کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے؛ (۱۰) N. Y. Marr : Talïshi جسے پیٹرو گراڈ کی Acad. des sciences نے ۱۹۲۲ء میں طبع کیا (تفصیلی مآخذ بھی دیے ہیں؛ (۱۱) B. Miller : Predwar otčet o poyzedke w Talish، باکو ۱۹۲۶ء (زیادہ تر لسانیاتی ہے)۔

(V. MINORSKOY)

* **لِنْگہ**: خلیج فارس کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ جو لارستان [رک بہ لار] اور صحرا کے درمیان واقع ہے۔ پرانی بندرگاہ گُنگ تھی جو لِنگہ کے آٹھ میل مشرق میں واقع تھی۔ پرتگیزوں کا وہاں ایک کارخانہ تھا۔ ہرمز کھو جانے کے طویل عرصے بعد ۱۷۱۱ء تک وہ وہاں حکمران رہے۔ زند خاندان کی فرمانروائی کے دور میں ایک ہزار جواسم عرب (بنی جاشم، جواشم، کواسم) اپنے سردار شیخ صالح کے ساتھ راس الخیمہ (عمان) سے آئے اور ضلع جہانگیری کے کلانتر سے لنگہ لے لیا۔ ۱۸۸۷ء میں ایرانی حکومت نے لنگہ پر قبضہ کر لیا اور آخری موروثی شیخ قازب نامی کو جلا وطن کرکے تہران بھیج دیا۔ موجودہ آبادی ملی جلی قسم کی ہے جس میں عرب، ایرانی، ہندو اور افریقی شامل ہیں۔ لنگہ میں ساحل پر گھاٹ ہیں جہاں مقامی آمد و رفت کے لیے کشتیاں چلتی ہیں۔ بندرگاہ خاصی مصروف رہتی ہے۔ لنگہ کے پیچھے کی طرف پہاڑ ساڑھے تین ہزار سے لے کر چار ہزار فٹ تک بلند ہوتے چلے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے عقبی علاقے تک رسائی مشکل ہے۔ لار لنگہ سے ۴۵ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔

مآخذ: (۱) بحوالہ مقالۂ لار : Pelly : Report on the Persian Gulf Trans. Bombay Geogr. Society، ۱۷ء، ۱۶۸۳ : ۳۲ تا ۱۱۲؛ (۲) وہی مصنف: A visist to Linga, F.R.G.S. 1864، ۳۳ : ۳۵۱ تا ۳۵۸؛ (۳) [Constable and Stiffe] : Persian Gulf، طبع سوم، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۴) Curzon : Persia، ۲ : ۳۰۷ تا ۳۰۹۔

(V. MINORSKY)

* **لِـواء**: ع؛ بمعنی عَلَم؛ جھنڈا؛ مشتق از لَوٰی = لپیٹنا)۔ ترکی زبان کی سرکاری اصطلاحات کی رو سے اس سے مراد وہ انتظامی حلقہ ہے، جس میں بہت سی لوائین مل کر ایک ولایت (صوبہ) بنتی ہے۔ یہ صوبہ قضا (اضلاع) پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوا (انتظامی اعتبار سے) بڑی حد تک فرانس کے departement سے ملتا جلتا ہے۔ یہ سَنجاق (ترکی = جھنڈا؛ [صوبے کا ضلع، ولایت]) کا بھی مترادف ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوتا ہے۔ لوا متصرف کے زیر انتظام ہوتا ہے، لہٰذا اس کا تیسرا نام متصرفلک ہے۔ لِوا کا انتظامی ادارہ مملکت عثمانیہ کے ابتدائی ایام کی یادگار ہے، لیکن اس کی تشکیلِ جدید سلطان محمود ثانی کے عہد میں ۱۸۳۴ء میں عمل میں آئی تھی۔

(جدید عربی زبان میں لوا جرنیل کا ہم معنی ہے)۔

مآخذ: (۱) Ubicini : Lettres sur la Turquie، بار دوم، پیرس ۱۸۵۳، ۱ : ۴۴، ۵۰؛ [(۲) المنجد، بذیل مادّہ]۔

(CL. HUART)

* **لَـواتہ**: بَتر خاندان کی ایک بربری نسلی برادری جس کا موروثِ اعلیٰ جس کے نام سے وہ

موسوم ہیں. لُوا کوچک بن لوا بزرگ بن زَحیک تھا - ابن حزم نے بعض بربر نسّابون کی رائے نقل کی ہے جو لواته کو سدّارته اور مزاته کی طرح قبطی الاصل سمجھتے ہیں، لیکن ابن خلدون اس خیال سے متفق نہیں - بعض کہتے ہیں کہ لواته، هَوّاره اور لمطه سمیت حمیری الاصل تھے - بہرحال اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ لواته کا سب سے پرانا وطن شمالی افریقہ کا مشرقی حصہ تھا - وہ مصر میں شمال کی طرف اسکندریہ اور قاہرہ کے درمیان اور جنوب کی طرف نخلستانوں میں اور الصعید میں پائے جاتے تھے - کچھ لُواته برقه کے علاقے میں بدویانه زندگی بسر کرتے تھے - مغرب میں وہ جبل لواته (قابس اور صفاقس Gabes and Sfaax کے جنوب) میں رہتے تھے اور غالباً یہی وہ شاخ ہے جس کا Corippus نے *Iloguaten* = بربر: الواتن کے نام سے ذکر کیا ہے - بعض بجایه (Bougie) کے نواح میں اور Tiarat (تاهرت) کے جنوب کے علاقے میں آباد تھے جہاں انھوں نے اباضیوں کے ملحدانه عقائد اختیار کر لیے تھے - مراکش میں لواته تادلا میں (زناره شاخ) فاس کے جنوب میں اور طنجه اور ارزله (Arzila) کے درمیانی علاقے میں رہتے (بستے) تھے.

مآخذ: (۱) الادریسی اور البکری: فہارس: (۲) ابن خلدون: کتاب العبر، طبع de Slane، ۱: ۱۴۷ تا ۱۵۰، ترجمه، ۱: ۱۷۱، ۲۳۱ تا ۲۳۶.

(G. S. Colin)

لَوْح: (عربی): لکڑی کا تختہ، هر پھیلی ہوئی چوڑی لکڑی یا هڈی، لکھنے کی تختی - پہلے معنے قرآن پاک کی سورت ۵۴ ([القمر]: ۱۳) میں ملتے ہیں جس میں کشتی نوح کو ذَاتُ اَلْوَاح کے نام سے پکارا گیا ہے - لَوْح کے دوسرے معنی یعنی وہ شے جس پر لکھا جائے مثلاً لوح [احکام خداوندی]، سورت ۷ [الاعراف]: ۱۴۵، ۱۵۰ اور ۱۵۴ میں ملتے ہیں جن میں اس کی جمع اَلْواح استعمال ہوئی ہے (دیکھیے لسان العرب، بذیل مادّه.

الدوات واللّوح (بخاری، تفسیر القرآن، سورة النسآء (۴)، باب ۱۸) همارے زمانے کے کاغذ اور روشنائی کے مماثل ہیں - اس کا اطلاق حدیث میں ''مابین اللّوحین'' کے الفاظ میں مکمل قرآن پر ہوا ہے، یعنی وہ شے جو تختوں کے درمیان موجود ہے (بخاری، کتاب التفسیر، سورة ۵۹، باب ۴؛ کتاب اللّباس، باب ۸۴) جسے مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْن کہا گیا (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۱۶) - اللّوح سے مراد وہ تختی بھی ہے جو عالم قدس میں رکھی ہے اور جسے سورة ۸۵ [البُروج]: ۲۲، میں لوح محفوظ کہا گیا ہے - اس آیت کی رو سے اس لوح کو عموماً یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حفاظت سے عالم قُدس میں رکھی ہوئی ہے.

تفاسیر میں سورہ ۹۷ [القدر]: ۱، کی شرح میں بھی لوح کا ذکر ہوا ہے: ''اس کو (قرآن کو) لیلة القدر میں نازل کیا''- اس آیت کا اشاره یا تو اس اوّلین وحی کی طرف ہے جو آنحضرت صلّی اللّٰه علیه و آله و سلّم پر نازل ہوئی یا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو لوح محفوظ سے جو ساتویں آسمان کے اوپر ہے، سب سے زیریں آسمان پر اتارا گیا.

چونکہ لوح قرآن مجید کا اصل نسخہ ہے اس لیے وہ بعینه اُمّ الکتٰب ہے - مشیت حق کے تمام فیصلے بھی قلم سے لوح پر لکھے گئے ہیں [رَكَ به قلم] - یه دو مختلف تصور ہیں یعنی لوح تقدیر اور لوح محفوظ - ان کے مابین امتیاز کرنا ضروری ہے - سورت اعراف میں ہے: وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ

مَّوْعِظَةً (۷ [الاعراف] : ۱۴۵)؛ اور هم نے اس کے لیے (یعنی حضرت موسیٰؑ کے لیے) هر قسم کی نصیحت تختیوں پر لکھ دی ۔ قرآن حکیم کے متعلق ہے : فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ (۸۵ [البروج] : ۲۲) قرآن ایک محفوظ لوح میں ہے ۔ اسی کو دوسری جگہ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ کہا گیا : اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ۙ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۙ (۵۶ [الواقعہ] : ۷۷، ۷۸) . . . . ، یعنی یہ قرآن حکیم و کریم ہے ایک محفوظ کتاب میں (پہلے سے درج) ہے ۔

مآخذ : تفاسیر القرآن میں متعلقہ آیات ۔

(A. J. WENSINCK)

لودی : (= لودھی) افغانستان کے غلزئی قبیلے کی ایک شاخ کا نام ۔ محمود غزنوی کے هندوستان پر حملے سے قبل اس قبیلے کا خاندان ملتان میں آباد هو چکا تھا کیونکہ ۱۰۰۵ء میں اس پر ابوالفتح داؤد حکومت کرتا تھا اور یہ شیخ حمید لودی کا پوتا تھا جس نے یہاں سکونت اختیار کی تھی، لیکن اس قبیلے کی اهمیت دراصل فیروز تغلق کے زمانے سے شروع هوتی ہے جبکہ اس قبیلے کے کچھ افراد هندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے اور تھوڑے هی دن میں سیاست کے اندر داخل هو گئے ۔ تغلق حکومت کے خاتمے کے بعد دولت خاں لودی نے تخت حاصل کرنے کے لیے خضر خان [رک بآں] سے مقابلہ کیا ۔ ملتان کے گورنر ملک مردان دولت کے هاں ملک بہرام لودی اور اس (ملک بہرام لودی) کا سب سے بڑا لڑکا سلطان شاہ ملتان میں خضر خان کے یہاں ملازم تھا ۔ ۱۲ نومبر ۱۴۰۵ء کی لڑائی کے بعد جس میں خضر خان نے ملّو (اقبال خان) کو شکست دے کر قتل کیا، سلطان شاہ کو اسلام خان کا خطاب اور فوجی خدمات کے صلے میں سرهند کا علاقہ بطور جاگیر ملا ۔ اس علاقے میں اس نے اپنے چاروں بھائیوں سمیت بود و باش اختیار کی اور بارہ هزار سوار کا ایک لشکر اکٹھا کر لیا جس میں سب سے زیادہ تعداد اس کے اپنے هی قبیلے کے لوگوں کی تھی ۔ اپنے حقیقی بھائی کالا کے لڑکے بہلول کو (جسے هندوستان میں عام طور پر بہلول کہا جاتا ہے) اسلام خان نے اپنے لڑکے قطب خان کو نظر انداز کرتے هوئے متبنّٰی کر لیا اور اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی ۔ قطب خان بھاگ کر دہلی چلا گیا اور محمد شاہ سید کی ملازمت اختیار کر لی اور اس سے کہا کہ میرے رشتے دار حکومت کے لیے خطرناک هیں ؛ چنانچہ محمد شاہ نے ان کے خلاف ایک فوج روانہ کی، اُن کو شکست هوئی اور وہ پہاڑیوں میں بھاگ گئے، لیکن فوراً هی پلٹے، اپنے مقبوضات کو واپس لیا اور ساڈھورے کے قریب حسام خان وزیر کو شکست دی ۔ ۱۴۴۲ء میں دہلی کو محمود خلجی دوم فرمانروائے مالوہ کی طرف سے خطرہ لاحق هوا ۔ محمد شاہ نے بہلول سے مدد مانگی ۔ اس نے مطالبہ کیا کہ میرے دشمن حسام خان کو قتل کیا جائے اور اس کی جگہ میرے دوست حمید خان کو وزیر بنایا جائے ۔ بادشاہ نے جو اس وقت بے بس تھا اس کی یہ شرطیں مان لیں اور بہلول اپنی سپاہ لے کر دہلی کی طرف چل پڑا اور وهاں پہنچ کر ساری فوج کی قیادت سنبھال لی ۔ مالوے کی فوج سے جنگ فیصلہ کن نہ هوئی ۔ اتنے میں محمد شاہ کو اطلاع پہنچی کہ اس کے دارالسلطنت میں شورش برپا هوگئی ہے؛ چنانچہ اسے وهاں واپس جانا پڑا ۔ ادھر بہلول کو حکومت کا نجات دهندہ تسلیم کر کے خان خاناں کا خطاب دیا گیا اور اُسے پنجاب کی حکومت عطا هوئی ۔ تھوڑے هی دن بعد اس

نے محمد شاہ کے ساتھ ایک جھگڑا کھڑا کر لیا اور اسے دہلی میں محصور کر لیا، لیکن شہر پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی سرہند واپس چلا گیا۔ ۱۴۴۳ - ۱۴۴۴ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا عالم شاہ اس کا جانشین ہوا، مگر یہ ایک کمزور بادشاہ تھا۔ ایک مختصر اور مضطرب دور حکومت کے بعد وہ دہلی سے بدایوں چلا گیا اور وہاں بطور گوشہ نشین سکونت پذیر ہوا۔ یہ سن کر بہلول نے دہلی کی طرف کوچ کیا اور عالم شاہ اس کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔ ۱۹ اپریل ۱۴۵۱ء کو بہلول تخت نشین ہوا اور ۳۸ سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد ۱۷ جولائی ۱۴۸۹ء کو اس کا لڑکا سکندر تخت پر بیٹھا جس نے ۱۲ نومبر ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم بادشاہ ہوا۔ اسے ۲۲ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں بابر نے شکست دے کر قتل کیا۔

مآخذ: (۱) نظام الدین احمد: طبقات اکبری؛ (۲) خافی خان: منتخب التواریخ، مرتبہ و مترجمۂ جی۔ ایس۔ اے۔ رینکنگ، در ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی سلسلۂ مطبوعات ہند؛ (۳) محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، بمبئی ۱۸۳۲ء۔

(T. W. HAIG)

• **لُوْرقہ**: (یا لُرقہ)؛ [مشرقی اندلس میں صوبۂ مرسیہ کا ایک شہر جو دریاے سنگونیرہ کے داہنے کنارے پر واقع ہے] - یہ زمانۂ قدیم کا Iluro (اِلُورو) یا رومن عہد کا Helioeroca ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں یہ تُدْمِیر [رَکّ بآں] کورہ کا حصہ تھا اور اپنی زمین کی زرخیزی اور معدنی دولت اور اہم جنگی مقام ہونے کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کا حِصْنِ [آقلہ] اندلسیہ بھر میں مضبوط ترین قلعہ تھا۔ یہ [کوہِ کانو (Sierra de Cano) کے دامن میں] سطح سمندر سے ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور دریاے Guadalentin کی تمام گزرگاہ پر مُشرِف ہے۔ عربوں کے عہد حکومت میں اس کی قسمت مرسیہ سے وابستہ رہی اور ۱۲۶۶ء میں دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا۔

مآخذ: (۱) اَلْاِدْرِیسی: صِفَۃُ الْاَنْدلُس، متن، ص ۱۹۶، ترجمہ ۲۳۹؛ (۲) یاقوت: معجم البُلْدان، ۷: ۳۴۲؛ (۳) E. Lévi Provençal: *Document inédits d'histoire almohade*، پیرس سنہ ۱۹۲۷ء، بمدد اشاریہ؛ [(۴) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۳۳۱ حیدر آباد دکن ۱۹۲۷ء].

(E. LÉVI-PROVENÇAL)

لُوشہ: (Loja)؛ اَنْدلس کا ایک چھوٹا سا شہر جو غرناطہ سے ۳۵ میل جنوب مغرب کی جانب، دریاے جِمِل Gemil کے بائیں کنارے پر، سفید چونے کے ایک شاندار پہاڑ Periquetes کے دامن میں واقع ہے۔ اس وقت اس کی آبادی ۲۰،۰۰۰ سے کچھ کم ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے عہد میں اب سے زیادہ بارونق تھا۔ یہ مشہور و معروف ابن الخطیب لسان الدین [رَکّ بآں] کی جاے پیدائش ہے اور اس نے اس کا بہت پرجوش تذکرہ لکھا ہے۔ وہاں اب بھی اس حِصن کے آثار قدیمہ نظر آتے ہیں، جو عربوں کے وقت شہر کے تمام منظر پر حاوی تھا۔ خلیفہ عبداللہ بن محمد کے زمانے (۲۸۰ھ/ ۸۹۳ء) میں اسے نئے سرے سے آباد کیا گیا۔ یہ شہر جسے "مفتاح غرناطہ" کہا جاتا تھا [تقریباً آٹھ سو برس مسلمانوں کے قبضے میں رہنے کے بعد] ۱۴۸۸ء میں عیسائی حکمرانوں کے زیر نگیں ہو گیا۔

مآخذ: (۱) یاقوت: معجم البلدان، ۷: ۳۴۳؛ (۲) F. Simonet: *Descripcion del reino de Granada*، غرناطہ ۱۸۷۲ء، ص ۹۵ تا ۹۶؛ [(۳) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۳۳۲].

(E. LÉVI-PROVENÇAL)

⊗ (حضرت) لُوط: حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے اور آزر (تارح) کے پوتے تھے۔ آزر کے تین بیٹے تھے: ناحور، ابراہیمؑ اور ہاران (بقول ابن حزم: ہارون، دیکھیے جمہرۃ انساب العرب، بمدد اشاریہ)۔ حضرت لُوطؑ کا نسب نامہ یوں ہے: لوطؑ بن ہاران بن آزر (=تارح)۔ حضرت لوطؑ جنوبی عراق کے قدیم شہر اُور UR میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کا مولد بھی یہی شہر (اُور) تھا۔ یہ شہر دریاے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے بھی پہلے آباد تھا۔ اس کا محل وقوع اس جگہ تھا جہاں آج کل تل العبید واقع ہے۔ برطانوی عجائب خانے (برٹش میوزیم) اور امریکہ کی فلاڈلفیا یونیورسٹی کے عجائب خانے کی ایک مشترکہ اثری مہم نے بیسویں صدی کے اوائل میں تل العبید کی کھدائی کا کام شروع کیا اور سات آٹھ برس کی محنت کے بعد یہ شہر نمودار ہو گیا۔ اس اثری انکشاف سے قرآن مجید اور انبیاے کرامؑ کے متعدد گوشوں اور بابلی تہذیب و ثقافت کے کئی پہلوؤں پر مزید روشنی پڑنے کا امکان ہے۔

حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کے آغوش تربیت میں نشوونما پائی اور اکثر و بیشتر انھیں کی رفاقت میں رہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اُور سے حاران کو ہجرت کی تو حضرت لوطؑ بھی ان کے ہمراہ حاران چلے گئے اور وہیں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آباد ہو گئے۔ جب وہاں قحط پڑا تو حضرت ابراہیمؑ نے مصر کا رخ کیا، اس وقت بھی حضرت لوطؑ ان کے رفیق سفر تھے۔

حضرت لوطؑ ان سابقون اوّلون میں سے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ پر پہلے پہل ایمان لائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربّانی ہے: فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹ [العنکبوت]: ۲۶)، یعنی لوطؑ نے ان کی تصدیق کی اور (ابراہیمؑ) بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف ترک وطن کرکے چلا جاؤں گا۔

قیام مصر کے دوران میں حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کے مشورے سے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے شرق اردن کے علاقۂ سدوم اور عاموره (=عموره) کو پسند فرمایا۔ یہ علاقہ اس عہد میں نہایت سرسبز اور شاداب تھا۔ سدوم و عاموره کی بستیاں اس جگہ آباد تھیں جہاں اب بحرِ میّت یا بحر لوط واقع ہے۔ یہ سارے کا سارا حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانے میں خشک زمین تھی اور اس پر بارونق اور شاداب بستیاں آباد تھیں۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا تو اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا۔ سخت زلزلوں اور بھونچالوں کی وجہ سے یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا۔ اسی وجہ سے اس کا نام بحر لوط اور بحرِ میّت مشہور ہو گیا۔

علاقۂ سدوم و عاموره میں جو قوم آباد تھی وہ اپنی بدکرداریوں اور نازیبا حرکتوں کے باعث آج بھی دنیا میں بدنام و رسوا ہے۔ اخلاق سوز غیر فطری گمراہی انفرادی اور شخصی حدود سے نکل کر قومی کردار بن چکی تھی۔ قرآن مجید نے اس بستی اور وہاں کی

قوم کا حال بھی بیان فرمایا ہے: وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۙ (۲۱ [الانبیاء]: ۷۴)، یعنی لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نے انھیں اس بستی سے نجات دی جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے، بے شک وہ لوگ بڑے ہی بدکار تھے۔ دوسری جگہ ان کی بداعمالی کا یوں ذکر فرمایا: وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ (۱۱ [ہود]: ۷۸)، یعنی یہ لوگ پہلے ہی سے بدکاریاں کرتے تھے۔ اس بدکاری اور برائی کی مزید تشریح کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ (۷ [الاعراف]: ۸۰ و ۸۱)، یعنی (ہم نے) لوط (کو بھی بھیجا) جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ارے! تم تو ایسا بےحیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے اسے دنیا جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ قرآن مجید نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ (۲۹ [العنکبوت]: ۲۹)، یعنی کیا تم (لذت کے لیے) مردوں کی طرف دوڑتے ہو اور (مسافروں) کی رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں نازیبا و ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہو۔

حضرت لوطؑ کی قوم تمرّد، سرکشی اور بداخلاقی کے علاوہ ایک نہایت خبیث عمل اور بدکرداری میں مبتلا ہو گئی۔ قوم لوط اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورتوں کے بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ قوم لوط اس بدکرداری اور غیر فطری عمل کی موجد تھی۔ اس وقت تک دنیا میں اس بدعملی کا رواج قطعاً نہ تھا۔ قوم لوط ہی نے دنیا میں پہلی مرتبہ اس فعل بد کو اختیار کیا اور اسی وجہ سے اس کا نام "لواطت" مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ اہل سدوم (یعنی قوم لوط) کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے سوداگروں اور تاجروں کو نئے نئے ہتھکنڈوں سے لوٹ لیا کرتے تھے۔ بداخلاقی، فسق و فجور اور ظلم و جور کے لیے قوم لوط جو حربے استعمال کرتی تھی حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو ٹوکا اور ان سب برائیوں سے روکا۔ قرآن مجید کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۭ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۝ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝ قَالَ اِنِّىْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ۭ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶ [الشعراء]: ۱۶۱ تا ۱۶۹)، یعنی جب کہ ان کے بھائی لوطؑ نے کہا کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک امانتدار پیغمبر ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں مانگتا؛ میرا صلہ تو بس پروردگار عالم کے

ذمّے ہے ۔ کیا تم اہل عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہوتے ہو اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لیے بیویاں پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو ۔ در حقیقت تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو ۔ وہ لوگ بولے کہ اے لوطؑ! اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا ۔ لوطؑ نے کہا میں تمہارے کام سے سخت بیزار ہوں؛ اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے گھر والوں کو اس کام سے جو یہ کرتے ہیں نجات دے۔

حضرت لوطؑ نے ہر عمدہ طریقے سے اور نہایت نرمی کے ساتھ اپنی قوم کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ انہیں بےحیائی کے کاموں سے باز رہنے کو کہا اور ان کی بدکرداریوں کی مذمت کی، مگر ان کی نصیحت و موعظت نے ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا ۔ الٹا انہوں نے اپنے پیغمبر کا مذاق اڑایا اور پاکبازی کی طنز کی اور ان کو ملک بدر کرنے کا حکم صادر کر دیا ۔ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ (۷ [الاعراف] : ۸۲)، یعنی ان کی قوم سے کوئی جواب بن نہ پڑا اس کے سوا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ انہیں اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ قوم لوط نے حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان پر پاکبازی کی طنز کی اور کہا کہ ہم ایسے ناپاک لوگوں میں ان پاکبازوں کا کیا کام ۔ ان کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو ۔ اس پر بھی حضرت لوطؑ نے پند و موعظت اور نصیحت و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا تو منکرین کا غیظ و غضب اور بھڑکا اور برملا کہنے لگے کہ جو عذاب لانا ہے، لے آؤ: قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۹ [العنکبوت] : ۲۹)، یعنی وہ کافر بولے کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤ ۔ اس کے جواب میں حضرت لوطؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! ان بدکردار اور شرارت پسند لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی دعا قبول فرما لی اور فرشتے بھیجے تاکہ وہ ساری بستی کو تباہ و برباد کر دیں ۔ مفسرین کا قول ہے کہ یہ فرشتے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل تھے جو نہایت حسین اور خوشنما انسانی شکل و صورت میں نمودار ہوئے ۔ وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئے اور انہیں حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی خوش خبری دی اور ساتھ ہی یہ بھی سنایا کہ ہم سدوم اور اس کے گرد و نواح کی بستی کو ہلاک کرنے جا رہے ہیں، کیونکہ وہاں کے باشندے ظلم و بدکاری اور فسق و فجور میں حد سے بڑھ گئے ہیں ۔ حضرت ابراہیمؑ نہایت حلیم الطبع، دردمند اور رحمدل تھے، اس لیے انہوں نے فرشتوں کو بحث و جرح کے ذریعے بستی ہلاک کرنے سے روکنا چاہا ۔ بالآخر کہ دیا کہ اس بستی میں تو حضرت لوطؑ بھی موجود ہیں ۔ اس پر فرشتوں نے جواب دیا کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہاں کون کون لوگ آباد ہیں ۔ ہم حضرت لوطؑ اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے؛ البتہ ان کی بیوی عذاب میں مبتلا ہونے والوں کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی (۲۹ [العنکبوت] : ۳۰ تا ۳۲) ۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اصرار کیا تو فرشتوں نے کہا کہ ابراہیم! اس معاملے میں دخل نہ دو ۔ تمہارے پروردگار کا حکم آ پہنچا ہے ۔ ان پر عذاب آ کر رہے گا ۔ یہ عذاب کسی صورت ٹل نہیں سکتا (۱۱ [ہود] : ۶۹ تا ۷۶) ۔ جب فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس

انسانی شکل میں پہنچے تو وہ ان فرشتوں کے آنے سے بڑے غمگین اور تنگدل ہوے اور کہنے لگے کہ آج بڑی مشکل درپیش ہے ۔ جب ان کی قوم نے سنا کہ حضرت لوط؈ کے پاس خوبصورت اور خوش شکل مہمان آئے ہیں تو وہ بری نیت سے دوڑتے ہوے آئے ۔ حضرت لوط؈ نے ہر چند اپنی قوم کو سمجھایا بجھایا، لیکن وہ بدکردار بات سمجھنے پر بالکل آمادہ نہ ہوے ۔ بالآخر فرشتوں نے حضرت لوط؈ کو تسلی دی کہ آپ فکر مند نہ ہوں ۔ ہم اللہ تعالٰی کے بھیجے ہوے فرشتے ہیں ۔ یہ بدکار لوگ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے ۔ آپ راتوں رات یہاں سے نکل جائیے ۔ ان پر صبح کے وقت عذاب آنے والا ہے (۱۱ [ہود] : ۷۷ تا ۸۱)۔

اللہ تعالٰی کے عذاب کا وقت آ گیا ۔ حضرت لوط؈ حکم الٰہی سے سرشام سدوم شہر سے نکل گئے ۔ ان کی بیوی راستے ہی سے واپس سدوم لوٹ آئی ۔ رات کے آخری حصے میں ایک ہیبت ناک آواز سنائی دی جس نے شہر سدوم کو تہ و بالا کر دیا ۔ پھر ساری بستی کو اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی جس نے سدوم اور اہل سدوم کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا ۔ اس کی ساری تفصیلات قرآن مجید میں درج ہیں (دیکھیے (۱۱ [ہود] : ۸۲ و ۸۳)؛ (۱۵ [الحجر] : ۶۵ تا ۷۶؛ (۲۶ [الشعراء] : ۱۶۱ تا ۱۷۵) ۔ اللہ تعالٰی نے اپنی خاص رحمت سے حضرت لوط؈ کو، ان کے گھر والوں کو اور اہل ایمان کو اس خوفناک عذاب سے بچا لیا، البتہ ان کی بیوی نے کفر والوں کا ساتھ دیا، لہٰذا وہ بھی منکرین کے ساتھ عذاب الٰہی کا نشانہ بنی اور انہیں کے ساتھ ہلاک و تباہ ہوگئی۔

حضرت لوط؈ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں ہر قسم کے مصائب وآلام برداشت کیے اور دشمنان دین کے ظلم و جور کے مقابلے پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور ہر معاملے میں اللہ تعالٰی کی ذات پر بھروسا کرتے ہوے تسلیم و رضا کا پیکر بن گئے ۔ حضرت لوط؈ کی بیٹی حضرت شعیب؈ کی دادی تھیں اور ایک بیٹی حضرت ایوب؈ کی والدہ (ابن قتیبہ : کتاب المعارف، ص ۴۱ و ۴۲)۔

مآخذ : (۱) قرآن مجید، بمواضع کثیرہ؛ (۲) تفاسیر عربی و اردو، بحوالۂ آیات مذکورہ درمتن؛ (۳) بائیبل، کتاب پیدائش؛ (۴) محمد حفظ الرحمٰن سیوہاری : قصص القرآن، جلد اول؛ (۵) محمد جمیل احمد : انبیاے قرآن، جلد اول؛ (۶) ابن کثیر : البدایۃ والنہایۃ، ۱ : ۱۷۶ ببعد؛ (۷) الثعلبی : قصص الانبیاء (= عرائس المجالس)، مصر ۱۲۸۲؛ (۸) عبدالوہاب النجار : قصص الانبیاء؛ (مصر ۱۹۳۲ء؛ (۹) الطبری : تاریخ الرسل و الملوک، ۱ : ۳۲۵ تا ۳۴۲؛ (۱۰) الکسائی : قصص الانبیاء؛ ۱۱) ابن قتیبہ، کتاب المعارف، طبع ثروت عکاشۃ، مصر ۱۹۶۹ء۔

(عبدالقیوم)

لُوط بن یحییٰ : رک بہ ابو مِخْنَف۔ *

لُؤلُؤ : (۱) ؛ حاکم حلب سیف الدولہ کا غلام اور اس کے بیٹے سعد الدولہ اور پوتے سعید الدولہ کا وزیر ۔ مؤخرالذکر کے قتل کے بعد وہ اس کے لڑکوں کا سرپرست اور ۳۹۴ھ / ۱۰۰۳ء تا ۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء میں فاطمی خلفا کے زیر اقتدار حلب کا خود مختار حکمران تھا (رک بہ حمدان (بنو)، مع مآخذ) ۔ [لؤلؤ نے ۳۹۹ھ میں وفات پائی (احمدالسعید سلیمان : تاریخ الدول الاسلامیۃ، ۱ : ۲۴۳ تا ۲۴۴، مصر ۱۹۶۹)]۔ *

(۲) حلب کے سلجوق سلطان رضوان کا خواجہ سرا اور معتمد علیہ مشیر تھا ۔ سلطان رضوان نے ۵۰۷ھ / ۱۱۱۳ء میں انتقال کیا تو لؤلؤ اس کے لڑکے الپ ارسلان اخْرس (= گونگا)

کا اتابک بن گیا ۔ الپ ارسلان نے تمام امور سلطنت لؤلؤ کے سپرد کر دیے ۔ وہ خود بھی بڑا ظالم اور سفاک تھا جس کی وجہ سے تمام درباری اس سے نفرت کرنے لگے ۔ اس وجہ سے وہ ایک سازش کا شکار ہو گیا جس میں لؤلؤ کا بھی ہاتھ تھا ۔ کاروبار سلطنت پر مضبوط گرفت رکھنے کے لیے اس نے الپ ارسلان کے چھے سالہ بھائی سلطان شاہ کو تخت نشین کر دیا ۔ اس نے برائے نام ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء تک حکومت کی ۔ اس زمانے میں سارے ملک میں بدنظمی پھیلی رہی (رک بہ حلب) ۔ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لؤلؤ صلیبیوں، شامی اتابکوں اور سلطان محمد سلجوقی کی باہمی آویزشوں سے الگ رہا ۔ اس نے سلطان محمد سلجوقی کو حلب دینے کا وعدہ کر لیا، لیکن خفیہ طور پر طغتگین اتابک دمشق اور حاکم ماردین ایلغازی سے مدد حاصل کرنے میں لگا رہا ۔ دوسری طرف ان کو طاقتور ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے وہ صلیبیوں سے ان کی مخبری کرتا رہا اور وہ مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچاتے رہے ۔ طغتگین کی رسالہ فوج کی مدد سے وہ حلب پر قابض رہا ۔ فوج کی تنخواہ ادا کرنے کے لیے اس نے اپنے وزیروں اور حلب کے خوشحال تاجروں کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ لیا ۔ وہ سازشوں کے ڈر کے مارے قلعے سے باہر نہیں جاتا تھا ۔ ۵۱۰ھ/۱۱۱۷ء میں اسے اپنا خزانہ ایک دوست کی تحویل میں دینے کے لیے باہر نکلنا پڑا تو اس کے حفاظتی دستے کے ترک سپاہیوں نے حملہ کرکے اسے قتل کر دیا ۔ انھوں نے یہ خزانہ ہتیا لیا اور حلب پر بھی اچانک حملہ کرنا چاہا، لیکن فوج کے ایک دستے نے انھیں شکست دی اور لوٹا ہوا مال چھین لیا ۔ صلیبی جنگوں کے ابتدائی زمانے میں شام میں ابتری پھیلی ہوئی تھی، جس کی نمایاں مثال لؤلؤ تھا ۔ اس ابتری اور بدنظمی کا خاتمہ نور الدین کی طاقتور اور باصلاحیت شخصیت نے کیا ۔

مآخذ: (۱) دیکھیے مآخذ رک، بذیل حلب؛ (۲) کمال الدین: *Geschichte von Aleppo*، مترجمۂ Silver de Sacy، در Röhricht: *Beitrage zur Geschichte der Kreuzzüge*، ۱: ۳۴۳، ۳۴۵ تا ۳۵۱، برلن ۱۸۷۴ء؛ (۳) (کمال الدین ابن العدیم: زبدۃ الحلب من تاریخ حلب، ۱: ۱۸۵ و ۱۸۹ تا ۱۹۸، ۲۰۹، دمشق ۱۹۵۴ء).

(M. SOBERNHEIM)

لُؤلُؤ: [بن عبداللہ الاتابکی]، بدر الدین ابو الفضائل الملکہ الرحیم، اتابک موصل ۔ لؤلؤ نورالدین زنگی ارسلان شاہ اول کا غلام تھا اور اس کے مزاج میں بڑا دخل رکھتا تھا ۔ جب نورالدین نے بستر مرگ (۶۰۷ھ/۱۲۱۰-۱۲۱۱ء) پر اپنے لڑکے الملک القاہر عزالدین مسعود کو اپنا جانشیں نامزد کر دیا تو اس نے لؤلؤ ہی کو متولی سلطنت مقرر کیا اور موصل کے نزدیک العقر اور شوش کے دونوں قلعے اپنے چھوٹے لڑکے عمادالدین زنگی کو عطا کر دیے ۔ اواخر ربیع الاول ۶۱۵ھ/جون ۱۲۱۸ء میں الملک القاہر نے اپنے نابالغ لڑکے نورالدین ارسلان شاہ کو اپنا جانشیں اور لؤلؤ کو نگران سلطنت بنا کر انتقال کیا ۔ جب سال مذکور کے ماہ رمضان (دسمبر ۱۲۱۸ء) میں عمادالدین نے العمادیہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا تو لؤلؤ نے اس کے خلاف فوج کشی کی ۔ لؤلؤ کی فوج نے العمادیہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن اسے ناکام واپس آنا پڑا ۔ عمادالدین نے حاکم اربل مظفرالدین کوکبری [رک بآں] سے

گٹھ جوڑ کر لیا تو الھکّاریہ اور الزوّزان کے قلعہ داروں نے عمادالدین کی اطاعت قبول کر لی ۔ لؤلؤ نے الملک الاشرف ایوبی سے مدد کی درخواست کی، جو عراق کے بیشتر حصے پر حکمران تھا اور اس کی بالا دستی قبول کرلی ۔ اس پر الاشرف نے لؤلؤ کی مدد کے لیے نصیبین کی طرف فوج بھیجی ۔ محرم ۶۱۶ھ / اپریل ۱۲۱۹ء میں لؤلؤ کی افواج نے عمادالدین کو العقر کے قریب شکست دی اور اسے اربل کی طرف راہ فرار اختیار کرنی پڑی ۔ الاشرف اور خلیفہ الناصر کی مداخلت سے فریقین میں صلح ہو گئی، لیکن جب دائم المرض نورالدین نے اس سال یا اس سے اگلے سال وفات پائی اور اس کا چھوٹا بھائی ناصرالدین محمود، جس کی عمر صرف تین سال تھی، اس کا جانشیں ہوا تو عماد الدین اور مظفر الدین نے الموصل کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا ۔ اس پر لؤلؤ نے، جو اپنے بڑے لڑکے کو الاشرف کی امداد کے لیے فرنگیوں کے خلاف فوج دے کر روانہ کر چکا تھا، نصیبین میں الاشرف کے جرنیل علی بیگ سے استمداد کی ۔ علی بیگ اسی وقت چل پڑا اور لؤلؤ سے جا ملا ۔ ۲۰ رجب ۶۱۶ھ / یکم اکتوبر ۱۲۱۹ء کو الموصل کے قریب لؤلؤ کو شکست ہوئی، لیکن جب وہ دوبارہ اپنی افواج اکٹھی کر رہا تھا، مظفر الدین واپس چلا آیا ۔ صلح کے اختتام پر عماد الدین نے کواشی کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور لؤلؤ کو الاشرف سے دوبارہ مدد مانگنی پڑی ۔ مظفر الدین نے بہت سے امرا کو، جن میں ابن المشطوب کو بھی شامل کر لیا، یہ رغبت دلائی کہ وہ الاشرف کا ساتھ چھوڑ دیں اور دُنَیسر کے مقام پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں اور مؤخرالذکر کا راستہ روک لیں ۔ تمام امرا نے اپنے خیالات بدل دیے صرف ابن المشطوب اپنی راے پر قائم رہا اور اربل چلا آیا ۔ اسے پہلے نصیبین کی فوج نے اور بعد ازاں حاکم سنجار فَروخ شاہ کی افواج نے شکست دی اور اسے قیدی بنا لیا ۔ رہائی کے بعد اس نے لوٹ مار کرنے والوں کو جمع کر کے ملک کے طول و عرض میں تباہی مچا دی ۔ لؤلؤ کی فوج کے ہاتھوں شکست کھا کر اس نے تلّ اعفر کے قلعے میں پناہ لی ۔ اب لؤلؤ نے خود موصل سے آ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا ۔ ۱۷ ربیع الاول ۶۱۷ھ / ۱۲ جون ۱۲۲۰ء کو ابن المشطوب نے ہتیار ڈال دیے اور اسے گرفتار کر کے الموصل لایا گیا ۔ الاشرف نے مظفر الدین سے مصالحت کر لی اور الجدیدہ اور نصیبین اور دوسرے قلعے اور عراق کی حکومت لؤلؤ کے حوالے کر دی ۔ ناصر الدین کی وفات (۶۱۹ھ/۱۲۲۲ - ۱۲۲۳ء) پر (یا بقول دیگر مؤرخین ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ - ۱۲۳۴ء میں) لؤلؤ کو الملک الرحیم کے لقب کے ساتھ الموصل کا اتابک تسلیم کر لیا گیا ۔ ۶۳۵ھ / ۱۲۳۷ - ۱۲۳۸ء میں اس کی الصالح نجم الدین ایوبی سے جنگ ہوئی ۔ مؤخرالذکر نے خوارزمیوں کو اپنی ملازمت میں لے کر حرّان اور الرُّھا ان کو بخش دیے، لیکن انھوں نے نصیبین کے شہر پر بھی اپنا تسلط جما لیا ۔ تین سال بعد انھوں نے حلب اور حمص کے حکمران سے شکست کھائی اور لؤلؤ نے نصیبین اور دارا کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا ۔ لؤلؤ کو حاکم حلب الناصر یوسف ایوبی سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا ۔ ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ - ۱۲۵۱ء میں اس نے شکست کھائی اور نصیبین، دارا اور قرقیسیا پر حلب کی افواج نے قبضہ کر لیا ۔ لؤلؤ نے ہلاکو کی حکمرانی تسلیم کرنے کے بعد جب کہ اس کی عمر اسی سے اوپر ہو چکی

تھی، ۶۵۷ھ / ۱۲۵۹ء میں انتقال کیا۔

مآخذ: ابن الأثیر، طبع Tornberg، ۱۲: ۱۹۳ ببعد، ۲۱۸ تا ۲۲۷، ۲۴۷، ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۸۹، تا ۲۹۱؛ (۲) ابن خلدون: العبر، ۵: ۲۶۸ تا ۲۷۶؛ (۳) Weil: *Gesch. d. Chalifen*، ۳: ۳۴۳، ۳۴۹، ۳۶۹، ۳۸۰: (۴) وهی مصنف: *Recueil des histor. des crosaides, Histor. Orient*، ۱: ۸۶، ۹۰ تا ۹۳، ۹۸، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۳۸، ۲: ۳۶۲، ۳۷۳ ببعد؛ (۵) van Berchem، در *Orient Studien, Th. Noldeke Gewidmet*، ص ۱۹۷ ببعد؛ (۶) *Brit. Mus. Cat. Or. Coins*، ۳: ۲۰۰ تا ۲۳۸؛ [(۷) ابن تغری بردی: النجوم الزاهرة، ۷: ۷۰].

(K. V. ZETTERSTÉEN)

* **لُؤْلُؤَة**: (ع؛ بمعنی موتی)؛ قیلیقیا میں طرسوس کے قریب ایک قلعہ جس کا محاصرہ المأمون نے ۲۱۷ھ / ۸۳۲ء میں کیا تھا۔ یہ یونانیوں کا ایک مستحکم قلعہ تھا جس کے فتح کرنے میں مسلمانوں کو بےشمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی قلعہبند فوج سامان حرب سے اچھی طرح لیس تھی۔ دوسرے دو قلعوں سمیت خلیفہ المأمون نے اس کی ایک سو دن تک ناکہ بندی جاری رکھی۔ بالآخر خلیفہ کی فوج نے شاہنشاہ روم توفیل (Theophilus) کو شکست فاش دی۔ اس کے نتیجے میں اہل قلعہ نے عُجیف بن عنبسہ کو، جو ان کا قیدی بنا ہوا تھا، باہر نکال کر مصالحت کے لیے بھیجا۔ المأمون سے امان حاصل کرنے کے بعد قلعے والوں نے ہتیار ڈال دیے۔

مآخذ: (۱) کتاب العیون، حصۂ سوم، در *Fragmenta historicorum arabicorum*، طبع de Goeje، ص ۳۷۵، لائیڈن ۱۸۷۱ء؛ (۲) ابن الأثیر: الکامل، ۶: ۳۲۱؛ (۳) یاقوت: معجم البلدان، ۴: ۳۷۱، طبع Wüstenfeld؛ (۴) سامی بے: قاموس الاعلام، ۶: ۴۰۲۲.

(CL. HUART)

* **لُولی**: ایران کے خانہ بدوشوں کے لیے ایک نام؛ اس کے مترادف الفاظ حسب ذیل ہیں: فارسی میں لُوری، لُوری (فرہنگ جہانگیری)؛ بلوچی میں Lori لُوری (Denys Bray: *Census of Baluchistan*، ۱۹۱۱ء، ۴: ۱۴۳، اسے لُوڑ Lōr بمعنی ''حصہ، قسمت'' سے متعلق بتاتا ہے)۔

لفظ لُولی پہلی بار بہرام گور کے عہد (۴۲۰ - ۴۳۸ء) کی ایک داستان میں آیا ہے۔ اس ساسانی بادشاہ کی فرمائش پر جو رعایا کے لیے تفریح کا سامان پیدا کرنا چاہتا تھا، ہندوستان کے بادشاہ شنگل (؟) نے ۴۰۰۰ (یا ۱۲۰۰۰) ہندوستانی گویّے بھیجے۔ حمزہ اصفہانی (م ۳۵۰ھ/۹۶۱ء) مطبوعۂ برلن، ص ۳۸، نے انھیں ''الزُّط'' [رک بآں] کا نام دیا ہے؛ فردوسی (موہل، ۴: ۷۶، ۷۷) ''لُوریان''؛ الثعالبی (م حدود ۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷ء)، طبع زوٹن برگ Zotenberg، ص ۵۶۷، بتاتا ہے کہ سیاہ لُوری (اللُّوریون السُّودان) جو بنسری بجانے کے ماہر ہیں انھیں کی نسل سے ہیں؛ مجمل التواریخ (۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء) ترجمہ از موہل، در *J.A.* ۱۸۴۱ء، ۱۲: ۵۱۵، ۵۳۴، میں لُوریوں کے اس نسب و نژاد کی تصدیق کی گئی ہے۔ لُولی (جمع: لُولیان) کا ذکر اکثر فارسی شعرا کے کلام میں آیا ہے۔ منوچہری (دامغان، جرجان، غزنی، پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی)، جمال الدین عبدالرزاق (م ۳۸۸ھ/۹۹۸ء اصفہان)، کمال اسمٰعیل (م ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء اصفہان)، حافظ (م ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء، شیراز) کہتے ہیں کہ لُولی سیاہ (مثل شب)، شوخ و شنگ، خوش باش، اور خوش وضع ہوتے ہیں۔ بنسری کی آواز پیدا کرنے والا ساز خوب بجاتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقے غیر منظم ہیں۔

فارسی لغاتوں میں لُولی / لُوری کے معنی بےحیا، خوش مزاج، دلآرام، موسیقار اور زنِ سبک اخلاق وغیرہ آیا ہے (دیکھیے Vullers، [اقتباس از امیر خسرو (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء در ہند) کتاب مذکور، بذیل مادّہ)، لُر کو لُرستان سے منسوب بتایا گیا ہے۔

لفظ لُولی کے مآخذ کے متعلق ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام سندھ کے اس شہر کے باشندوں کے لیے آتا تھا، جسے عرب مصنّفین نے اَرور یا الرُّور لکھا ہے (دیکھیے اراس > الراس؛ الان > اللان) ۔ یہ شہر محمد بن قاسم نے ۹۵ھ / ۷۱۴ء سے پہلے فتح کیا تھا (البلاذری، طبع کُخویہ، ص ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۵) ۔ البیرونی، طبع Sachau، ص ۱۰۰، ۱۳۰، کے بیان کے مطابق شہر اَرور (اَرور) ملتان سے جنوب مغربی سمت ۳۰ فرسخ کے فاصلے پر اور منصورہ سے ۲۰ فرسخ آگے تھا۔ ایلیٹ: *History of India*، لنڈن ۱۸۶۷ء، ۱: ۶۱، ۳۶۳ کے مطابق یہ شہر اُلور کہلاتا ہے۔ اَرور جو سندھ کے ہندو راجگان کا قدیمی دارالسلطنت تھا، اب کھنڈروں کی صورت اختیار کر چکا ہے (ساحل سندھ پر ضلع سکھر میں تعلقہ روھڑی سے متعلق، دیکھیے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ۶: ۴ اور ۲۱: ۳۰۸۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہرام گور کے ہندوستانی گویّوں (چھسیوں = خانہ بدوش گویّوں) کے اخلاف اس اہم شہر کی نسبت سے موسوم ہوئے، جسے عرب فاتح جانتے تھے اور شاید ان سے بھی پہلے ساسانی عہد کے لوگ اس شہر کے نام سے آشنا تھے۔ س بیان سے اس قبیلے کے نسلی رشتے کو متاثر کیے بغیر لولیاں یا لوریاں کے اصلی وطن کی واضح طور پر نشان دہی ہو جاتی ہے۔

لفظ لُولی = لُوری (جس سے بقول Ivanow، ۱۹۱۴ء، خراسان کے لوگ نا آشنا تھے) جنوب مغربی ایران، کرمان اور ایرانی بلوچستان میں بطور خاص مستعمل تھا۔ لولی یا Lūlī کو ترکستان کے لوگ بھی جانتے تھے: بابر، طبع Ilminsky، ص ۳۵۸، ۴۵۷، لفظ لولی کو فن کار کے معنی میں استعمال کرتا ہے، ابوالغازی، طبع Desmaisons، ص ۲۴۱، ۲۵۸، ۲۷۶، ۲۸۲ کا بیان ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں مرو اور ابیورد کا شیبانی شہزادہ ایک لولی عورت کے بطن سے تھا۔ Mayew: *Izwĕstiya Ross Geogr. obshč*، ۱۲ / ۴، ص ۳۴۹ اور *Geogr. Magazine*، ۱۸۷۶ء، ص ۳۲۶ تا ۳۳۰: Lūlī in Eastern Bukhārā؛ Rhins: *Miss. scient dans la Haute Asie*، پیرس ۱۸۹۸ء، ۲: ۳۰۸ = Lūlī and Āghā in Chinese Turkistan؛ Valikhanow: *Sočineniya*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۴ء، ۲۹: ۴۳: ''لُولُو'' (کذا) اور ''ملتانی'' کاشغر میں۔ سب سے آخر میں یہ بھی قیاس کیا گیا ہے کہ شام کے جپسی قبیلے کا نام نُوری (= جمع نَورا) لُولی ہی سے مشتق ہے۔

لُوری / لُولی جپسی (دیکھیے اوپر بحوالۂ سیاہ رنگ) کوھستانی لُوریوں سے جو ایران کے جنوب مغربی علاقے میں رہتے ہیں، الگ پہچانے جاتے ہیں، کیونکہ مؤخرالذکر کا رنگ سفید ہے اور وہ ایک ایسی ایرانی بولی میں بات چیت کرتے ہیں، جس میں ہندوستانی زبان کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ البتہ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں صورت حال کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ لُولی، لُوری، لُور وغیرہ اصطلاحوں کا استعمال ہمیشہ واضح نہیں ہوتا۔ [ایران کے صوبے] فارس کے عرب قبائل کے وفاق میں ''لُور'' نام کا ایک گروہ ہے؛ میائیکس:

Poyězdka : Rittich ؛ ۳۳۰ ص ،Ten Thousand Miles
v Belučistan, Izw. Geogr Obsché ، ۱۹۰۲ء ، ۳۳
بار اوّل، ص ۶۹ میں لُولیان کرمان کے ایک لوری (فارسی تلفظ لوری) گروہ کا ذکر آیا ہے ایڈمنڈز Edmonds نے لُورستان کے علاقے دشینان میں لُری (؟) قبیلے کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ کردستان میں ایک قبیلہ ہے جو لُرّ کلاھگر کے نام سے موسوم ہے (رک بہ سِنّا) .

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ بات یہ ہے کہ بعض لُروں نے نٹوں کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، بعض ریچھ نچانے کا شغل اختیار کیے ہوے ہیں اور بعض رسّے پر ناچ کا تماشا دکھاتے ہیں (دیکھیے Čirikow، ص ۲۷۷)۔ چودھویں صدی عیسوی میں شہاب الدین العمری نے متذکرہ فنون میں لروں کی مہارت کا ذکر کیا ہے اور عصر حاضر میں ایسے گھومنے پھرنے والے لُروں کے گروہ شمالی علاقے یعنی تبریز تک نظر آتے ہیں، جہاں قرچی جپسیوں، پیشہ‌ور ایکٹروں اور گویّوں کی ایک مستقل نئی بستی آباد ہے۔ یہ ممکن ہے کہ لر فن‌کاروں اور جپسی فن‌کاروں کے خصوصی اوصاف ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوں، مثلاً کردستان کے سوزمانی (دیکھیے سرپُل اور سِنّا) جو ناچ اور گانے میں ممتاز ہیں، نٹ نہیں۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا تاوقتیکہ تحقیق یہ ثابت کر دے کہ گھومنے پھرنے والے لُر فن‌کار کس مخصوص قبیلے سے متعلق ہیں.

لُرستان میں جپسیوں کا در آنا بھی ممکن نہیں۔ لفظ ''زُطّ'' کے تحت آنے والے جس نسل و نسب کے لوگ بھی ہوں (زُطّ اور لُوریوں کے گڈمڈ ہونے کے متعلق دیکھیے اوپر : حمزہ، ثعلبی) خوزستان میں زط نو آبادیوں کا الحجّاج [رک بآں] کے زمانے تک پتا چلتا ہے۔ الرور کے تحت یاقوت : ۲ : ۸۳۳ سندھ کے دو مقامات اور خوزستان کے شہر اھواز کے ایک ناحیے کا ذکر کرتا ہے۔ Schwarz : Persien in Mittelalter، ۴ : ۶۶۵ نے اس رُور کو اشتباھاً ضلع الرُور ھی سمجھ لیا ہے (دیکھیے لُرستان) جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے، اس کی روشنی میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک قدیم ھندوستانی نو آبادی اللُور کی صورت میں موجود تھی، لیکن ھمارے پاس اس مفروضے کی توثیق کے لیے کوئی صریح ذریعہ نہیں (ابن حوقل کے مطابق، ص ۱۷۶، اللُور میں کُردوں کی غالب اکثریت تھی) خوزستان میں الرُور نام کی اصل، الرُور اور اللُور کے مماثل ہونے اور لُور کے دور از فہم اصل کے مسائل تحقیق طلب ھی رہیں گے اور اگر لُر کو شہر اللُور سے متعلق سمجھ لیا جائے پھر بھی لفظ ''لُر'' کی اصل سے اس قبیلے کے نسب و نژاد کا مسئلہ حل نہیں ہوتا.

کرمان اور بلوچستان کے علاوہ ایران کے دوسرے صوبوں میں جپسی مندرجۂ ذیل ناموں سے موسوم ہیں.

خراسان میں: قر شمال . . . . ۔ استر آباد اور ماژندران میں: جوگی اور گاؤداری ۔ آذربیجان میں: قرچی اور ترک قدیم ۔ فارس (وغیرہ) میں : کاؤلی (= کابلی).

مذکورہ نام ممکن ہے قدرے مختلف اور مقامی امتیازات کے مطابق ہوں، بہرحال ان کے متعلق پورا علم نہیں.

ایران میں جپسیوں کے خاندانوں کی تعداد بیس ہزار اور کل آبادی ایک لاکھ ہے۔ ان میں سے پانچ ہزار خاندان آذربیجان میں اور تین سو سے پانچ سو تک کرمان میں آباد ہیں (Sykes) جپسیوں کی ایک اپنی تنظیم ہے۔ شاہ (ایران) کے سواروں کا رئیس (شاطر باشی) اس تنظیم کا بھی سردار ہوتا ہے ۔ اس کے ماتحت

صوبائی ڈپٹی (کلانتر) ہوتے ہیں ۔ مغربی ایران کے معاشرتی اعتبار سے جپسیوں اور ایران کے دھقانوں میں بہت کم فرق ہے (Ivanow و Sykes) خراسان میں یہ لوگ دیہاتی معاشرے کی زندگی میں صنعت کاروں، چھلنی بنانے اور مرمت کرنے والوں، زنجیر سازوں اور کنگھیاں بنانے والوں کی حیثیت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں ۔ استر آباد میں کچھ گاؤداری جپسی زرگر کا کام کرتے ہیں اور کچھ سوت یا اون کاتتے ہیں (de Morgan) یوں تو ایران کے ہر حصے میں بےنام ایلاتوں کے سیاہ رنگ کے خیمے نظر آتے ہیں ۔ یہ خیمے جپسیوں ہی کے ہیں ۔ سبزوار، نیشاپور اور تبریز ایسے شہروں میں جپسیوں نے اپنی سکونت گاہیں قائم کر رکھی ہیں ۔ جپسی رقاصوں اور گویوں کی منڈلیاں تو موجود ہیں، لیکن کچھ زیادہ مقبول نہیں ۔ Ouseley نے قرچی ناچوں اور کٹھ پتلیوں کے تھیٹروں (تبریز) کا حال بیان کیا ہے ۔ کُردستان کے سُوزمانی قبیلے کے رقاصوں اور گویوں کا ذکر تو اکثر سیاحوں نے کیا ہے (دیکھیے بالخصوص) خورشید افندی: سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، ص ۱۱۹، دیکھیے T. Thomson: *The Soozmanee: are they Gypsies*, *Journ. Gipsy Lore Soc*، ۲، ۱۹۰۹ء، ص ۲۷۵، ۲۷۶.

ایران کے جپسیوں کی زبان (Sykes، Ivanow و de'Morgon) از روئے صوریات جدید فارسی [جو ظہور اسلام کے بعد مستعمل ہوئی] ہی ہے ۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ فارسی الفاظ ہی سے معمور ہے (دیکھیے فہرست، در de Morgan)؛ اس زبان میں ہندوستانی عناصر شاذ و نادر ہی ہیں ۔ کرمان اور خراسان کی زبان میں (سائیکس و ایوانوف) بہت زیادہ تعداد ایسے عناصر کی ہے، جن کی پہچان نہیں ہو سکتی ۔ لانگ ورتھ ڈیمز Longworth Dames کے خیال کے مطابق ان ۹۶ الفاظ میں سے جو سائیکس نے جمع کیے ہیں، ۱۲ ہندوستانی زبان کے، ۴ عربی کے، ۲۸ فارسی کے اور ۵۲ ایسے الفاظ ہیں، جن کا مأخذ اس بولی کو وہ کوئی مصنوعی اور خفیہ قسم کی غلط سلط بولی بتاتا ہے ۔ ڈینس برے Denys Bray (جیسا کہ ایوانوف نے حوالہ دیا ہے) نے اس امر کی توثیق کی ہے کہ بلوچستان کی لوڑی زبان کو بچے ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں (قدرتی طور پر لوڑی بچے اس زبان کو گھریلو استعمال ہی کے لیے سیکھتے ہیں).

سُوزمانی جپسی زیادہ تر کُردی زبان بولتے ہیں ۔ Čirikow کے مطابق انہیں دُمّی کہتے ہیں جو ڈومان کے مترادف ہے (= ڈوم، برصغیر پاکستان و ہند کی ایک ذات [مراسی] کا نام ہے جس نے قدرے تبدیلی کے ساتھ جپسیوں کے مشہور نام رُوم کی شکل اختیار کی) ڈومانوں کا ذخیرۂ الفاظ (بغداد حلب؟)، کردی الفاظ سے معمور ہے، مثلاً کاوَر (= پتھر) خُوئ (= نمک)، لاوَک (= لڑکا) ۔ بوھتان کے مشرق میں ایک کرد قبیلہ سندھی / سندھیان کے خیال انگیز نام سے موسوم ہے ۔ شرفنامہ کے مطابق کُردکان شاخ (زراقی) کے سردار نے ایک جپسی عورت سے شادی کی تھی ۔ جپسیوں اور کردوں کی قرابتداری زیر بحث لاتے ہوئے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۲۲۰ھ / ۸۳۵ء میں زُطّوں کا ایک گروہ خانقین، یعنی کردوں کے علاقے کی سرحد پر آ کر بس گیا (دیکھیے de Goeje Mémoire، ص ۳۰؛ طبری، ۳: ۱۱۶۸).

فارسی بولیوں کے متعلق دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ایران وہ پہلا ملک ہے، جہاں جپسیوں نے ہندوستان کو خیرباد کہہ کر عارضی قیام

کیا (شاید ساسانی عہد میں) ایران کی جپسی بولیوں کا اس وقت تک جو مطالعہ کیا گیا ہے، ناکافی ہے ۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ان بولیوں کے صوتی اصولوں کا بھی پتا چل جائے گا جو اب متروک ہیں ۔ اوسلے Ouseley نے مثال کے طور پر تبریز کے قرچی قبیلے کا ایک لفظ بہن (خواہر) معلوم کیا جو یقیناً ''پھین'' اور ''بین'' سے زیادہ پرانا ہے (دیکھیے نیز غوار، در Gobinean).

مآخذ: دیکھیے مقالات لُر، سرپُل، سِنّا، زُطّ. (۱) Don Juan of Persia : *Relaciones* 'Valladolid' ۱۶۰۴ء، ص ۱۷ (جپسی سبک اخلاقی پر)؛ (۲) انگریزی ترجمہ، از G. Le Strange، لنڈن ۱۹۲۶ء، ص ۵۷؛ (۳) Ouseley : *Travels in various Countries of the East* لنڈن ۱۸۱۹-۱۸۲۳ء، ۱: ۳۰۹؛ ۳: ۳۰۰، ۳۰۵ (قرچی تبریز)؛ (۴) Ker Porter : *Travels in Geogia etc* لنڈن ۱۸۲۲ء، ۲: ۵۲۸ تا ۵۳۲: The Karaĉi near Marāgha؛ (۵) *Die Zigeuner in Persien und Indien*، میونخ ۱۸۳۳ء، ص ۱۶۳، ۱۶۴؛ (۶) *Das Ausland* Bataillard : *Nouvelles recherches sur l' apparition et la dispersion des Bohémiens . . . . . avec un appendice sur l' immigration en Perse entre les années 420 et 440 de dix à douze mille Louri, Zutt et Djatt de l' Inde* پیرس ۱۸۴۹ء، ص ۱ تا ۴۸ (بار اول مطبوعہ در Bibliotheque de l' Ecole des Chartes، تیسرا سلسلہ، ۱: ۱۴ تا ۵۵)؛ (۷) Newbold : *The Gipsies of Egypt* *J. R. A. S.*، ۱۸۵۶ء، ۱۵: ۲۸۵ تا ۳۱۲ (ص ۳۰۹ تا ۳۱۱: *Gipsies of Persia*)؛ (۸) Gobineau : *Die wanderstämme Persiens, Z. D. M. G.*، ۱۸۵۷ء، ۱۱: ص ۶۸۹ تا ۶۹۹ [دیکھیے Correspondence of Mérime در *Revue des dux mondes*، ۱۵ اکتوبر، ۱۹۰۲ء، ص ۳۳۷]؛ (۹) Grierson : *Arabic and Persian references to Gipsies Indian Antiquary*، بمبئی ۱۸۸۷ء، ۱۶: ۲۵۷، ۲۵۸؛ [نقش ثانی در Journ Gipsy Lore Society، ایڈنبرگ ۱۸۸۹ء، ۱: ۱۷ تا ۷۶ بعنوان: *Doms, gats and the origin of the Gipsies*]؛ (۱۰) R. Burton : *The Jew, the Gipsy and El-Islam*، لنڈن ۱۸۹۸ء، ص ۲۱۵ تا ۲۱۷؛ *The Jats of Bilochistan*، ص ۲۱۷ تا ۲۱۹؛ *The Gypsies of Persia*؛ (۱۱) P.M. Sykes : *Anthrop, notes on Southern Persia*: *Journ Anthr Inst of Gr Britain*، ۱۹۰۲ء، ۳۲: ۳۳۹ تا ۳۴۹ (ص ۳۴۵ تا ۳۴۹: Gurbati vocabulary؛ ۳۵۰ تا ۳۵۲: notes by Long worth Dames)؛ (۱۲) P. M. Sykes : *Ten thousand Miles in Persia* لنڈن ۱۹۰۲ء، ص ۳۳۶ تا ۳۳۹ مع عکسی تصویر؛ (۱۳) de Goeje : *Mémoire sur les migrations des Tsiganes à travers l' Asie* لائیڈن ۱۹۰۳ء، بالخصوص ص ۳۰، ۳۸، ۶۳؛ (۱۴) de Morgan : *Mis scient en Perse V Études Linguistiques* پیرس ۱۹۰۳ء، ص ۳۰۴ تا ۳۰۷: جوگی (= خوش نشین) قبیلے کے ۲۳۳ الفاظ، گاودری قبیلے کے ۹۱ الفاظ جو صوبۂ استرآباد میں حاصل کیے گئے؛ (۱۵) P. M. Sykes : *The Gipsies of Persia, A second vocabulary, J. Anth Soc, Gr Brit*، ۱۹۰۶، ۳۶: ۳۰۲ تا ۳۱۱: جپرفت اور سرجان سے حاصل کیے ہوئے ۹۶ الفاظ؛ (۱۶) P. M Sykes : *Notes on musical instruments, in Khorasan with special reference to the Gipsies*، لنڈن ۱۹۰۹ء، ۹: ۱۶۱ تا ۱۶۴؛ (۱۷) W. Ivanow : *On the language of the Gipsies of Qainat (Khorāsān)*، *J. S. A. B.*، ۱۹۱۳ء، ۱۰ تا ۱۱، ص ۳۳۹ تا ۳۵۵: (۱۸) W. Ivanow : *Further notes on Gipsies in Persia, J. A. S. B.*، ۱۹۲۰ء.

۱۵ شمارہ ۷، ص ۲۸۱ تا ۲۹۱، بصورت درستی مقالۂ بالا، ۹۵ الفاظ جو نیشاپور اور سبزوار وغیرہ میں حاصل ہوئے)، ایضاً: *G. A. S. B.*، ۱۹۲۲ء، ۱۸: ۳۷۶ تا ۳۸۳؛ ایضاً *Notes on the ethnology of Khourasn, The Geogr Journal*، فروری ۱۹۲۶ء، ص ۱۵۶، ۱۵۷؛ (۱۹) J. Sampson: *On the origin and early migrations of Gipsies, Journal Gipsy Lore Soc*، ۱۹۲۳ء، ص ۱۵۶ تا ۱۷۰ نیز دیکھیے *Journal Gipsy Lore Soc.*، ایڈنبرگ۔ لورپول مندرجۂ ذیل مقالات: Sampson و de Goeje: *The Gipsies of Persia*، ۱۹۰۷ء، ص ۱۸۱ تا ۱۸۳ (à propos of Sykes)؛ (۲۰) Groome: *Persian and Syrian Giposies*، ۱۹۰۹ء، ص ۲۱ تا ۲۷ (قرچی ذخیرۂ الفاظ مرتبۂ Ouseley)؛ (۲۱) W. T. Thomson: *The Soozmanee: are they Gipsies*، ۱۹۰۹ء، ص ۲۷۵، ۲۸۶؛ (۲۲) Sykes: *Persian Jats*، ۱۹۱۰ء، ص ۳۲۰؛ Sinclair و Ranking ۱۹۱۱ء، ص ۶۹ تا ۷۰، ۲۳۵ (à propos of Sykes، ۱۹۰۹ء)؛ (۲۳) Sykes: *The Shah's runners tatooing in Persia*، وغیرہ۔

(V. Minorsky [و تلخیص از ادارہ])

* **لومبوک**: (ملکی لوگ اسے عموماً (تاناساساک (Tanahsasak) کہتے ہیں) جاوا کے مشرق میں جزائرسنڈا (خرد) نام کے جو جزیرے واقع ہیں، ان میں ترتیب کے لحاظ سے دوسرا جزیرہ ہے اسے آبنائے لومبوک بالی سے اور آبنائے آلس Alas، سمباوہ Sumbawa سے جدا کرتی ہے۔ ایک ہموار قطعۂ زمین جو بہت زیادہ چوڑا نہیں ہے، تقریباً وسط جزیرہ میں شرقاً غرباً لمبا چلا گیا ہے، جو کہیں کہیں نہایت زرخیز ہے اور شمال اور جنوب میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ جزیرے کے شمالی حصے میں کوہ آتش فشاں رنڈجنی Rindjnai واقع ہے جسے آبادی کا ایک بڑا حصہ مقدس مان کر اس کا احترام کرتا ہے۔ یہ جزیرہ اس مجمع الجزائر میں سب سے زیادہ متمول حصوں میں سے ایک ہے؛ یہاں کے لوگوں کے بڑے پیشے زراعت اور مویشی پالنا ہیں۔ کسی قدر چاول یہاں سے باہر بھی بھیجے جاتے ہیں جو ان قطعات زمین کے بعض حصوں میں بوئے جاتے ہیں جہاں آبپاشی خوب ہوتی ہے۔ [. . . . تفصیل کے لیے دیکھیے ۷۷ لائیڈن بار اول بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) سنہ ۱۹۱۹ء کے آخر تک لومبوک کی ایک مکمل فہرست مآخذ۔ C. Lekkerkerker کی *Bali en Lombok* مطبوعۂ Rijswijk ۱۹۲۰ء میں دے دی گئی ہے۔ اس کے بعد سے مندرجۂ ذیل کتب طبع ہو چکی ہیں: (۲) J. C. van Eerde: *De volkasnaam Bodha in Nederlandsch Indie* در *Tijdschrift van het Kon Ned Aardrijkskundig Genoots hap*، ۱۹۲۲ء، سلسلہ ۲، ج ۳۹، ص ۱۰۹؛ (۳) A. W. L. Vogelesang: *Eenige aanteekeningen betreffende de Sasaks op Lombok* در *Koloniaol Tijdschrift* مئی ۱۹۲۲ء؛ (۴) مصنف مذکور *Sasaksche spreek woorden en zagswijzen*، وہی کتاب، ۱۹۲۲ء، ص ۵۸۶؛ (۵) مصنف مذکور *Gegevens betreffende het tandenvijlen bij de Sasaks*، وہی کتاب، ۱۹۲۳ء، ص ۵۰۳؛ (۶) C. Lekkerkerker: *De tegenwoordige economische toestand van het gewest Bali en Lombok*، وہی کتاب ۱۹۲۳ء، ص ۱۵۳؛ (۷) A. W. L. Vogelesang: *Waktoe tjrita-verhalen*، وہی کتاب، ۱۹۲۳ء، ص ۳۱۷؛ (۸) C. Lekkerkerker: *Het voor spel der vestiging van de Nedert macht op Bali en Lombok* در *B. T. V. L.*، ۱۹۲۳ء، ج ۷۹،

ص ۱۹۸؛ (۹) H. T. Damsté : *Heilige weefsels op Lombok*، در *T. B. G. K. W.*، ۱۹۲۳ء، ج ۶۳، ص ۱۷۶؛ (۱۰) P. de Roo de la Faille : *Javaansch grondenrecht in het licht van Lombokssche toestanden*، در *B. T. L. V.*، ۱۹۲۵ء، ج ۸۱، ص ۵۰۲؛ (۱۱) J. C. C. Haar : *De heilige weefsels van de waktoe-Teloe op Oost Lombok*، در *T. B. G. K. W.*، ۱۹۲۵ء، ج ۶۵، ص ۳۸؛ (۱۲) C. Lekkerkerker : *Bali* (بالی) سنہ ۱۸۰۰ تا ۱۸۱۳ء، در *B. T. L. V.*، ۱۹۲۶ء، ج ۸۲، ص ۳۱۰؛ (۱۳) B. M. Goslings : *Een "nawaarde" Sanga "van Lombok* در *Gedenkschrift uitgegeven ter gelegenheid van het 75-Jarig bestaan van het Kon. Instituut voor de taal, land-en volken-kunde van Ned. Indië*، ہیگ ۱۹۲۶ء، ص ۲۰۰.

(W. H. RASSERS)

لِوَنْد: بے قاعدہ شہری سپاہ کے افراد کا نام، جو سلطنت عثمانیہ کے دور کی ابتدائی صدیوں میں اس کی ہتیاربند فوج کا ایک جزو تھے ۔ یہ لوگ زیادہ تر اس زمانے میں ترکی بیڑے پر بطور سپاہی ملازم رکھے جاتے تھے، جب کہ ترکی جنگی بیڑا اکثر نجی جہازوں پر مشتمل تھا، جنھیں سلاطین عثمانی اپنی بحری مہموں میں استعمال کیا کرتے تھے۔ لِوَندی Lewendi کا لفظ دیگر بحری اصطلاحوں کی مانند اطالوی زبان سے مستعار لیا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ اطالوی لفظ Levantino (سامی: قاموس ترکی) یا لیوینٹی Levanti (جودت پاشا) ہوگا اور اس لفظ کو ابتدا میں وینس والے ان سپاہیوں کے لیے استعمال کرتے تھے، جنھیں وہ لیوینٹ Levant میں اپنے مقبوضات کے باشندوں میں سے سواحل کی حفاظت کے لیے یا بیڑے پر کام کرنے کے لیے بھرتی کرتے تھے ۔ یہ اسی زمرے کے لوگ یعنی یونانی عیسائی، البانوی یا دلمیشو تھے جو بحیرۂ روم کے سواحل پر آباد تھے اور جنھیں ترک پہلے پہل استعمال کرتے تھے کچھ عرصے بعد ایشیاے کوچک سے ترکی عناصر بھی ان میں شامل ہو گئے۔

لِوَنْد، سپاہیوں کی جماعت تقریباً ناتربیت یافتہ اور غیر منظم تھی جسے باقاعدہ ترکی بیڑے کی ترتیب و تنظیم کے وقت کام میں لانا ناممکن تھا ۔ محمد ثانی کے عہد میں بحری خدمت کے لیے ''عزب'' کا استعمال شروع ہو چکا تھا اور بایزید ثانی کے عہد حکومت میں بحری فوج کا ایک باقاعدہ دستہ بن چکا تھا ۔ جس میں ۴۰۰ عزب شامل تھے ۔ قریب قریب اسی زمانے میں جنگی جہازوں پر عیسائیوں کے بجاے عزبوں کو کورکجی Kürekdji مقرر کیا گیا، کیونکہ عیسائی ان کے مقابلے میں کم وفادار تھے (حاجی خلیفہ: تحفۃ الکبار: ص ۱۰ ب) اس طرح رفتہ رفتہ اصلی لِوَندوں کو بحری بیڑے سے نکال دیا گیا ۔ لیکن بحری فوج کے سپاہیوں کے لیے لفظ لوند کا استعمال بعد کے زمانے میں بھی پایا جاتا ہے، بالخصوص (رائفل بردار) تفنگچی سپاہیوں کے لیے (دیکھیے جودت پاشا)؛ قسطنطنیہ میں لوندوں کی دو بارکیں تھیں ۔ جو سلاح خانے کے نظام کے ماتحت تھیں ۔ سولھویں صدی کے بڑے بڑے کپتانوں پر بھی مجازاً لوند کا لفظ اطلاق کیا گیا ہے (مثلاً صفوت پاشا کا مقالہ T.O.E.M، شمارہ ۲۴ میں)۔

بیڑے میں سے نکال دیے جانے کے بعد لِوَند بحری راہزن بن کر موجود رہے، بالخصوص ایشیاے کوچک میں تو وہ ملک کے لیے ایک باقاعدہ عذاب بن گئے، چنانچہ لِوَند کے لفظ کے معنی ہی آوارہ منش یا بدمعاش ہو گئے اور اسی آخری صورت میں یہ لفظ فارسی زبان میں منتقل ہوا ۔ دوسری طرف صوبوں میں مدت تک پاشا

اپنے محافظوں کے طور پر لِوندوں کو بھرتی کرتے رہے (دیکھیے ایک لِوند کی تصویر d. Ohssan ج ۳، ص ۴۱۶).

سترھویں صدی کے آخر سے حکومت ترکیہ اس بات پر مجبور ہوئی کہ لِوند کی جتنی جماعتیں اس وقت باقی تھیں، انھیں توڑ دینے کی تدابیر کام میں لائے - ۱۶۹۵، ۱۷۱۸ء، ۱۷۲۰ء کے ضوابط کے ذریعے انھیں اجازت دی گئی کہ وہ deli ڈیلی اور جونلو Jönüllü کے نئے دستوں میں بھرتی ہو جائیں (راشد: تاریخ، قسطنطینیہ، ۱۳۸۲ء، ج ۵: ۱۳، ۱۲۳) - آخرکار ۱۷۳۷، ۱۷۳۷، ۱۷۵۲، ۱۷۵۹ اور ۱۷۶۳ء کی جنگی مہموں کے ایک سلسلے نے ان شوریدہ سر سپاہیوں کے آخری گروہوں کا جو اس وقت تک ایشیاے کوچک کے مختلف مقامات میں موجود تھے، بالکل قلع قمع کر دیا (عزّی: تاریخ: ۲۵، ۳۰، ۷۸، ۲۶۹؛ واصف: تاریخ: ۱۱۷، ۲۳۴).

مآخذ: (۱) احمد جودت پاشا: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۳۰۲ء، ۱: ۱۲۸؛ (۲) Ricaut: *Histoire de l'Etat présent de l'Empire Ottoman*، پیرس ۱۶۷۰ء، ص ۳۷۹؛ (۳) d. Ohsson: *Tableau Général de l'Empire Othoman*، پیرس ۱۸۲۰ء، ۳: ۳۳۲؛ (۴) von Hammer: *Des Osmanischen Reiches staatsverfassung* وائنا ۱۸۱۰ء، ۲: ۲۳۴ ببعد، ۲۹۵؛ (۵) وہی مصنف *G.O.R.*، ۴: ۳۱۷، ۳۶۳، ۵۰۹، ۵۴۳؛ Zinkeisen: *Geschichte des Osmanischen Reiches*، ۳: ۳۰۷ ببعد.

(J. H. KRAMERS)

⊗ **اللَّهَب**: قرآن مجید کی ایک مکّی سورۃ کا نام جو صرف ۵ آیات، [۲۳ کلمات اور ۷۷ حروف] پر مشتمل ہے - اسے سورۃ المَسَد، [سورۃ ابی لَہَب اور سورۃ تَبَّت کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے] عدد تلاوت ۱۱۱ اور عدد نزول ۶ ہے - پہلی آیات کے لفظ لہب سے اس سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے [(الفیروزآبادی: بصائر ذوی التمییز، ۱: ۵۵۲)] - لَہَب بمعنی آگ کا شُعلہ اور ابو لہب بمعنی شُعلہ رُو - ابولہب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ و سلّم کا ایک چچا تھا جس کا اصل نام عبدالعُزّٰی بن عبدالمطلب تھا - اس کے چہرے کا رنگ بہت سرخ ہونے کی وجہ سے اسے ابولہب کہا جاتا تھا - امام راغب الاصفہانی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ ابولہب کے لفظ سے اس کی کنیت مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے اس کے دوزخی ہونے کی طرف اشارہ ہے.

گزشتہ سورۃ سے اس کا ربط یہ ہے کہ سورۂ نصر [رَبَّنَا بآں] میں اس امر کا بیان ہے کہ نیکی کا اجر اس دنیا میں نصرت و غلبہ ہے جب کہ آخرت میں اجر عظیم عطا ہوگا - سورۃ اللہب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ معصیت کار کا انجام اس دنیا میں ناکامی و نامرادی ہے اور آخرت میں اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا - (تفسیرالمراغی، ۳۰: ۲۶۰) - سورۃ کے نزول کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ایک روز کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: ''یا صَبَاحَاہُ'' (ہاے صُبح کی آفت!) اس ندا پر قریش کے تمام خاندان (سنگین خطرہ محسوس کرتے ہوے) آپؐ کے پاس جمع ہوگئے - آپؐ نے فرمایا: اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ دشمن شام کو یا صبح کو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مانو گے؟ [انھوں نے کہا - ہاں] اور پھر آپؐ نے انھیں فرمایا: میں تمھیں عنقریب آنے والے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں - اس وقت ابو لہب نے غضبناک ہوکر کہا: تیرا بھلا نہ ہو، [تَبًّالَك] - کیا تو نے ہمیں اسی بات کے لیے یہاں بلایا ہے - اس کے

جواب میں اللہ تعالٰی نے یہ سورۃ نازل فرمائی ۔ (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۶۰).

یہ سورۃ اپنے مضمون کے اعتبار سے بے حد اہم ہے اور اس ظلم و ستم کی عکاسی کرتی ہے جو محسن انسانیت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم پر روا رکھا جاتا تھا ۔ مکّے میں ابولھب چچا ہونے کے علاوہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا قریب ترین ہمسایہ بھی تھا ۔ دونوں کے گھر متصل تھے ۔ ابولھب اور اس کے رفقا گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے ۔ آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ آپؐ پر پھینک دیتے، کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ھنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے ۔ حضورؐ باھر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے : اے بنی عبد مناف، یہ کیسی ھمسایگی ہے (تفہیم القرآن، ۶ : ۵۲۲) ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپؐ کی بات سننے سے روکتا ۔ طارق بن عبداللہ المحاربی کہتے ھیں کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم لوگوں سے کہتے جاتے ھیں کہ لوگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو، فلاح پاؤ گے اور ایک شخص آپؐ کے پیچھے ہے جو آپؐ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپؐ کی ایڑیاں خون سے تر ہوگئیں اور وہ کہتا جاتا تھا کہ یہ جھوٹا ہے اس کی بات نہ مانو میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولھب ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : تفہیم القرآن، ۶ : ۵۲۳) ۔ ابولھب کی بیوی ام جمیل أروی بنت حرب جو ابوسفیان بن حرب کی بہن تھی اس ظلم و ایذا رسانی میں اپنے شوھر سے کم نہ تھی وہ راتوں کو خاردار جھاڑیاں لا کر آپؐ کے راستے میں ڈال دیتی تاکہ آپؐ کو اذیت پہنچے (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۶۳).

پوری سورۃ ابولھب اور اس کی بیوی کے عبرتناک انجام کے بیان پر مشتمل ہے : ٹوٹ گئے ابولھب کے ھاتھ اور نامراد ھوگیا وہ ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا، وہ اس کے کسی کام نہ آیا ۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی بیوی بھی، لگائی بجھائی کرنے والی (یا لکڑیاں ڈھونے والی)، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ھوگی (۱۱۱ [اللھب] : ۱ تا ۵)۔ [جس وقت یہ سورت نازل ھوئی تھی اس وقت ابولھب ایک طاقتور اور مقتدر سردار تھا ۔ ایسے با اثر رئیس کے منہ پر ایسی پیش گوئی کرنے سے کتنا ھنگامہ ھوا ھوگا کتنی کھلبلی مچی ھوگی ۔ یہ صرف پیغمبرانہ حوصلے اور دل گردے کا کام ھوسکتا تھا کہ جابر سردار کے سامنے اس کی رسوائی اور بربادی کا اعلان کیا جائے اس سورت میں صاف الفاظ میں بیان فرما دیا گیا کہ تباھی و بربادی ابولھب کے لیے مقدر ھو چکی ہے ۔ اس ھلاکت و بربادی سے اسے کوئی چیز نہیں بچا سکتی ۔ اللہ تعالٰی کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کا انجام ایسا ھی ھوا].

القاسمی نے ابولھب کے بیٹے عتیبہ کی عبرتناک موت کا بھی ذکر کیا ہے ۔ عتیبہ نے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دلآزاری اور ایذا دہی کے لیے آپؐ کی صاحبزادی کو طلاق دے دی تو آپؐ نے فرمایا : ''اللّٰھم سلط علیہ کلبًا من کلابک'' (اے اللہ اپنے کتّوں میں سے ایک کتّے کو اس پر مسلّط کر دے) چنانچہ جب وہ شام کی طرف نکلا تو اسے ایک درندے نے پھاڑ کھایا (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۹۲).

اس سورۃ میں ابو لہب کی تباہی و بربادی کی پیشگوئی کے ساتھ اس کی بیوی کی تباہی کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو آپ ؐ کے راستے میں خاردار جھاڑیاں لا ڈالتی تھی ۔ علاوہ ازیں وہ لگائی بجھائی بھی کرنے والی تھی ۔ [دنیا میں ذلت و خواری اور رسوائی بربادی کے بعد آخرت میں اسے دردناک عذاب بھی ہوگا] ۔ حضرت سعید بن المسیب ؒ سے مروی ہے کہ ام جمیل کے پاس ایک بڑا قیمتی ہار تھا اور وہ کہا کرتی تھی کہ میں اسے محمد ؐ کی عداوت میں ضرور خرچ کروں گی ۔ چنانچہ اللہ تعالٰی نے اسی مناسبت سے یہ وعید سنائی کہ قیمتی ہار پہننے والی اور فخر و غرور سے تنی ہوئی اس گردن میں دوزخ کی رسی ہوگی (کتاب مذکور، ۲۶۳)۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پورے قرآن مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں دشمنان اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے ۔ اس میں حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ؐ کے چچا کی اس صریح مذمت سے کفار کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ رسول اللہ صلّی علیہ و آلہٖ وسلّم دین کے معاملے میں کسی کا لحاظ کر سکتے ہیں ۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے، اگر ایمان لے آئے اور اپنا غیر ہو جاتا ہے، اگر کفر کا راستہ اختیار کرے (دیکھیے تفہیم القرآن، ۲ : ۵۲۴)۔

ایک ایسے پُر آشوب دور میں جب اسلام اور ہادی اسلام پر زبان طعن دراز کی جا رہی تھی اس سورۃ کا نزول اگر ایک طرف حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی تشفی کے لیے تھا تو دوسری طرف یہ غلبۂ اسلام کی پیشگوئی اور آپ ؐ کی نبوت کا روشن ثبوت تھا ۔ اسی بنا پر ابن کثیر نے اسے معجزہ قرار دیا ہے : و فی ھذہ السورۃ معجزۃ ظاھرۃ و دلیل واضح علی النبوۃ (تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۵۶۵)۔

مآخذ : (۱) الراغب الاصفہانی : المفردات، مصر بلا تاریخ؛ (۲) السیوطی : الاتقان فی علوم القرآن، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۳) الفخر الرازی : التفسیر الکبیر، مصر، بلا تاریخ؛ (۴) ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، مصر، بلا تاریخ؛ (۵) محمد جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی، مصر، ۱۹۶۰ء؛ (۶) احمد مصطفٰی المراغی : تفسیر المراغی؛ (۷) ابو الاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۵ء؛ (۸) الترمذی : الجامع السنن، مصر ۱۹۳۴ء؛ (۹) السیوطی : لباب العقول فی اسباب النزول؛ (۱۰) مجد الدین الفیروز آبادی : بصائر ذوی التمییز، ۱ : ۵۵۲؛ (۱۱) امیر علی : تفسیر مواہب الرحمٰن)۔

(بشیر احمد صدیقی [و ادارہ])

لیاقت علی خان (نوابزادہ) : حصول پاکستان [رک بآں] کی جدوجہد میں قائداعظم محمد علی جناح [رک بہ محمد علی جناح] کے دستِ راست اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری، پاکستان کے پہلے وزیراعظم (۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء)؛ کرنال (مشرقی پنجاب) کے ایک متمول زمیندار خاندان میں یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے ۔ وہ نواب رستم علی خان کے دوسرے بیٹے تھے، جن کے مورث اعلٰی پانچ سو برس قبل ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے اور ان کا شجرۂ نسب ایران کے مشہور فرمانروا انوشروان سے جا ملتا تھا ۔ اپنے آبائی شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیاقت علی خان ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں گریجویٹ ہو کر اعلٰی تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے، جہاں ۱۹۲۱ء میں آکسفرڈ یونیورسٹی سے اصول قانون (Jurisprudence) میں آنرز کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۲۲ء میں انز ٹمپل سے بیرسٹری کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ اسی سال وطن واپس آ کر وہ مظفر نگر (یو ۔ پی) میں سکونت پذیر ہو گئے، جہاں ان کی خاندانی جائداد تھی ۔ ⊗

انھوں نے پنجاب ھائی کورٹ کے وکلا کی فہرست میں اپنا نام تو درج کرا لیا تھا، لیکن وکالت میں پیشہ ورانہ دلچسپی لینے کے بجاے وہ اپنا بیشتر وقت مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے کاموں میں صرف کرتے تھے ۔ ۱۹۳۰ء میں وہ مظفر نگر کی واحد مسلم درسگاہ ''مدرسہ'' کی مجلس انتظامیہ کے صدر مقرر ہوے اور ان کی مساعی سے اس کی مالی حالت بہت مستحکم ہو گئی۔

لیاقت علی خان کی انگلستان سے واپسی پر یو ۔ پی کے دو اہم کانگریسی رہنماؤں یعنی پنڈت گوبند ولبھ پنت اور مسٹر چنتامنی نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر سیاست میں حصہ لیں، لیکن انھوں نے یہ کہ کر انکار کر دیا کہ انھیں کانگریس کے نظریات سے اتفاق نہیں ۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی، اگرچہ اس وقت یہ جماعت مسٹر گاندھی کی سہ سالہ تحریک عدم تعاون کے باعث بالکل غیرمؤثر ہو چکی تھی ۔ لیاقت علی خان نے کانگریس اور مسٹر گاندھی کے اصل روپ کو اور ان خطرات کو بھانپ لیا تھا جو مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے لاحق ہو سکتے تھے ۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک یو ۔ پی کی صوبائی سیاست میں سرگرم حصہ لیا اور جلد ھی صف اول کے سیاسی رہنماؤں میں شمار ہونے لگے ۔ جب قائداعظم نے مسلم لیگ کے تنِ مردہ میں دوبارہ روح پھونکی اور مئی ۱۹۲۴ء میں اس کا لاھور میں اجلاس منعقد کیا تو لیاقت علی خان بھی اس میں شریک ہوے ۔ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سوال پر جب مسلم لیگ دو حصوں، یعنی شفیع لیگ اور جناح لیگ، میں بٹ گئی تو انھوں نے قائداعظم کا ساتھ دیا اور کمیشن کے بائیکاٹ کی حمایت کی ۔ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا اور مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ اس بارے میں اپنا نقطۂنظر واضح کرنے کے لیے قائداعظم کی قیادت میں ایک وفد انڈین نیشنل کنونشن میں بھیجا جائے جو اسی سال دسمبر میں کلکتے میں منعقد ہو رہا تھا ۔ لیاقت علی خان بھی اس وفد میں شامل تھے ۔ چونکہ کنونشن پر ھندو سبھا کا غلبہ تھا، اس لیے مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور مسلم لیگ کا وفد بالکل مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

۱۹۲۶ء میں لیاقت علی خان یو ۔ پی کی مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوے اور انھوں نے اس رکنیت کو ۱۹۴۰ء تک برقرار رکھا ۔ وہ قومی اھمیت کے ہر مسئلے پر اظہار خیال کرتے اور اکثر ان کی پر مغز تقریریں اراکینِ مجلس کی اکثریت کی ترجمانی کرتی نظر آتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی سال تک صوبائی مجلس کے نائب صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے ۔ مزیدبرآں انھوں نے وہاں ایک ''جمہوری پارٹی'' تشکیل دے لی تھی، جس کی قیادت وہ ۱۹۳۷ء تک کرتے رہے ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نئے انتخابات ہوے تو وہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں مسلم لیگ کی صوبائی اسمبلی پارٹی میں شامل ہوگئے، جس کے قائد چودھری خلیق‌الزمان تھے ۔ انھوں نے لیاقت علی خان کے بارے میں اپنی کتاب *Pathway to Pakistan* میں لکھا ہے : ''لیاقت علی خان ایک زوردار مقرر تھے اور انھیں اپنے مخالفین کا ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ملکہ حاصل تھا ۔ وہ اس نوک جھوک میں طنز و مزاح سے بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کام لیتے ۔ ان کی مسلم لیگ میں شمولیت سے نہ صرف پارٹی کو بہت تقویت پہنچی بلکہ اسمبلی سے متعلق میری ذمے داریوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا''۔

لیاقت علی خان کی پہلی شادی ان کی عم‌زاد جہانگیرہ بیگم سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے نواب زادہ ولایت علی خاں پیدا ہوے ۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے دوسری شادی بیگم رعنا سے کی جو اقتصادیات میں ایم اے اور تعلیم سے وابستہ تھیں ۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں اور سماجی رجحانات نے لیاقت علی خان کی سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کی جس میں کوشش کی گئی کہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے ادغام کے ذریعے مسلم لیگ کو مضبوط اور فعال جماعت بنایا جائے ۔ ۱۲ مارچ کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں ایک قرارداد کی رو سے قائداعظم محمد علی جناح سے درخواست کی گئی کہ وہ انگلستان سے واپس آجائیں اور اس نازک دور میں مسلمانان ہند کی قیادت فرمائیں ۔ ۱۰ فروری ۱۹۳۴ء کو مسلم کانفرنس کے ایک اجلاس میں سر آغا خان نے تجویز پیش کی کہ قائداعظم کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا جائے ۔ ۴ مارچ کو مسلم لیگ نے اپنا داخلی انتشار ختم کر کے قائداعظم کی عدم موجودگی ہی میں انھیں صدر منتخب کر لیا اور انھیں متحد شدہ جماعت کے سالانہ اجلاس کی تاریخ اور مقام انعقاد کے تعین کا اختیار دے دیا۔

لیاقت علی خان کا بھی یہی خیال تھا کہ اس وقت قائداعظم ہی ایسے شخص ہیں جو مسلمانوں اور مسلم لیگ کی رہنمائی کر سکتے ہیں، چنانچہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں انھوں نے قائداعظم کو آمادہ کیا کہ برصغیر واپس جا کر مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اپریل ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس کی صدارت کی، جس میں مسلمانوں نے، منجملہ آصف علی جیسے کانگریسی ذہن رکھنے والے زعما نے بھی، ان پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوے درخواست کی کہ اب وہ ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر کے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائیں ۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے قائداعظم کو مرکزی مجلس قانون ساز کا بلامقابلہ رکن منتخب کر لیا۔ وہ اس کے اجلاس میں شرکت کے بعد پھر انگلستان تشریف لے گئے، لیکن شرکت کے بعد جنوری ۱۹۳۵ء میں مستقل طور پر وطن واپس آ گئے اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کر دیا۔

۲۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا ۔ اس میں سر محمد یعقوب کے بجاے لیاقت علی خان کو مسلم لیگ کا اعزازی سکرٹری منتخب کیا گیا اور وہ اس عہدے پر، جولائی ۱۹۳۶ء سے اوائل ۱۹۳۸ء کے مختصر عرصے کو چھوڑ کر، قیام پاکستان تک فائز رہے ۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں وہ مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو کر انگلستان چلے گئے کیونکہ ان کا چودھری خلیق الزمان اور بورڈ کے دوسرے صوبائی ارکان سے اس بنا پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ ''یونٹی بورڈ'' کے ساتھ سمجھوتے کے باعث مسلم لیگ میں آصف علی جیسے نیشنلسٹ مسلمان اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے کانگرسی علما بھی داخل ہوگئے تھے اور اس سے لیاقت علی خان کے نزدیک مسلم لیگ کا جداگانہ تشخص مجروح ہو رہا تھا ۔ ۱۹۳۷ء کے اوائل میں لیاقت علی خان نے نواب چھتاری کی نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی، تاہم ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں انھوں نے اس پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب نہیں لڑا اور جب انتخابات کے بعد

کانگریس کے عدم تعاون کے باعث حکومت نے نواب چھتاری کو یو۔پی میں وزارت تشکیل کرنے کی دعوت دی تو لیاقت علی نے ان کی کابینہ میں شامل ہونا قبول نہ کیا۔ اسی طرح بعد ازاں جب پنڈت پنت نے اپنی کانگریسی کابینہ میں انھیں شامل ہونے کی پیشکش کی تو لیاقت علی خان نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ ایگریکلچرسٹ پارٹی میں شمولیت کے دوران بھی نہ صرف لیاقت علی خان بلکہ اس جماعت کے دوسرے ارکان بھی صوبائی مجلس میں مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کرتے رہے، جس کا چودھری خلیق الزمان نے بھی اعتراف کیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں لیاقت علی خان دوبارہ مسلم لیگ کے اعزازی سکرٹری منتخب ہوگئے۔ اس اثنا میں برصغیر کے بیشتر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں اور کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں سے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید اور جمعیت العلما کے دوسرے نیشنلسٹ علما مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ سے قطع تعلق کر کے کانگریس کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اقلیت میں ہونے کے سبب مسلمان کانگریس سے وابستہ ہوئے بغیر وزارتیں اور دوسرے عہدے حاصل نہیں کر سکتے۔ ادھر صوبائی سطح پر کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی جارحانہ روش اختیار کر لی تھی۔ یہ صورت حال مسلم لیگ کے لیے، جو ابھی پوری طرح ملک گیر سطح پر منظم نہیں ہو سکی تھی، ایک زبردست چیلنج بن کر سامنے آرہی تھی جو اس کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا، لیکن قائداعظم کی بے مثال قیادت اور لیاقت علی خان کی انتھک کوششوں سے صرف سال بھر میں برصغیر کے چپے چپے میں مسلم لیگ کی شاخیں ابھرآئیں اور جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا اعلان ہوا تو مسلم لیگ ایک نہایت منظم اور طاقتور سیاسی جماعت بن چکی تھی؛ چنانچہ جب ۱۹۳۹ء کے اواخر میں کانگریس کی صوبائی وزارتیں مستعفی ہوئیں اور قائداعظم نے یوم نجات منانے کا اعلان کیا تو مسلمانوں نے کانگریس کے دور میں ہونے والے مظالم کے خلاف پورے ملک میں ایسے زبردست مظاہرے کیے کہ انگریز حکمرانوں پر یہ ثابت ہوگیا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کے (جو بعدازاں قرارداد پاکستان کہلائی) منظور ہونے کے بعد مسلم لیگی رہنماؤں نے دو قومی نظریے کو مسلمانوں کے دل میں بٹھانے اور انھیں قرارداد لاہور کے مضمرات اور متوقع نتائج سے آگاہ کرنے کے لیے برصغیر کا طوفانی دورہ کیا اور صوبائی اور ملکی سطح پر کئی مسلم لیگ کانفرنسیں اور پاکستان کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں بلوچستان مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا: ''مسلم لیگ کا دو قومی نظریے پر مبنی منصوبہ نہ صرف پر وقار ہے بلکہ وہ ہندوستان کے روشن مستقبل کی ضمانت بھی بن سکتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ ایک کل ہند وفاق قائم ہو گیا تو تمام برصغیر میں مسلمان ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے اور ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگی''۔

اب لیاقت علی خان کا شمار قائداعظم کے بعد مسلمانوں کے اہم ترین رہنماؤں میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں وہ ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے۔ اس وقت تک مسلم لیگی اراکین اسمبلی ایک آزاد جماعت کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے، لیکن اب انھوں نے اسمبلی میں اپنی ایک علیحدہ پارٹی

کے قیام کا فیصلہ کیا اور قائداعظم اس کے لیڈر اور لیاقت علی خان ڈپٹی لیڈر منتخب ہوے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قائداعظم سیاسی اور آئینی معاملات میں اتنے منہمک ہوگئے تھے کہ اسمبلی میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا بار زیادہ تر لیاقت علی خان ہی کو اٹھانا پڑا ۔ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے حکومت کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کا آغاز کیا تو مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اس سے لاتعلق رہنے کی ہدایت کی کیونکہ اس کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا اہتمام کیے بغیر انگریزوں سے اقتدار حاصل کرنا تھا ۔ مسلم لیگ کو کانگریس کی بعض کارروائیوں کے پیش نظر یہ خدشہ تھا کہ وہ مسلمانوں میں داخلی اور خارجی فسادات برپا کرا کے ان کے حوصلے پست کرنا چاہتی ہے تا کہ وہ اپنے آپ کو بے آسرا سمجھ کر کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل ہی میں عافیت سمجھیں ۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ نے ایک ''سول ڈیفنس کمیٹی'' تشکیل کی، جس کے لیاقت علی خان ایک سرگرم رکن تھے ۔ اپریل ۱۹۴۳ء تک اس کمیٹی کے ارکان نے چودہ ہزار میل کا سفر کیا اور ہر صوبے میں مسلمانوں کو پوری طرح منظم کیا۔

۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں قائداعظم نے لیاقت علی خان کو اپنا دست راست قرار دیتے ہوے فرمایا : لیاقت علی خان نے نہایت تن دہی کے ساتھ شب و روز کام کیا ہے اور عام آدمی کے لیے یہ سمجھنا بھی بہت مشکل ہے کہ انھوں نے اپنے شانوں پر کتنا بار اٹھا رکھا ہے ۔ وہ کہلاتے تو نواب زادہ ہیں لیکن فکروعمل کے لحاظ سے بالکل عوامی کردار رکھتے ہیں اور ملک کے دوسرے نوابوں اور نوابزادوں کو چاہیے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں'' ۔ اسی اجلاس میں لیاقت علی خان کو مجلس عمل کا رکن منتخب کیا گیا، جسے ''سول ڈیفنس کمیٹی'' کی جگہ لینا تھی۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں اخبارات میں ''لیاقت ڈیسائی فارمولا'' کا بہت چرچا رہا اور اس سلسلے میں بعض گوشوں کی طرف سے لیاقت علی خان پر الزام تراشی بھی ہوئی (دیکھیے خلیق الزمان : *Pathway to Pakistan*) ۔ ہوا یہ تھا کہ ۱۹۴۴ء کے اواخر میں مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے لیاقت علی خان سے ملکی معاملات پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوے جنگ کے اثرات کے باعث عوام کی اقتصادی بدحالی پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ ایک قومی حکومت ہی ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا مداوا کر سکتی ہے ۔ اس نے دریافت کیا کہ مرکز میں وائسرائے کی ایگزکٹو کونسل کی ازسر نوتشکیل کر کے ایک عبوری حکومت بنانے کے متعلق مسلم لیگ کا کیا رویہ ہوگا ۔ لیاقت علی خان نے بتایا کہ اگر کانگریس کی طرف سے کوئی واضح منصوبہ پیش کیا گیا تو ان کے خیال میں مسلم لیگ اس پر پوری توجہ کے ساتھ غور کرے گی ۔ بعد کی ملاقاتوں میں مجوزہ عبوری حکومت کی تشکیل کے مختلف پہلوؤں پر غیررسمی گفتگو ہوئی اور ایک ممکنہ سمجھوتے پر اتفاق رائے ہوگیا، جس کی رو سے عبوری حکومت میں مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا تناسب مساوی طے پایا اور جس کے لیے مسلمانوں کو نامزد کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو تھا ۔ لیاقت علی خان نے یہ واضح کر دیا تھا کہ یہ گفتگو غیررسمی اور ذاتی نوعیت کی ہے؛ انھیں مسلمانوں کی طرف سے مفاہمت کا اختیار حاصل نہیں اور اس کے لیے قائداعظم کی منظوری لینا ضروری ہے ۔ ڈیسائی نے اپنے فارمولے کی بنیاد پر گفت و شنید

کو آگے بڑھانے کے لیے مسٹر گاندھی سے ایک تحریری اجازت نامہ بھی لے لیا اور اپنے طور پر اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرتے رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۴۵ء کو انھوں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک کل جماعتی عبوری حکومت کے قیام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ وائسرائے نے وزیرہند کو اس سے مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ ڈیسائی فارمولا سیاسی پیش رفت میں مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لیاقت علی خان سے غیر رسمی گفتگو نہ ہوئی ہوتی تو ڈیسائی فارمولا کچھ اور ہوتا اور مسلمانوں اور مسلم لیگ کی حیثیت اور اہمیت کو کانگریس کے بااثر حلقوں میں تسلیم نہ کیا جاتا۔ یہ فارمولا برطانوی کابینہ میں بھی زیر بحث آیا اور وائسرائے کو ہدایت کی گئی کہ وہ کوئی ایسی تجویز پیش کریں جس پر مرکزی اسمبلی کی دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں یعنی ڈیسائی اور قائداعظم کے درمیان اتفاق رائے ہوچکا ہو۔ جب اس ضمن میں قائداعظم سے رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے امر واقعہ بیان کر دیا کہ انھیں ایسے کسی سمجھوتے کا کچھ علم نہیں۔ اس سے قبل لیاقت علی خان بھی یہ کہ چکے تھے کہ ذاتی بات چیت کو معاہدے کا نام نہیں دیا جا سکتا اور ہندو مسلم حل کے لیے کوئی معاہدہ صرف مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہی ہوسکتا ہے۔ یوں ڈیسائی فارمولا اپنی موت آپ مر گیا، تاہم ہندو مسلم سیاست پر گہرے اثرات چھوڑ گیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں وائسرائے لارڈ ویول لنڈن گئے اور وہاں سے واپس آکر ۲۵ جون کو شملے میں اہم سیاسی رہنماؤں کا ایک اجلاس طلب کیا، جس میں لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔ یہ مذاکرات ناکام رہے، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے ایک بار پھر اپنا پرانا موقف اختیار کر لیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ قبول نہیں کر سکتی کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ادھر مسلم لیگ بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ کانگریس پورے ملک کے عوام کی نمائندہ جماعت ہے۔ لہٰذا نمائندگی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے وائسرائے نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان کر دیا۔

انتخابی مہم کا آغاز ہوا تو مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری کی حیثیت سے لیاقت علی خان نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے سارے برصغیر کا دورہ کیا جس کا مقصد حالات سے نسبۃً ناواقف مسلمانوں کو مسلم لیگ کے مقاصد سے پوری طرح آگاہ کرنا تھا۔ انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں جیت لیں اور کئی انتخابی حلقوں میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں۔ اس طرح مسلم لیگ کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

لیاقت علی خان شروع ہی سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں یو۔پی مسلم تعلیمی کانفرنس کے چالیس نکاتی مطالبات انھیں کی مساعی سے قبول کیے گئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں اینگلو عربک کالج دہلی کا صدر منتخب کیا گیا۔ یہ کالج عرصے سے بدحالی کا شکار چلا آ رہا تھا، لیکن لیاقت علی خان کی سرپرستی میں جلد ہی اس کا شمار ممتاز تعلیمی اداروں میں ہونے لگا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں انھوں نے کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی۔ ان کا خطبۂ صدارت بہت فکرانگیز تھا۔ ۱۶ فروری ۱۹۴۷ء کو انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے

جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوے مسلمانوں کی پس ماندگی اور بدحالی کو جدید علوم سے محرومی کا نتیجہ قرار دیا ۔ انھوں نے کہا : سائنس اور تحریک اسلام کے درمیان ایک ناگزیر رشتہ موجود ہے ۔ قرآن مجید میں تاریخ اور رموزِ فطرت کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے کیونکہ تاریخ کے مطالعے سے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کا پتا چلتا ہے اور سائنسی تحقیقات تسخیرِ کائنات میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آزادی کے لیے جدوجہد اس لیے نہیں کر رہے کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پا کر ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اپنی علٰحدہ آزاد اور خود مختار مملکت تشکیل کریں تاکہ ہم اس نصب العین تک پہنچ سکیں جس سے ہم کو تیرہ سو سال پہلے محمد عربی صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلّم نے روشناس کرایا تھا ۔ قرآن مجید کی رو سے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ صرف خدا کے لیے زندہ رہے اور خدا ہی کے لیے جان دے کیونکہ خدا ہی حقیقی حکمران ہے اور ساری حاکمیت اسی کی ذات میں مرتکز ہے ۔

۱۹۴۶ء میں حکومتِ برطانیہ کا سہ رکنی وزارتی وفد ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل تلاش کرنے آیا تو اس کے ساتھ گفت و شنید میں مسلم لیگ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے لیاقت علی خان نے بھی حصہ لیا ۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے وزارتی مشن کے منصوبے کو تسلیم کر لیا [تفصیل کے لیے رک بہ پاکستان]، لیکن کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک بیان نے، جس سے منصوبے کے ایک اہم عنصر، یعنی صوبوں کی لازمی گروہ بندی، سے انحراف کیا گیا تھا، مشن کی کارگزاری پر پانی پھیر دیا ۔ دریں اثنا وائسرائے نے منصوبے کے اس حصے پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جس کا تعلق ایک عبوری حکومت کی تشکیل سے تھا، لیکن قائد اعظم نے کانگریس کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ایک کانگریسی مسلمان کو عبوری حکومت میں شرکت کے لیے نامزد کرے ۔ اس صورت حال نے ایک سیاسی بحران پیدا کر دیا اور مسلم لیگ نے اپنی مقبولیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو ''یوم راست اقدام'' منانے کا فیصلہ کیا اور تمام خطاب یافتہ مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ انگریز حکمرانوں کے رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے خطابات سے دستبردار ہو جائیں ۔ اس موقع پر لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ آئندہ ان کے نام کے ساتھ ''نواب زادہ'' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے ۔ حکومت کے ساتھ مسلم لیگ کی اس محاذ آرائی سے فائدہ اٹھاتے ہوے کانگریس نے عبوری حکومت بنا لی، لیکن جلد ہی کانگریس کی مجلس عاملہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئی کہ کانگریس نے وزارتی منصوبے کو مکمل صورت میں منظور کیا ہے ؛ چنانچہ ۲۶ اکتوبر کو مسلم لیگ بھی عبوری حکومت میں شامل ہوگئی اور حکومت کے مسلم لیگی ارکان کی سربراہی لیاقت علی خان کو سونپی گئی ۔ محکمۂ خزانہ لیاقت علی خان کو سپرد کیے جانے پر کانگریس نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مسلم لیگ اقتصادی مسائل سے عہدہ برا نہ ہو سکے گی (دیکھیے ابوالکلام آزاد : *India Wins Freedom*؛ Hugh Tinker : *India and Pakistan*)؛ لیکن لیاقت علی خان نے نہ صرف نہایت خود اعتمادی سے مالیات کی ذمے داریاں سنبھالیں اور اپنے محکمے کو کانگریس کے ساتھ سیاسی جنگ میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا بلکہ حکومت میں مسلم لیگ بلاک کی سربراہی کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیے ۔

حکومت برطانیہ اور کانگریس دونوں کی یہ خواہش تھی کہ عبوری حکومت ایک کابینہ کی طرح کام کرے اور پنڈت نہرو وزیر اعظم کا کردار ادا کریں اور اس طرح ایک متحد ہندوستان کو کانگریس مسلم لیگ مخلوط حکومت کے حوالے کیا جا سکے ۔ وہ اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ حکومت میں شمولیت کے بعد مسلم لیگ کو ایک واحد دستور ساز اسمبلی میں بھی شامل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ مخلوط حکومت کو دستور ساز اسمبلی (جو پارلیمان بھی تھی) کے روبرو جواب دہ قرار دے کر ایک ایسے آزاد متحدہ ہندوستان کا نقشہ مکمل کر دیا جائے، جس پر حکمرانی کرنے اور جس کا دستور بنانے میں کانگریس اپنی عددی اکثریت کے ذریعے مسلم لیگ کو پاکستان کے مطالبے سے دستبردار کرا سکے ۔ حکومت برطانیہ اور کانگریس دونوں میں در پردہ یہ مفاہمت بھی موجود تھی کہ اگر مسلم لیگ اس راستے پر چلنے سے گریز کرے تو اسے عبوری حکومت سے خارج کر دیا جائے ۔ لیاقت علی خان نے قائد اعظم کی بصیرت افروز رہنمائی میں اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی شمولیت سے انکار اور پنڈت نہرو کو عبوری حکومت کا سربراہ تسلیم نہ کرنے کے باجود ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دی کہ مسلم لیگ حکومت سے دستبردار ہو جائے اور برصغیر کی سیاسی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں رہ جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس ''اکھنڈ بھارت'' کی بازی ہار گئی [تفصیلات کے لیے رک بہ پاکستان]۔

۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو لیاقت علی خان نے مرکزی اسمبلی میں نئے سال کا بجٹ پیش کیا ۔ ہندوستان کے پہلے غیر برطانوی ''وزیر خزانہ'' کے اس بجٹ کو ''پہلا قومی بجٹ'' اور ''غریب آدمی کا بجٹ'' کہہ کر پکارا گیا ۔ اس میں نمک پر ٹیکس ختم کر دیا گیا، ڈھائی ہزار روپے سالانہ تک کی آمدنی کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا، اور چائے پر برآمدی محصول بڑھا دیا گیا ۔ علاوہ ازیں تجارت میں ایک لاکھ سے اوپر منافع پر اور سرمائے کے پانچ ہزار سے زیادہ مالیت کے اضافے پر نئے ٹیکس تجویز کیے گئے اور بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کی انکم ٹیکس نہ دے کر جمع کی ہوئی خفیہ دولت کا پتا چلانے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ۔ ان تجاویز کا فوری رد عمل نہایت خوشگوار ہوا، لیکن اگلے ہی روز ہندو سرمایہ داروں نے، جن پر ان کی براہ راست زد پڑتی تھی اور جن کی اعانت پر کانگریس کے مالی استحکام کا انحصار تھا، ڈورپاں ہلانی شروع کر دیں ۔ اگرچہ لیاقت علی خان اس بجٹ کے بنیادی پہلو عبوری حکومت کے کانگریسی ارکان کو پہلے سے دکھا چکے تھے اور انہوں نے ان سے اتفاق کیا تھا، لیکن ہندو سرمایہ داروں کے واویلا نے کانگریس کو پیترا بدلنے پر مجبور کر دیا اور سردار پٹیل، جو وزیر داخلہ تھے، ہندو سرمایہ داروں کی دولت کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوے اور ٹیکسوں سے متعلق تجاویز کو واپس لینے کا مطالبہ شروع کر دیا ۔ ادھر یورپی سرمایہ دار بھی، جن کے بنگال میں چائے کے باغات اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بڑے بڑے کارخانے تھے، ان ٹیکسوں سے بری طرح متاثر ہو رہے تھے، چنانچہ وہ بھی کانگریس کے ہم نوا ہوگئے ۔ دریں اثنا مارچ میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہوکر آ گئے اور انہوں نے مداخلت کر کے لیاقت علی خان اور سردار پٹیل کو ایک درمیانی فارمولے پر رضا مند کر لیا۔

لیاقت علی خان کا صرف بجٹ ہی کانگریس

کے لیے درد سر نہیں بنا، ان کا محکمۂ خزانہ ''عبوری حکومت'' کے سارے دور میں کانگریس کے سر پر ایک برہنہ تلوار کی طرح لٹکتا رہا اور وہ یہ باور کرنے لگ گئے کہ مسلم لیگی رہنماؤں سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کو قائم ہونے دیا جائے۔ ان کو معلوم ہوا کہ چاہے کوئی محکمہ کیوں نہ ہو، اس میں ہر تقرری اور ہر تجویز کو بسر عمل لانے کے لیے محکمۂ خزانہ کی اجازت ضروری تھی اور ہر معاملے میں ممبر برائے خزانہ کو حق استرداد حاصل تھا۔ کانگریسی اراکین حکومت کو بہت جلد احساس ہونے لگا کہ وہ لیاقت علی خان کو خزانے کا محکمہ سونپ کر مسلم لیگ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔ خاص طور سے سردار پٹیل کو جنھوں نے مسلم لیگ کو یہ محکمہ سونپ دینے کا مشورہ دیا تھا، بہت تلخ تجربہ ہوا۔ ''عبوری حکومت'' یا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا جو کانگریسی رکن بھی کوئی منصوبہ تیار کرتا اس کو بعد میں معلوم ہوتا کہ لیاقت علی خان نے یا تو اس کو مسترد کر دیا تھا یا پھر اس کی شکل ایسی بنا دی تھی کہ وہ اپنا مقصد کھو بیٹھا تھا۔ سردار پٹیل کو معلوم ہوا کہ اگرچہ وہ ممبر برائے امور داخلہ تھے، لیکن لیاقت علی خان کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی بھی بھرتی نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ایگزیکٹو کونسل کے اندر یہ صورت حال سردار پٹیل کے لیے اتنی ناخوشگوار اور تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ وہ برصغیر کی تقسیم کے مؤید بنتے چلے گئے۔ ان کی انا اتنی مجروح ہوئی کہ انھوں نے تقسیم کے حق میں اپنا پورا زور صرف کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی ہر تجویز پر لیاقت علی خان کے حق استرداد کے استعمال سے شکستہ دل ہوئے اور انھوں نے غصے کے عالم میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب برصغیر کی تقسیم کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ ساتھ ہی ان کے دل میں یہ خیال بھی سما گیا کہ پاکستان کی مملکت ضروری وسائل سے محروم ہونے کے باعث بہت جلد دم توڑ دے گی۔ لہٰذا جب ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجویز پیش کی کہ برصغیر کی تقسیم ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل ہے تو سردار پٹیل نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ پنڈت نہرو بھی ان کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس کے حق میں ایک قرارداد پاس کر دی۔

جب برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ تیار ہو رہا تھا تو ہندوستان کی مسلح افواج کی تقسیم کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ لیکن لیاقت علی خان کو یہ احساس برابر ستائے جا رہا تھا کہ بغیر مسلح افواج کے پاکستان کا قیام بے معنی ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے وائسرائے کو ایک مراسلہ روانہ کیا، جس میں ان کی توجہ ہندوستان کی مسلح افواج میں مسلمانوں کی غیر تسلی بخش نمائندگی کی طرف مبذول کرائی اور یہ تجویز پیش کی کہ مسلح افواج کی فوری طور پر اس طرح از سر نو تنظیم کی جائے کہ تقسیم کے وقت ان کو بغیر کسی دقت کے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان منقسم کیا جا سکے۔ وائسرائے نے اس کا یہ جواب دیا کہ برصغیر سے انگریزوں کے انخلا سے قبل مسلح افواج کو منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ لیاقت علی خان نے مسلح افواج کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ تقسیم کا کوئی پیشگی منصوبہ اور اس پر عمل کرنے کا طریق کار وضع ہو جانا چاہیے، اس لیے انھوں نے وائسرائے کو ایک اور یادداشت روانہ کی جس کا عنوان

تھا ''ہندوستانی افواج کی تقسیم کے منصوبے کی تیاری''۔ چوھدری محمد علی کے مطابق لیاقت علی خان نے اس یادداشت میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ مسلح افواج کو اس طرح سے ترتیب دے لیا جائے کہ جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئے تو افواج کی تقسیم بھی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ لیاقت علی خان نے لکھا تھا کہ اس منصوبے کا ابتدائی مرحلہ یہ ہونا چاہیے کہ کمانڈر انچیف اور ان کا عملہ افواج کی تقسیم کا طریق کار وضع کریں۔ انھوں نے مزید لکھا تھا کہ حکومت برطانیہ نے برصغیر کی آزادی کے لیے جو تاریخ متعین کی ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوے اس کام میں بالکل تاخیر نہیں ہونا چاہیے۔ لیاقت علی خان کی اس تجویز کی کمانڈر انچیف سرکلاڈ اکنلیک اور ممبر برائے دفاعی امور سردار بلدیو سنگھ نے مخالفت کی۔ اس کے بعد ''ڈفنس کمیٹی'' میں لیاقت علی خان نے پھر یہ سوال اٹھایا اور کہا کہ اگر پاکستان کا قیام عمل میں آنا ہے تو مسلح افواج کی تقسیم کے منصوبے کی تیاری بھی ضروری ہے، لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اس مسئلے کو پھر یہ کہکر ختم کر دیا کہ اگر تقسیم کے سلسلے میں جلد بازی سے کام لیا گیا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے اور ایک ایسی صورت حال پیدا کر دیں گے جس میں مسلح افواج نیم منظم اور ناقابل اعتماد رہ جائیں گی''۔ انگریز حکمرانوں کے اس ٹال مٹول کے رویّے کے باعث مسلح افواج کی بروقت تقسیم نہیں ہو سکی جس کی وجہ سے اس قتل عام کو نہیں روکا جا سکا جس کا سلسلہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ شروع ہو گیا، لیکن لیاقت علی خان کا اس معاملے میں بار بار سلسلہ جنباتی کرنا ان کی سیاسی بصیرت اور انتظامی امور میں دقیق نظری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو انگریزوں نے برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کر دیا اور مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اسے منظور کر لیا۔ اب مسلم لیگ کے سامنے پاکستان کی نئی مملکت کو چلانے کا نہایت مشکل مرحلہ پیش آنے والا تھا۔ قائد اعظم کو اس نئی مملکت کا گورنر جنرل اور لیاقت علی خان کو اس کا وزیر اعظم ہونا تھا۔ ان دونوں رہنماؤں نے نہ صرف ان نئی ذمےداریوں کو سنبھالنے کی تیاری کرنا تھی بلکہ اس سے قبل ''کونسل برائے تقسیم'' میں بھی پاکستان کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ یہ کونسل متحد ہندوستان کے اثاثوں کی تقسیم، دونوں مملکتوں کے درمیان واجبات کا تعین، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل سے نپٹنے کے لئے تشکیل کی گئی تھی۔ بحیثیت وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنے آپ کو نہایت مشکل اور تکلیف دہ مسائل سے گھرا ہوا پایا۔ پہلا مسئلہ تربیت یافتہ سرکاری ملازمین کی کمیابی تھی۔ کل ہند ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ ۲۵ فیصد تھا، لیکن ریکارڈ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ در حقیقت ان ملازمتوں میں گیارہ فیصد سے زیادہ مسلمان موجود نہیں تھے اور ان میں بھی گزیٹیڈ افسروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس مشکل میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ جو ریل گاڑی دھلی سے مسلمان افسروں یا اور سرکاری دستاویزات کو پاکستان لا رہی تھی اس پر راستہ میں زبردست حملہ ہوا اور نتیجۃً دستاویزات کا بہت بڑا حصہ تباہ ہو گیا اور کئی افسر قتل یا زخمی ہو گئے، لیکن جو افسر بھی پاکستان کو میسر آئے انھوں نے نہایت جوش و خروش اور پاکستان کے ساتھ نہایت والہانہ محبت کے جذبہ کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے صندوقوں پر بیٹھ کر شب و روز

کام کرنے لگ گئے اور انھوں نے تنخواھیں ملنے کی غیر یقینی صورت حال کی بھی پرواہ نہیں کی کیونکہ وہ قائد اعظم کو اپنا باپ، لیاقت علی خان کو اپنا شفیق بھائی اور پاکستان کو اپنا گھر تصور کرتے تھے ۔ سرکاری افسروں کے اس جذبے کو لیاقت علی خان نے ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا: ''میں یہ بات واضح کرنا اپنا فرض سمجھتا ھوں کہ پاکستان میں انتظامی مشینری کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کا سہرا نہ تو میرے سر ھے اور نہ میرے وزیروں کے، اس معاملے میں داد کے حقیقی مستحق ھمارے وہ افسر ھیں جنھوں نے غیر معمولی جذبے اور جانفشانی کے ساتھ کام کیا'' ۔ لیاقت علی خان کو در پیش دوسرا مسئلہ اقتصادی تھا ۔ متحد ھندوستان کے مالی اثاثے میں سے پاکستان ۷۵ کروڑ روپے کا حقدار تھا، لیکن بھارت نے صرف ۲۰ کروڑ روپے ادا کیے اور باقی رقم کے متعلق ٹال مٹول شروع کر دی؛ چنانچہ ایک موقع ایسا بھی آ گیا جب لیاقت علی خان کو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اگلے ماہ سرکاری ملازمین کی تنخواھیں ادا کی جا سکیں گی ۔ ایسا ھی سانحہ افواج اور سامان جنگ کی تقسیم کے سلسلے میں پیش آیا ۔ ''مشترک دفاعی کونسل'' کے فیصلے کے مطابق پاکستان کو افواج اور سامان جنگ کا ایک تہائی حصہ ملنا تھا، لیکن پاکستان کو یہ حصہ صرف کاغذ پر ھی ملا ۔ جیسا کہ پہلے ھی بتایا جا چکا ھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس کی ملی بھگت کے باعث لیاقت علی خان کا یہ بار بار مطالبہ کہ پاکستان کے قیام سے قبل اس کو ملنے والی فوج اور سامان جنگ میں اس کے حصے کا تعین کر دیا جائے، بےسود ثابت ھوا تھا؛ چنانچہ ساری فوج میں کوئی خالصۃً مسلم ریجمنٹ تشکیل ھی نہیں دی گئی تھی اور پاکستان کے حصے میں ایسے فوجی ڈال دیے گئے تھے جو سارے برصغیر میں منتشر تھے، لہٰذا پاکستان کے حصے میں فی الفور صرف برائے نام فوج ھی آئی ۔ سامان جنگ میں سے بھی بھارت نے پاکستان کو، ایک برائے نام حصہ ھی منتقل کیا اور جب کشمیر میں جنگ شروع ھو گئی تو باقی ماندہ حصہ دینے سے بالکل انکار کر دیا ۔ تیسرا مسئلہ، سب سے زیادہ سنگین تھا ۔ سکھوں نے برصغیر کی تقسیم سے بہت قبل مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا تاکہ وھاں ایک سکھ صوبہ بنایا جا سکے، اور سکھ رھنما مسلمانوں کے خلاف سخت اشتعال انگیز تقریریں کرنے لگ گئے تھے ۔ ان دنوں لیاقت علی خان نے کئی بار پنجاب کے گورنر سر ایون جینکنز سے مطالبہ کیا تھا کہ اشتعال پھیلانے والے سکھ رھنماؤں کو گرفتار کیا جائے، لیکن گورنر نے کوئی کارروائی نہیں کی ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ مشرقی پنجاب میں وسیع پیمانے پر قتل اور لوٹ مار کا آغاز ھو گیا، لاکھوں مسلمان شہید ھو گئے اور جو بچ گئے وہ قافلہ در قافلہ پاکستان میں داخل ھونا شروع ھو گئے ۔ ان لٹے پٹے مہاجروں کی آباد کاری ایک سنگین مسئلہ بن گئی ۔ ادھر پنجاب میں صورت حال اتنی دگرگوں تھی کہ کچھ لوگوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ بھارت پنجاب پر حملہ کر دے گا؛ چنانچہ قائد اعظم نے لیاقت علی خان کو ھدایت کی کہ وہ فوراً لاھور چلے جائیں کیونکہ اگر بھارت نے حملہ کر دیا تو پاکستان کا دفاع کراچی سے نہیں بلکہ لاھور سے ممکن ھو سکے گا ۔ شدید طور پر علیل ھونے کے باوجود لیاقت علی خان نے مصیبت اور ابتلاء کا یہ سارا دور لاھور میں گزارا ۔ وہ لگاتار پاک ۔ بھارت سرحد پر جا کر صورت حال کا جائزہ لیتے رھے ۔ اس کے

علاوہ، وہ متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے عوام کے حوصلے بلند رکھنے کی ممکن کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اگر سرحد پار سے تشویشناک خبریں موصول ہوں تو انتقامی کارروائی کر کے بھارت کو جارحیت کا موقع ہر گز فراہم نہ کریں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنڈت نہرو سے بھی رابطہ قائم کیا اور پھر دونوں نے ملکر سرحد کے دونوں طرف علاقوں کے دورے کر کے حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں کیں۔ اس طرح متوقع وقت سے بہت کم عرصہ میں قائد اعظم کی رہنمائی اور لیاقت علی خان کی شب و روز محنت سے پاکستان ایک نہایت خطرناک دور سے سلامتی کے ساتھ گزر گیا، لیکن ابھی پاکستان کے مقدر میں کچھ بدنصیبیاں لکھی تھیں؛ چنانچہ قائد اعظم شدید طور پر بیمار ہو گئے اور ان کو آرام کے لئے زیارت (بلوچستان) جانا پڑا۔ قائد اعظم کی بیماری کے دوران میں مملکت کا سارا کام لیاقت علی خان کو سنبھالنا پڑا اور تمام فیصلے خود ہی کرنا پڑے۔

۱۱ اگست ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ اب تک لوگ قائد اعظم اور پاکستان کو لازم و ملزوم سمجھتے آئے تھے اور ان کے خیال میں ایسا کوئی رہنما موجود نہیں تھا جو قائد اعظم کی جگہ لے سکے۔ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کے بد خواہ پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ قائد اعظم کے انتقال کے بعد پاکستان اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے گا۔ انگلستان سے جارج برنارڈ شا نے پنڈت نہرو کو لکھا: ''ہوسکتا ہے کہ جناح کی وفات آپ کے انگلستان آنے میں رکاوٹ بن جائے کیونکہ اگر پاکستان میں ان کا کوئی لائق جانشین موجود نہ ہوا تو پھر آپ ہی کو سارے بر صغیر پر حکومت کرنے کا فرض ادا کرنا پڑ جائے گا''، لیکن لیاقت علی خان نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور قائد اعظم نے ان پر جو اعتماد کیا تھا اس کو صحیح ثابت کر دکھایا۔ انہوں نے سارے پاکستان کا دورہ کیا اور بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر کے اس اندیشے کو بالکل ختم کر دیا کہ کوئی داخلی بحران یا سازش بھارت کی جارحیت کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ سارے پاکستانی اپنی آزادی سے محرومی پر بھوک سے مر جانے کو ترجیح دیں گے۔ انہوں نے پاکستانیوں کو بتایا کہ ''اگر بھارت نے حملہ کیا تو نہ صرف میں اور میرے ساتھی بلکہ پاکستان کا ہر فرد اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دے گا، لیکن پاکستان کی ایک انچ زمین بھی دشمنوں کو نہیں ہتھیانے دے گا''۔ قائد اعظم کے انتقال کے بعد چند ہی دنوں میں نہ صرف پاکستانیوں بلکہ غیر ممالک کے مدبروں کو بھی یقین ہو گیا کہ پاکستان میں زندہ رہنے اور اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور لیاقت علی خان قائد اعظم کی جانشینی کا فرض ادا کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو جائیں گے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لیاقت علی خان کا لنڈن جا کر دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کرنا یہ ثابت کر رہا تھا کہ قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستان کو جو خطرات لاحق ہو سکتے تھے ان سب کا سدباب کر لیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ لیاقت علی خان نے لنڈن میں نہایت خود اعتمادی اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے دوسرے وزرائے اعظم کو بتایا کہ پہلے ان کو یہ بھروسہ تھا کہ دولت مشترکہ ایک ایسا خاندان تھا جس میں دو اراکین کے درمیان تنازعات انصاف اور بھائی چارے کے تقاضوں کے مطابق طے کیے جا سکتے تھے، لیکن اب ان کا یہ اعتماد ختم ہوتا

جا رہا تھا (ان کا اشارہ کشمیر کے تنازعہ کی طرف تھا) ۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''برطانیہ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ پاکستان اس کی جیب میں ہے'' ۔ انھوں نے برطانیہ کے رویہ (یعنی بھارت کو پاکستان پر ترجیح دینے کی روش) پر سخت تنقید کی اور اعلان کیا کہ ان کا ملک دولت مشترکہ کے مقاصد کی تکمیل میں حصہ لینے کو تیار تھا، لیکن دوسرے ملکوں کے ساتھ مساوی سطح پر، ان میں سے کسی کے پیروکار کی حیثیت سے نہیں ۔

پاکستان کی معیشت بھی بہت جلد مستحکم ہو گئی ۔ اس کو ستمبر ۱۹۴۹ء میں ایک سخت امتحان سے گذرنا پڑا جس میں اس نے اپنے استحکام کا ثبوت فراہم کر دیا ۔ اس ماہ میں انگلستان نے پاونڈ اسٹرلنگ کی قیمت میں کمی کر دی اور ساتھ ہی بھارت نے بھی اپنے روپے کی قیمت گرا دی ۔ اس موقع پر پاکستان نے اپنے روپے کی قیمت بحال رکھنے کا فیصلہ کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور بھارت میں تو اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی کیونکہ اب پاکستان کے سو روپے بھارت کے ایک سو پچاس روپے کے برابر تھے ۔ بھارت نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ۔ اس نے پاکستان کی مقرر کردہ زر مبادلہ کی شرح کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور پاکستان کے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع کر لیے ۔ بھارت نے اس خیال سے کہ پاکستان میں ذرائع آمد و رفت مفلوج ہو جائیں گے اس کو کوئلے کی فراہمی بند کردی (اس وقت پاکستان کی تمام ریل گاڑیوں کے انجن بھارت سے درآمد کیے ہوئے کوئلے سے چلتے تھے) ۔ لیاقت علی خان نے کوئلہ حاصل کرنے کا متبادل ذریعہ تلاش کر لیا اور دریں اثنا بھارت کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے ڈھاکہ میں اپنی کابینہ کا اجلاس طلب کیا ۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ بھارت نے پاکستانی روپے کی قیمت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا پاکستان بھی بھارت کو کپاس اور پٹ سن فراہم نہیں کرے گا ۔ لیاقت علی خان نے ڈھاکہ میں وزیر اعلیٰ نورالامین کی کوٹھی پر مسلم لیگ کے رہنماؤں کا ایک خفیہ اجلاس طلب کیا، جس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا: ''جب تک بھارت ہمارے روپے کی قیمت کو تسلیم نہیں کرتا، ہم اسے ایک اونس پٹ سن بھی نہیں دیں گے ۔ ہم اپنا پٹ سن خلیج بنگال میں غرق کر دیں گے مگر بھارت کے ہاتھ فروخت نہیں کریں گے'' ۔ لیاقت علی خان نے پٹ سن کی اندرون ملک خرید میں سہولت فراہم کر دینے کے لیے ''نیشنل بنک آف پاکستان'' قائم کر دیا ۔ بہر حال کوئی داخلی یا خارجی دباؤ لیاقت علی خان کو ان کا موقف تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکا حتّٰی کہ چھ ماہ کے اندر بھارت نے ہار مان لی اور پاکستانی سکّے کی مقرر کردہ قیمت کو تسلیم کر لیا ۔

لیاقت علی خان کے دور حکومت میں صوبائی سطح کے سیاسی رہنماؤں میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی، لیکن انھوں نے اپنی بہترین مدبرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک میں سیاسی استحکام قائم رکھا ۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ اور وزیر خزانہ میاں ممتاز دولتانہ کے درمیان اکتوبر ۱۹۴۸ء ہی میں رسہ کشی شروع ہو چکی تھی ۔ یہ زور آزمائی اتنی سنگین شکل اختیار کر گئی کہ لیاقت علی خان کو جنوری ۱۹۴۹ء میں ممدوٹ وزارت کو برخاست اور صوبائی اسمبلی کو تحلیل کر کے صوبہ کا نظم و نسق آئین کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنر سر فرانس موڈی کے سپرد کرنا پڑا ۔ اس صورت حال میں صوبائی مسلم لیگ نے یہ مطالبہ شروع کر دیا

کہ گورنر کو مطلق العنان حکمران نہ بنایا جائے اور ان کے ساتھ صوبائی لیگ کی نامزد کردہ ایک ''کابینہ'' وابستہ کر دی جائے ۔ اس تجویز سے گورنر کے متفق نہ ہونے کے باوجود لیاقت علی خان نے اس کو قبول کر لیا ۔ صوبائی مسلم لیگ کے ممدوٹ نواز گروہ نے گورنر موڈی کے خلاف ایک تحریک شروع کر رکھی تھی، لہٰذا لیاقت علی خان نے گورنر موڈی کا استعفیٰ قبول کر کے ان کی بجائے سردار عبدالرب نشتر کو جو ''عبوری حکومت'' کے رکن رہ چکے تھے پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور صوبائی مسلم لیگ کے نامزد کردہ مشیر بھی گورنر کے ساتھ کام کرنے لگے ۔ لیاقت علی خان کے ان اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سیاسی تنازعات کو زیادہ دور تک نہیں جانے دیتے تھے اور معقول سیاسی سمجھوتوں کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے ۔ ادھر سندھ کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو ایک متنازعہ شخصیت بن گئے تھے اور ان کو بھی عہدہ سے دستبردار ہونا پڑ گیا ۔ وہ عہدہ سے ہٹنے کے بعد بھی ایک مسئلہ بنے رہے ۔ سرحد میں وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان اور پیر صاحب آف مانکی شریف کے درمیان خاصی محاذ آرائی ہو رہی تھی، لیکن لیاقت علی خان نے اس کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کرا دیا ۔ اس کے بعد خان عبدالقیوم خان اور صوبائی مسلم لیگ کے ایک گروہ جس کی قیادت یوسف خٹک کر رہے تھے، کے درمیان کچھ تلخی سی شروع ہوئی ۔ چونکہ سرحد کے معاملات نازک تھے اور افغانستان وہاں ''پختونستان'' کا پروپیگنڈا کر رہا تھا لہٰذا لیاقت علی خان وہاں کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے خود تشریف لے گئے اور مسلم لیگ کے داخلی نزاع کو ابتدا ہی میں ختم کر دیا ۔ انھوں نے ایسے حالات میں جب ملک کو بیرونی خطرات بھی درپیش تھے، داخلی انتشار پر نہایت آزمودہ کار سیاستدان کی طرح قابو پا لیا اور اس کو بحرانی شکل اختیار نہیں کرنے دی ۔

ان سیاسی مسائل سے نپٹنے کے ساتھ ساتھ لیاقت علی خان نے مملکت کو مستحکم کرنے کا کام جاری رکھا ۔ چونکہ دفاع کا محکمہ ان ہی کے پاس تھا لہٰذا انھوں نے بری فوج ، فضائیہ اور بحریہ کو منظم کرنے اور ان کا معیار کارکردگی بلند کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی ۔ انھوں نے مسلح افواج میں انگریز افسروں کی بجائے پاکستانی افسروں کو تقرر کرنے کے لیے تیزی سے اقدامات کیے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی مد نظر رکھا کہ افواج کی صلاحیتوں میں کمی نہ آنے پائے ۔ افواج کو مکمل طور سے قومیانے کی پالیسی کے تحت انھوں نے جنوری ۱۹۵۱ء میں جنرل محمد ایوب خان کو پاکستان کا پہلا مسلمان کمانڈر انچیف مقرر کیا ۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں چودھری خلیق الزمان نے اپنے گھر پر مہاجروں کے ایک انبوہ کثیر کے مظاہرے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تو لیاقت علی خان نے یہ ذمّے داری بھی خود سنبھال لی ۔ ان کے مخالفین نے کہا کہ وزارت عظمٰی کے ساتھ مسلم لیگ کی قیادت بھی سنبھال لینا ایک آمرانہ اقدام تھا ۔ ان معترضین کا جواب دیتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا :''آمریت تو میری فطرت ہی میں نہیں ہے ۔ میں تو مسلم عوام کو متحد کرنے اور ان میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا متمنی ہوں تاکہ اگر مستقبل میں کوئی شخص آمر بننے کا خواب دیکھے بھی تو اس کو عملی طور پر ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو'' ۔

لیاقت علی خان جمہوری اداروں کی افادیت میں اعتقاد رکھتے تھے ۔ چنانچہ جب ان سے کچھ لوگوں نے کہا کہ پاکستان کے عوام ان پڑھ اور

غیر تعلیم یافتہ ہیں اور یہاں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے ادارے نہیں چل سکتے تو انھوں نے جواب دیا کہ عوام کا شعور ان کو ذمّے داریاں سونپ کر ہی پختہ کیا جا سکتا ہے اور تعلیم کا حصول بھی شعور کی پختگی کے ساتھ فروغ پا سکتا ہے ۔ انھوں نے کہا ''عوام میں ذہانت کے فقدان کا چرچا کرنے سے آمریت کے لیے راہ ہموار ہوگی اور جو لوگ اپنے آپ کو زیادہ عقلمند سمجھ کر عوام کی خواہشات اور رائے کا احترام کیے بغیر بہتر طور پر حکومت چلانے کا دعوٰی کریں گے وہ در اصل عوام کی آزادی کو سلب کرنے کے خواہاں ہیں'' ۔

پاکستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات آج تک معمول کے مطابق نہیں ہو سکے ۔ لیاقت علی خان کے زمانے میں بھی کئی دفعہ جنگ تک نوبت پہنچ گئی تھی ۔ دونوں مملکتوں کے درمیان پہلا خطرناک تنازعہ متحدہ ہندوستان کے اثاثوں اور واجبات کی تقسیم پر ہوا ۔ اس کے بعد مشرقی پنجاب کے ہولناک فسادات، جو تقسیم سے قبل ہی شروع ہو چکے تھے، دوسری عالمی جنگ کی تباہی اور خونریزی کو بھی مات کر گئے۔ مصیبت تو پاکستان پر آئی ہوئی تھی، لیکن اُلٹا حملہ کرنے کا ارادہ بھارت کرنے لگا ۔

تیسرا نازک موقع اس وقت پیش آیا جب ۱۹۴۷ء ہی میں کشمیر کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور پاکستان کے غیر منظم جانباز بھارت کی باقاعدہ اور منظم فوج سے نبرد آزما ہوئے ۔ بھارت اس معاملے کو اقوام متحدہ میں لے گیا جس نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا ۔ لیاقت علی خان نے یہ فیصلہ قبول کر لیا کیونکہ ان کی رائے میں پاکستان کی فوج پوری طرح منظم نہیں تھی ۔ وہ اپنے تمام وسائل استعمال کر چکا تھا اور پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف نے بھارت کے گورنر جنرل ماونٹ بیٹن سے ساز باز کر کے کورا جواب دے دیا تھا کہ پاکستان کے انگریز فوجی اس جنگ میں ملوث ہونے کو تیار نہیں ۔

جنگ بندی کے باوجود کشمیر کی سرحدوں پر ابھی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے کہ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں کلکتے میں پھر فسادات ابل پڑے ۔ ہندو راہنماؤں اور پریس نے پاکستان کے خلاف جنگ کرنے کا سبق دھرانا شروع کر دیا ۔ بھارت نے اپنی مسلح افواج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جمع کرنی شروع کر دیں ۔ ادھر مغربی بنگال کے تباہ و برباد مسلمانوں کا مشرقی پاکستان میں تانتا بندھ گیا ۔ فوری طور پر ان فسادات کا ڈھاکے میں بھی کچھ رد عمل ہوا ، لیکن لیاقت علی خان نے تدبر سے کام لے کر وہاں امن قائم کر دیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ بھارت پاکستان کو ختم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا جبکہ ابھی پاکستان پوری طرح مستحکم بھی نہیں ہونے پایا تھا ۔ مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کی حکومتوں نے ۱۹۵۰ء میں قیام امن کے لیے اقدامات کی غرض سے مذاکرات کیے، لیکن پنڈت نہرو اور سردار پٹیل برابر پاکستان کے خلاف بیانات دیتے رہے ۔ اس موقع پر چودھری خلیق الزمان نے تجویز پیش کی کہ مغربی اور مشرقی بنگال کے درمیان ہندوؤں اور مسلمانوں کا تبادلہ کر لینا چاہیے ، لیکن لیاقت علی خان نے اسے مسترد کر دیا اور مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے ایک طرف مسلمانوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی تلقین کی اور دوسری طرف غیر مسلم اقلیتوں کو تحفظ کا یقین دلایا ۔ اس وقت پنڈت نہرو کے الفاظ میں پاکستان اور بھارت جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کو مذاکرات کے لیے کراچی آنے کی دعوت دی ، لیکن انھوں نے بیماری کا بہانہ بنا کر

لیاقت علی خان کو دہلی آ کر بات چیت کرنے کی دعوت دے دی ۔ لیاقت علی خان دہلی گئے جہاں ایک ہفتے تک مذاکرات ہوتے رہے اور نتیجۃً ''لیاقت نہرو معاہدے'' پر دستخط ہو گئے ، جس کے تحت اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور فسادات کی صورت میں دونوں ملکوں کے درمیان رابطے کا بندوبست کیا گیا ۔ لیاقت نہرو معاہدے کا مسودہ آج بھی دونوں ملکوں کے دفاتر خارجہ میں موجود ہے اور بھارت کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے کہ بھارت کے مسلم کش فسادات بھارت کا داخلی معاملہ ہیں، جن کے خلاف پاکستان احتجاج نہیں کر سکتا ۔

۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو پنڈت نہرو نے جنگ نہ کرنے کے ایک مشترکہ اعلان کا مسودہ لیاقت علی خان کو بھجوایا ۔ لیاقت علی خان نے ۱۴ فروری ۱۹۵۰ء کو اس کا مفصل جواب دیتے ہوئے لکھا کہ اقوام متحدہ کی رکنیت بجائے خود اس امر کا اعلان ہے کہ بین الاقوامی مسائل جنگ کے ذریعے حل نہ کیے جائیں ۔ پاکستان اس تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے، تاہم مشترکہ اعلان کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کی روح کے مطابق کچھ عملی اقدامات کیے جائیں، یعنی مسائل کے حل کے لیے ایک واضح طریق کار اور اس کی تکمیل کے لیے اوقات کا تعین کیا جائے ۔ مثال کے طور پر ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ مشترکہ اعلان کے دو ماہ کے اندر تمام تنازعات کو براہ راست گفت و شنید کے ذریعے طے کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ گفت و شنید کامیاب نہ ہو تو مزید دو ماہ کے اندر ان تنازعات کو کسی تیسرے فریق کی مدد کے ذریعے طے کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ کوشش بھی ناکام رہے تو زیر بحث تنازعات خود بخود کسی پہلے سے طے شدہ قاعدے کے مطابق ایک ایسے جج کے دائرۂ اختیار میں چلے جائیں جس کا فیصلہ حتمی ہو گا ۔ پنڈت نہرو صرف جنگ نہ کرنے کے اعلان پر اصرار کرتے رہے اور لیاقت علی خان اس اعلان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے طریق کار پر زور دیتے رہے ۔ یہ خط و کتابت نومبر ۱۹۵۰ء تک جاری رہی اور پنڈت نہرو نے کوئی قابل قبول دلیل پیش نہ کرنے کے باعث جنگ نہ کرنے کے مشترکہ اعلان کی تجویز پر اصرار کرنا بند کر دیا ۔

جولائی ۱۹۵۱ء میں بھارت نے پھر اپنی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع کرنا شروع کر دیں ۔ لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو سے فوجیں ہٹانے کا مطالبہ کیا اور پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام تنازعات، بالخصوص تنازع کشمیر، کا تصفیہ کرنے کے لیے ایک پانچ نکاتی امن منصوبہ تجویز کیا، لیکن پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ لاہور، سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی میں مقیم پاکستانی افواج بھی بھارت کی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں ۔ انھوں نے مزید کہا کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں کی مرضی سے طے ہو گا نہ کہ پاکستان کی مرضی سے ۔ لیاقت علی خان نے اس کے جواب میں یکم اگست کو ایک تار دیا جس میں لکھا :

''آپ نے یکایک یہ تحقیق کی ہے کہ پاکستانی فوجوں کا اپنے زمانۂ امن کے اڈوں پر قیام بھی بھارت کے لیے خطرے کا باعث ہے ۔ لاہور ، سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے برصغیر کی تقسیم سے قبل بھی فوجی چھاونیاں تھیں اور ہماری فوجیں وہاں چار سال سے مقیم ہیں، لیکن اس تمام عرصے میں آپ کے ذہن میں خطرے کا کوئی خیال نہیں آیا ۔ آپ کی سرحدوں سے جہلم سو میل سے زیادہ اور راولپنڈی ڈیڑھ سو میل ہے ۔ چونکہ مغربی پاکستان کا عرض تقریباً تین سو میل ہے لہٰذا کوئی شخص جو ذرا سی بھی عقل رکھتا ہے ان مقامات پر ہماری فوجوں کے

قیام کو بھارت کے لیے خطرہ قرار نہیں دے سکتا'' ۔ ''کشمیر کے مسئلے'' پر پنڈت نہرو کے موقف کا جواب دیتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا : ''آپ نے کہا ہے کہ بھارت یا پاکستان کشمیریوں کے مستقبل کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ کشمیر کے عوام خرید و فروخت کی جنس نہیں ہیں اور انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا پیدائشی حق حاصل ہے ۔ یہ قابل تحسین محسوسات ہیں، لیکن آپ کا کشمیر پر قبضہ ان محسوسات کی نفی کرتا ہے ۔ آپ کے کشمیر پر دعوے کی بنیاد کشمیریوں کی خواہش نہیں ہے، بلکہ ایک ایسے ہندو مہاراجا کا عمل ہے جس نے کشمیریوں کی پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی واضح خواہش کے برعکس بھارتی رہنماؤں سے سازش کرکے کشمیریوں پر ڈوگرا فوج سے حملے کرائے اور جب کشمیریوں نے مہاراجا کے اقتدار کے جوے کو اپنی گردن سے اتار پھینکا تو اس نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کے ایک سراسر ناجائز معاہدے پر دستخط کرکے اس کے عوض بھارتی فوج کی امداد حاصل کر لی تاکہ حریت کی جنگ لڑنے والے مجاہدوں کو غلام بنایا جا سکے'' ۔ پنڈت نہرو کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے کہ پاکستانی فوج کے کشمیر پر حملے کے باعث اقوام متحدہ کے زیر اثر ہونے والا پاک ۔ بھارت معاہدہ غیر مؤثر ہو گیا تھا، لیاقت علی خان نے کہا ''میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان یہ معاہدہ بھارتی فوجوں کے حملے، قبائل کے داخلے اور پاکستانی فوجوں کی اس جنگ میں شرکت کے بعد ہوا تھا، لہٰذا اب آپ ان واقعات کو دہرا کر معاہدے پر عمل کرنے سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتے'' ۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ ''اقوام متحدہ کی زیر نگرانی استصواب رائے کی راہ میں صرف یہ رکاوٹ ہے کہ آپ کشمیر سے اپنی فوجیں واپس بلانے سے انکار کر رہے ہیں ۔ اقوام متحدہ، اس کے ذیلی ادارے اور غیر جانبدار مدبر مثلاً دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم سبھی آپ سے اپنے وعدوں کا احترام کرانے میں ناکام رہے ہیں ۔ آپ کہتے ہیں کہ استصواب رائے میں اس لیے دیر ہو رہی ہے کہ استصواب سے قبل کے حالات پر بھارت اور پاکستان میں اتفاق رائے نہیں ہے، لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان حالات کا تعلق تو اس بین الاقوامی معاہدے ہی میں موجود ہے جس پر آپ نے دستخط کیے ہیں ۔ مگر اب آپ اس معاہدے سے انحراف کرنے کے لیے اپنی ایجاد کی ہوئی ناقابل قبول تفسیروں کے پیچھے پناہ لے رہے ہیں ۔ اس معاملے میں پیش رفت صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ دونوں فریق اپنے تمام اختلافات کے ضمن میں سلامتی کونسل کے فیصلے اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان کی قرار دادوں پر انحصار کریں'' ۔ اس تار میں لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کی توجہ بھارت میں سیاسی رہنماؤں اور اخبارات کی پاکستان کے خلاف زہر افشانی کی طرف مبذول کرائی اور ان کو بتایا کہ اس صورت حال سے اپریل ۱۹۵۰ء کے معاہدۂ دہلی کی خلاف ورزی ہو رہی تھی جس کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا بند کرانے کی ذمے داری قبول کی تھی ۔ انھوں نے کہا : اس ضمن میں بھی آپ معاہدۂ دہلی کی ایک واضح دفعہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان افراد اور اداروں کے خلاف کارروائی کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں جو پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہیں ۔ اگر آپ کا آئین اور عدالتی فیصلے ایسی آزادی اظہار رائے پر بھی پابندی لگانے میں حائل ہیں جن سے معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے ایسی بین الاقوامی ذمے داری